مجموعۂ مجالس

(حصہ سوم)



مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید

مجموعۂ مجالس

(حصہ سوم)

تقاریر

مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید

رضوان اللہ تعالیٰ علیہ

(سابق خطیب شیعہ جامع مسجد، اسلام پورہ، لاہور)

ترتیب و تدوین

اہلیہ شاہد ذوالفقار

ناشر

ڈاکٹر نصیر عالم زیدی

نام کتاب : مجموعۂ تقاریر (حصہ سوم)
خطیب : مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید
کمپوزنگ : سید قارب حسین زیدی
اشاعت : مئی 2006ء
ہدیہ :

ملنے کا پتہ

افتخار بک ڈپو (رجسٹرڈ)، اسلام پورہ، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی
مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ

یسئلونک عن الاهلة قل . .

" " المحیض قل . . .

یہ سوال کرتے ہیں کہ حبیبؐ جواب دیجیے

ایک سوال خدا نے کر لیا قل لا اسئلکم علیہ . . . اجرا . . .

تو کوئی جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہے

عرضِ ناشر

بحمداللہ! میرے والد مولانا سید محمد جعفر صاحب قبلہ شہید کی کتب بعنوان "مقالاتِ شہید لاہور"، "مجموعہ مجالس حصہ اوّل" اور "مجموعہ مجالس حصہ دوم" بہت مقبول ہوئیں اور مومنین کرام نے اس سلسلہ میں میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مومنین کی خواہش اور پرزور اصرار پر مجموعہ مجالس حصہ اوّل کو افتخار بک ڈپو، لاہور کے تعاون سے دوبارہ شائع کیا گیا۔ اِن کتب کی اہمیت اور افادیت پر ملتِ جعفریہ کے بہت سے جرائد اور اخبارات میں بہت اہم اور تفصیلی تبصرے بھی شائع ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اب والد مرحوم کی مجموعہ مجالس، حصہ سوم شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ دراصل یہ مجالس اور تقاریر جو اِس مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں، مجموعہ تقاریر کے نام سے کئی سال پیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ مجموعہ تقاریر کو محترمہ اہلیہ شاہد ذوالفقار صاحب نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیا تھا اور اُن کے والد محترم جناب مرغوب احمد صاحب مرحوم (کراچی) اور جناب سید محسن علی شاہ صاحب (لاہور) نے شائع کیا تھا۔ لیکن یہ کتاب یعنی مجموعہ تقاریر فروخت کیلئے نہیں تھی اور اس کا دائرہ ناشرین کے عزیز و اقارب اور احباب تک محدود رہا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اِس علم کی دولت تک تمام مومنین کی دسترس ہونی چاہئے تا کہ اِس علمی خزانے سے محمدؐ و آلِ محمدؑ کے تمام چاہنے والے مستفیض ہو کر محفل میں

اسی جذبہ کے تحت جناب سید محسن علی شاہ صاحب اور جناب مرغوب احمد صاحب مرحوم کے ورثاء کی اجازت سے اِن تقاریر کو مجموعہ مجالس حصہ سوم کے نام سے شائع کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ میرے اس کام میں میری اہلیہ اور میری بیٹیوں خصوصاً میری بیٹی انجم مسعود نے بہت مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ خداوندِ عالم مجھ گناہگار کی اس معمولی سی کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور امامِ مظلوم کی مظلومہ والدہؑ کی طرف سے انعام عطا ہو، آمین۔

مؤمنین سے التماس ہے کہ میرے والدین اور جناب مرغوب احمد صاحب مرحوم کیلئے مغفرت اور بلندیٔ درجات کیلئے دُعا فرمائیں۔ میں اپنے اور اپنے اہل خانہ کیلئے بھی ملتمس دُعا ہوں۔

احقر

ڈاکٹر سید نصیر عالم زیدی

10 اکتوبر 2005ء

پیش لفظ

برصغیر کے ایک ممتاز عالمِ دین اور خطیبِ بے بدل جناب الحاج مولانا سید محمد جعفر صاحب شہید جن کے قدیم وطن ہونے کا شرف میمن سادات، ضلع بجنور (یوپی ہند) کو حاصل تھا۔ آپ 1934ء تا 1956ء بریلی (ہند) میں امامِ جمعہ و جماعت رہے۔ تقسیم ہند کے بعد 1956ء میں پاکستان منتقل ہو کر پنجاب میں متوطن ہو گئے تھے اور جامع مسجد شیعہ، اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) لاہور میں 1957ء تا 1980ء امامِ جمعہ و جماعت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ممدوح ایک باوقار شخصیت کے حامل تھے اور اُن کا دل ختمی مرتبت اور اُن کی آلؑ کی صحیح معرفت اور محبت کا مسکن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی تقاریر اپنے اندر ایک مخصوص جاذبیت رکھتی تھیں۔ مولانا جب کسی موضوع پر تقریر فرماتے تو کسی گوشہ بیان کو تشنہ چھوڑنا پسند نہ فرماتے تھے۔ یہ قوم کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایک ظالم کے ہاتھوں 7 نومبر 1980ء کو شہید ہو گئے۔

اس کتاب میں مولانا کی اُن ٹیپ شدہ تقاریر کو، جو میرے والد سید مرغوب احمد صاحب قبلہ دام ظلہ کی ریلوے بورڈ لاہور میں ملازمت کے دوران والیس روڈ، لاہور والی رہائش گاہ پر وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں مولانا کی چند دیگر تقاریر جو میرے والد کے حلقہ احباب کے یہاں ہوئیں، بھی شامل کردی گئی ہیں۔ یہ سب تقاریر بعض احباب واعزا کے مشورہ سے آپ کے ذوق

مطالعہ کے حوالہ کی جا رہی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ یہ حقیر کوشش خداوند عالم اُس کے رسولؐ اور آلِ رسولؐ کا قرب حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو اور خوشنودیٔ پروردگار و چہاردہ معصومینؑ کا باعث بن سکے۔

اس کتاب کے ضمیمہ میں اُن آٹھ مسائل کو درج کر دیا گیا ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو سکھائے تھے اور جن کے متعلق اُن کا فرمان ہے کہ خدا کی قسم! توراۃ، زبور، انجیل، قرآن اور باقی کتب سابقہ کی بازگشت انہی مسائل کی طرف ہے۔

چونکہ امامؑ ان مسائل پر عامل شاگردوں کو بنظر تحسین دیکھتے تھے، آپ کے سامنے ایک نایاب نسخۂ عمل کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ بیشتر حضرات پہلے ہی حکم امامؑ کی تعمیل فرما رہے ہوں گے اور وہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر امامؑ کے فرمودات دُوسرے احباب کو بھی یاد دلا دیں گے اور ثواب جزیل کو حاصل کرنے میں کوتاہی نہ فرمائیں گے۔

والسلام

اہلیہ الحاج سید شاہد ذوالفقار

تقریظ

(بقلم جناب علامہ طالب جوہری صاحب مدظلہ)

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں حوزہ علمیہ نجف اشرف کا طالب علم تھا اور گاہ گاہ ایام عزا کی تعطیلات میں پاکستان آیا کرتا تھا۔ حسن اتفاق سے ایک سال مجھے لاہور میں محرم الحرام کے عشرۂ اولیٰ میں قیام کا موقع ملا اور مختلف مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ غالباً محرم کی چوتھی یا پانچویں تاریخ تھی جب میرے میزبان مجھے ایک ایسی مجلس میں لے گئے جس میں بظاہر حالات دوسری مجالس کی نسبت فضلاء اور دانشوروں کا اجتماع زیادہ تھا۔ ایک ایسے بزرگ رونق افروز منبر تھے جن پر لباس علم پوری طرح سج رہا تھا۔ جلد ہی کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان اور لہجہ کی شیرینی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجلس میں خطابت کا عنصر کم تھا لیکن علمیت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ مدلل گفتگو تھی اور اس آیت پر تھی جس پر ایک ہزار سال سے گفتگو ہو رہی ہے، جسے صاحبانِ علم آیۂ تطہیر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ آیۂ مبارک جسے منبر سے بہت زیادہ پڑھا گیا ہو، اس میں نئے نکات کا پیدا کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ صاحب ذکر نے بعض ایسے نکات اور اچھوتے مطالب پیش کئے جو اس سے قبل سامعین کیلئے ناآشنا تھے جن سے انتہائی گہرے اور وسیع مطالعہ کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ میرا پہلا تعارف تھا حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ سے۔

حوزہ علمیہ نجف اشرف میں پاکستان سے جو مختلف جرائد و رسائل آیا کرتے تھے، ان میں گاہ گاہ حضرت مولانا رضوان اللہ علیہ کی بعض تحریریں بھی دیکھنے کو مل جایا

کرتی تھیں۔ مولانا کی علمیت، وسعتِ مطالعہ اور فکری تعمق کا پہلا تاثر جو مجلس کے ذریعہ مجھ پر قائم ہوا تھا، ان کی گرانقدر تحریروں نے نہ صرف یہ کہ اسے باقی رکھا بلکہ اس تاثر میں مسلسل اضافہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مذہبی رسائل مناظرانہ مباحث کو پیش کرنے میں بہت مستعد ہوا کرتے تھے اور کم و بیش ہر شمارہ میں کسی نہ کسی نزاعی مسئلے پر کوئی نہ کوئی مقالہ یا مضمون موجود ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا لیکن اس شان کے ساتھ کہ ان میں مناظرہ کم اور ادلہ و براہین کا امتزاج زیادہ ہوتا تھا، البتہ کہیں کہیں آپ کے لہجہ میں ذوالفقار کی کاٹ بھی نمایاں ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود منتخب الفاظ، شائستہ طرزِ بیان اور محکم استدلال ان مقالوں کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی کہ حضرت مولانا کے خلفِ صالح ڈاکٹر نصیر عالم زیدی صاحب نے آپ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مقالات کا ایک معتدبہ حصہ شائع کرنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ خدا اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ وہ مقالے جو زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والے ہیں ___ خالص علمی اور تحقیقی ہیں۔ ان میں بعض ایسے اہم موضوعات زیرِ بحث آئے ہیں جن کی اہمیت گزرتے ہوئے زمانوں میں کبھی کم نہ ہوگی۔ ان مقالوں میں مولانا نے غیر جانبدارانہ علمی و منطقی تحقیقات سے اسلامی حقائق و معارف کو جمع فرما دیا ہے۔ حوالے مستند ہیں، عبارت سلیس اور رواں ہے اور تعبیر و استدلال دل نشین ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ صاحبانِ علم و طالبانِ حکمت اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور ان مطالب کی قدر کریں گے جن پر یہ کتاب مشتمل ہے۔

میں دست بدعا ہوں کہ رب العزت بہ طفیل محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام حضرت مولانا سید محمد جعفر زیدی رضوان اللہ علیہ کے درجات میں اضافہ فرمائے اور ارباب فکرودانش کوان کے معارف سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

طالب جوہری

۷/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ، لاہور

(اطلاعاً عرض ھے کہ علامہ طالب جوھری نے یہ تقریظ بنیادی طور پر علامہ شھید کے مجموعۂ مقالات کیلئے تحریر کی)۔

مولانا محمد جعفر زیدیؒ کی خطابت

(از علامہ سید مختار عباس نقوی مدظلہٗ)

فقہ اور ذاکری دو جداگانہ شعبے ہیں لیکن برصغیر کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں تقریباً ہر عہد میں ایسے نابغۂ روزگار افراد ہوتے رہے ہیں جو بیک وقت بلند مرتبہ فقیہ بھی رہے ہوں اور دنیائے خطابت میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہو، بلکہ سچ پوچھیے تو دنیائے شیعیت میں برصغیر وہ منفرد مقام ہے جہاں ذاکری پر فقہ کے نگران اثر نے خطابت کو تبلیغ، تدریس اور دفاعِ مذہب کا مضبوط ترین، مستقل بحتاط اور ذمہ دار ادارہ بنا دیا ہے۔ وہ جامع صفات و کمالات شخصیات جن کے دم سے فقہ و ذاکری کی دنیا آباد ہے، ان میں ایک نام ـــــ بلکہ بہت بڑا اور نمائندہ نام جناب سید محمد جعفر زیدی شہید کا ہے۔

نرم خوشگوار آواز، لہجے میں پُر وقار، عالمانہ ٹھہراؤ، صاف ستھرے، اُلجھاؤ سے پاک، مختصر جملے جو خطیب کے واضح ذہن کے عکاس ہوں، انتہائی سادہ اور عام فہم زبان اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ مضبوط قرآنی منطق پر مبنی استدلال، گفتگو میں فکری تسلسل اور معلوم حقائق سے کام لے کر اپنے سامعین کو اَن دیکھی اور نظرانداز شدہ دنیاؤں کے حسن سے مسحور کر دینے والا بیان ـــــ یہ اور اس جیسی اجتماعی خوبیوں کی مالک شخصیت کا دوسرا نام محمد جعفر زیدی تھا۔

خطابت بہر طور لوگوں سے اجتماعی گفتگو ہوتی ہے اور صرف یک طرفہ گفتگو نہیں، جب تک سننے والے اس گفتگو سے تاثر نہ لیں، یہ گفتگو خطابت نہیں بنتی۔ لیکن اپنا اثر منتقل کرنے کیلئے خطیب سامع کی کونسی حس کو متوجہ کرتا ہے، یہ ہر مقرر کا اپنا انتخاب اور اپنا طریق کار ہے۔ ہمیں گزشتہ ایک صدی کے دوران، بعض انفرادی رویوں سے قطع نظر، دو مکاتب فکر نمایاں نظر آتے ہیں:

پہلی نصف صدی میں جو خطابت منظر عام پر آئی، اسے ہم تدریسی خطابت کہہ سکتے ہیں۔ اس انداز کا بنیادی مقصد اپنے سامع کو باخبر کرنا، سمجھانا، سکھانا اور اس کو فکری سطح پر واضح اور مستحکم کرنا تھا۔

دوسری نصف صدی کا نمایاں رنگ، سکھانے، سمجھانے کی بجائے اپنے سامع کو مرعوب کرنا اور حیرت زدہ کرنا ہو گیا۔ سکھانے والا خطیب اپنے لب ولہجہ، اپنے افکار وخیالات کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی برتری قائم رکھتے ہوئے عوامی سطح پر اتر کر اپنی بات دوسروں کے ذہنوں تک پہنچاتا ہے جبکہ مرعوب کرنے والے خطیب کا طریق کار مختلف ہوتا ہے۔ وہ عوامی سطح سے بہت بلند مقام پر بیٹھ کر وہاں سے آواز دیتا ہے: جس میں ہمت ہو، وہ اس بلندی تک آنے کی کوشش کرے۔ وہ کبھی اپنے حافظے سے، کبھی حسن بیان سے، کبھی ذہنی دوررسی اور نازک خیالی سے اور کبھی زبان ولغت پر اپنی گرفت سے اپنے سامع کو للکارتا ہے:

''کیا تم بھی یہ کمال دکھا سکتے ہو؟''

دونوں طریقوں کی اپنی اپنی افادیت اور اہمیت ہے۔ درس وتدریس کے انداز کی خطابت اپنے پورے مجمع میں علم کی تقسیم اس انداز سے کرتی ہے کہ تھوڑا تھوڑا

علم ہر ایک کے حصہ میں آ جاتا ہے۔ اس کے برعکس مرعوب کن خطابت گنتی کے چند لوگوں کو علمی فیض پہنچاتی ہے۔ لیکن ان چند لوگوں کی سطح، مقابلتاً کافی بلند ہوتی ہے۔

قبلہ محمد جعفر زیدی درس و تدریس کے مکتبہ خطابت سے صرف تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس اندازِ خطابت کے نمائندہ فرد تھے۔ یہیں سے ہی ان کی خطابت کا پہلا حسین پہلو سامنے آتا ہے کہ ہر چند مقصودِ بیان کم علم مجمع کو بہت سی باتوں سے باخبر کرنا ہوتا تھا لیکن کیا مجال کہ کسی مرحلہ پر اُستادانہ رعونیت کا شائبہ بھی آ جائے۔ وہ دھیمے دھیمے لہجہ میں، ''جہاں تک میں سمجھا ہوں''، ''جہاں تک میری نظر ہے''، قسم کے منکسرانہ جملوں کا سہارا لیتے ہوئے، مخاطب کی انا کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچائے بغیر، اس کے ذہن کو فکر و معانی کے لاتعداد چراغوں سے منور کر دیتے ہیں۔

ان کی تقریر کو اگر سامع کی نفسیات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اندازِ خطابت سب سے پہلے سامع سے ایک ہمدردانہ سماعت کی درخواست کرتا ہے۔ سامع جیسے ہی اپنی توجہ ان کی طرف مرکوز کرتا ہے تو دو تین جملے ایسے کہتے ہیں کہ سامع کا تجسس بیدار ہو جاتا ہے۔ بیان کی پہلی گرہ کھلتی ہے لیکن ساتھ ہی اشارہ ملتا ہے کہ ابھی ایک منزل اور ہے، ایک مرحلہ اس سے بھی اہم تر، اس سے آگے آنے والا ہے۔ دوسری منزل طے ہوتی ہے کہ مقرر کا ہاتھ ایک اور پردے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہ تجسس اور انکشاف اور پھر ایک نیا تجسس اور ایک نیا انکشاف اس غیر محسوس انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے کہ پھر سامع گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے اور انجام کار جب اور جہاں زیدی صاحب تقریر ختم فرماتے ہیں، سامع ایک جھرجھری لے کر بیدار ہو جاتا ہے اور اسے بے ساختہ احساس ہوتا ہے کہ وہ

بہت کچھ سیکھ گیا، بہت کچھ جان گیا۔

اب نہ زیدی صاحب کی فرمائش تھی، نہ انہوں نے اشارتاً اس خواہش کا اظہار کیا تھا، لیکن سامع ہے کہ ان کے احترام وعقیدت میں سراپا نیاز بنا ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوتا ہے کہ کاش! انہیں ایک مرتبہ پھر سننے کا موقعہ مل جائے۔

ماضی بعید کا خطیب اس اعتبار سے بدقسمت تھا کہ اس کی شاہکار خطابت بھی محض سامعین کے کمزور حافظوں کے تصرف میں تھی۔ لیکن آج کی خطابت ہر اعتبار سے محفوظ کی جاتی ہے اور کم وبیش تمام قابل ذکر ذاکرین کی تقاریر شائع بھی ہو چکی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خطابت ایک فن ہے، لیکن اگر اس فن کا اصل کام خیالات کو مؤثر انداز میں پیش کرنا ہے تو کئی ایسے مقررین جو دوران خطابت مجمع پر چھا جایا کرتے تھے، جب تحریری شکل میں سامنے آئے تو بہت مایوسی ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ صرف الفاظ، جملوں اور لہجے کی خطابت کرتے تھے، ورنہ اُن کے کلام میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے ان کی عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

مولانا محمد جعفر زیدی کی تقاریر بھی شائع ہوئیں اور ان کے متعدد مضامین اور مقالے بھی۔ چنانچہ تقریر اور تحریر کے ان نمونوں کا مقابلہ کیجیے تو پہلے تو اس بات پر خوشگوار حیرت ہوگی کہ ان کی تحریر اور تقریر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ تقریر کے دوران بھی اپنے افکار اور اُن کی ادائیگی پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ وہی منطقی استدلال، مطالعہ قرآن میں وہی باریک بینی، وہی خوب سے خوب تر کی جستجو اور زینہ بہ زینہ، قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے غیر محسوس طور پر مقصود بیان تک پہنچ جانے کا وہی

طریقہ کار۔ اس طرح ان کی تحریر ہو یا تقریر، دونوں یکساں طور پر وزن دار ہیں۔

چنانچہ ان کی تقریر کے مجموعے باقاعدہ کتاب کی سی منزلت اور شرف رکھتے ہیں۔ اس مطالعہ کا دوسرا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ زیدی صاحب بہت سے خوش بیان مقررین کے برعکس، جملوں پر بہت کم توجہ دیتے تھے۔ وہ جملوں کے مقرر نہیں تھے، وہ افکار اور نظریات پیش کرتے تھے اور فکر پیش کرنے والا کبھی جملوں کو اتنا آراستہ نہیں کرتا کہ وہ خیال کے حسن پر غالب آجائیں۔

اس کے باوجود یہ تو ان کے شاعرانہ اور ادبی مزاج کی فطری مجبوری تھی کہ بارہا خوبصورت ادبی جملے بے ساختہ طور پر زبان پر آجاتے اور جب بھی ایسا کوئی جملہ زبان سے ادا ہوتا تو حسن بیان اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے زیر بحث خیال کو اور نمایاں کر دیتا۔ ان کے بیان میں خوبصورت جملے ہمیشہ پس منظر کے طور پر آتے، منظر وہی رہتا جو وہ دکھا رہے ہوتے۔

شافعی کے ایک شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمانے لگے:

''جو جنت میں لے جائیں، اُن کی محبت گناہ ہو تو کیا جہنم میں لے جانے والوں سے محبت کروں؟ جو جہنم میں لے جائیں، ان سے محبت کیوں کروں؟ جائیں جہنم میں ـــــ''

سورۂ نور کی پینتیسویں (۳۵) آیت کا یہ جزو زیر بحث تھا کہ اللہ کے نور کی مثال ایک ایسے چراغ کی ہے جس کا روغن اُسے روشن رکھتا ہے، حالانکہ آگ نے اسے چھوا تک نہیں، تو کہنے لگے:

''چراغ آگ سے بھی روشن ہوتے ہیں، روشن بھی ہوتے ہیں مگر جلتے بھی

ہیں اور جو جلتے ہیں، وہ جلاتے بھی ہیں۔ خداوند عالم نے اس چراغ کو چراغِ رحمت قرار دیا___ بچائے گا وہی جو خود بچا ہوگا۔ نار سے روشن ہونے والے چراغ نام کے روشن ہوتے ہیں، مگر سوزش ہوتی ہے، جلتے بھی ہیں اور جلاتے بھی ہیں___ یہی وجہ تھی کہ نار کی ایک مخلوق تھی بلندئ فلک پر___ تو جو نار سے پیدا ہوا تھا، وہ جل اُٹھا۔ سجدہ کرنے والے سجدہ کر رہے تھے، نہ کرنے والا سرکش بنا ہوا تھا۔ آدم مسجود بھی ہو رہے تھے اور محسود بھی ہو رہے تھے"۔

آنحضورؐ کی معروف حدیث پر بات کر رہے تھے کہ "علیؑ کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے" فرماتے ہیں:

"نظر روئے علیؑ پر بھی عبادت ہے، نظر کعبہ پر عبادت ہے، نظر حروفِ قرآن پر عبادت ہے۔ لیکن یہ نظر جو ان چیزوں پر ہو تو کیا ہر نظر عبادت ہے؟ ہر ایک نظر ایک نہیں ہوتی، نظر تو ایسی بھی ہوتی ہے کہ جس سے بچایا بھی جاتا ہے___"۔

ہشام بن حکم اصحابِ امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے تھے، ایک دن بصرہ کے ایک شیخ سے اپنے مناظرے کا ذکر کرنے لگے، زیدی صاحب نقل روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں نے سنا ہے کہ بصرہ میں بڑا زبردست علامہ آیا ہوا ہے اور وہاں کی جامعہ مسجد میں وہ بڑے مغلق اور اُلجھے ہوئے مسائل حل کرتا جاتا ہے۔ فرزندِ رسول! مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ میں بھی تو اس شیخ کو دیکھوں، اس کی شیخی کو دیکھوں___"۔

مولانا محمد جعفر زیدی کی خطابت اور تحریر کا سب سے بڑا فیض یہ نہیں کہ اُنہوں نے بے مثال تفسیری نکتے بیان کئے، ذہنی گتھیوں کو سلجھایا، یا اپنے موقف کی

تائید وحمایت میں ٹھوس اور مضبوط دلائل فراہم کیے۔ یہ سب تو بیشتر صاحبانِ علم اور صاحبانِ کمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا فیضانِ خاص یہ ہے کہ ان کی خطابت ظاہری طور پر کسی ایک آیت کی تشریح اور کسی ایک مسئلہ کی وضاحت ہوتی، لیکن درحقیقت وہ انتہائی غیر محسوس انداز میں اپنے سامع (اور اب اپنے قاری) کے ذہن میں عظمتِ قرآن کا ایسا نقش اُبھارتے جاتے ہیں کہ اختتامِ کلام تک پہنچتے پہنچتے اسے قرآنِ حکیم کے معجزہ ہونے، اس کے ہر لفظ، ہر حرف اور ہر حرکت کے بامقصد اور بامعنی ہونے کا ایک نیا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہو اور وہ طلبِ علمِ قرآن پر آمادہ ہو تو اس میں قرآن فہمی کا ایک ایسا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو کبھی لفظی معنی کی سطح پر نہیں رُکتا بلکہ مفاہیم کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کرتا ہے اور انجامِ کار اُسے علم وآگہی کی نئی دنیاؤں تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی زیادہ تفاسیر اور خصوصاً اُردو زبان میں تمام مسالک کے علماء کی تالیف کردہ کم وبیش تمام تفاسیر، پورے قرآنِ حکیم کی تفسیر ہونے کی بجائے اس کے منتخب مقامات کے وضاحتی حواشی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اکثر اوقات مفسر کسی ایک آیت کے محض ایک لفظ کی یا زیادہ سے زیادہ اس آیت کے مجموعی مفہوم کی تشریح کو کافی سمجھتا ہے۔ اس کے بعد آیت کے باقی اجزاء کو اور بعض اوقات اس کے بعد کی تین تین، چار چار آیات کو محض ترجمہ کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

مفسر کے اس طرزِ عمل کی وجوہات سے قطع نظر، اس کا ایک منفی نتیجہ یہ ہے کہ تفسیر کا قاری نفسیاتی طور پر سمجھنے لگتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے توجہ اور غور وفکر کے تمام تر

مقامات وہی تھے جن کی طرف مفسر نے اشارہ کیا ہے۔ باقی الفاظ قرآن مجید توجہ کے طلبگار نہیں ہیں۔ اس طرح پڑھے لکھوں کی عوامی سطح پر آیاتِ قرآنی کے مفہوم سے سرسری گزر جانے کا خطرناک رجحان پیدا ہوگیا۔ ان کو تو ایک طرف رکھئے جو اس کتاب کی تلاوت ہی پر اکتفا کرتے ہیں، وہ لوگ جو تلاوت سے آگے بڑھ کر اللہ کے کلام کو سمجھنے کی کاوش کررہے ہوتے ہیں، وہ بھی مفسرین کی حاشیہ نویسی کی وجہ سے مفاہیم قرآن کا یک رُخا، جزوی اور محدود مشاہدہ کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے تفصیلی اور تفسیری مطالعہ کیلئے اوّلاً زبان کے قواعد اور لغت پر بھرپور دسترس کے ساتھ ساتھ، جزئیات پر توجہ دینے اور ہر قدم پر رُک کر غور وفکر کرنے کا مزاج اور اس مزاج کے تقاضے پورے کرنے کیلئے مطلوبہ بے پناہ محنت کا جذبہ درکار ہے۔ ان تمام بنیادی شرائط کی موجودگی کے باوجود حاصل شدہ حقائق کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کیلئے جس ذہن رسا اور عقلِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے، اگر اس کی مدد حاصل نہ ہو تو یہ ساری تگ ودو طالب علم کو تھکا دیتی ہے لیکن اس کے سامنے معنی ومفہوم کا کوئی ایسا منظر نہیں بن پاتا کہ وہ اپنی سعی کو مشکور سمجھے اور حصول ودریافت کے احساس سے سرشار ہوکر، "ھل من مزید" کا نعرہ لگاتے ہوئے دریائے معنی کی غواصی میں مشغول ہوجائے۔

زیدی صاحب کا بنیادی موضوع تفسیر قرآن ہے۔ وہ جس آیت کو عنوان بناتے ہیں، اُس کی شرح اور وضاحت اس قدر باریک بینی سے کرتے ہیں کہ گفتگو کے اختتام پر سامع اپنا وزن بڑھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسے روز کی سنی ہوئی آیت ایک نئے انداز سے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اب تک وہ کچھ نہیں

جانتا تھا۔

یہ سب تو ہوتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر، بالکل غیر محسوس انداز میں ان کا قاری قرآن مجید کو دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا ایک نیا انداز سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ قرآن کے مفہوم پر توجہ دینے کا عادی رہا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اب تک وہ کچھ نہیں جانتا تھا بلکہ وہ تو انتہائی بدقسمت تھا کہ قسمت نے اسے ایک عظیم الشان خزانے تک پہنچا دیا تھا، پھر بھی وہ فقط ایک آدھ موتی کو کل خزانہ سمجھ کر، انہیں ہی مٹھی میں دبا لایا تھا۔

زیدی صاحب کا یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ وہ کسی آیت قرآنی کو سرنامہ تقریر قرار دیں، یا دورانِ کلام کوئی آیت یا اس کا جزو بطور حوالہ زبان پر آجائے، وہ الفاظ قرآن کا تفصیلی تجزیہ کرتے تھے۔ ان کے انداز بیان کو ملاحظہ فرمائیں، وہ آیات کا تجزیہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ پہلے تو اس کا ترجمہ کرتے ہیں، پھر ایک ایک لفظ کی تحلیل کرتے ہیں، لغت اور قواعد کے اعتبار سے اس کا جائزہ لے کر معنی میں جو تغیرات ہوتے ہیں، اُن کو زیر بحث لاتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ اس کے مترادف اور ہم معنی الفاظ کون سے ہیں اور ان کے استعمال کرنے سے مفہوم کیا ہو جاتا ہے۔

یہ ساری گفتگو اس سلیقہ اور حسن سے ہوتی ہے کہ سننے والا ایک پُر تجسس انہماک میں کھو جاتا ہے۔ زیدی صاحب اُسے قدم بہ قدم آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ لیکن ہر قدم پر رُک کر اُسے سوچنے، غور کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے سے پردے اُٹھتے جاتے ہیں۔ ہر لمحہ منظر بدلتا جاتا ہے، نئی نئی

کیفیت چونکاتی جاتی ہے، حتیٰ کہ آخری حجاب اُٹھتا ہے اور پھر سامع انکشاف و دریافت کے اس خوش کن منظر سے آشنا ہوتا ہے کہ بے ساختہ زبان پر "سبحان اللہ" کا نعرہ آجاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک بالکل غیر محسوس انداز میں اسے قرآن مجید کی گہرائی اور معنوی وسعتوں کا یقین کامل تر ہوتا جاتا ہے اور یہ یقین کئی جہتوں میں سفر کرتا ہے۔ کبھی اُسے احساس ہوتا ہے کہ اللہ کا کلام کتنا معنی خیز ہے، اس کا کوئی حرف، کوئی لفظ، نہ تو بے مقصد ہے، نہ بے محل ہے۔ کیا کوئی بشر اس جامعیت کے ساتھ، اس مقصدیت کے ساتھ، اس حسن کے ساتھ، اتنی طویل گفتگو کرسکتا ہے؟ نہیں! یہ بشر کی طاقت سے بالاتر ہے۔ یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہوسکتا۔ کبھی اسے علم قرآن کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور قرآن فہمی کیلئے ایک شدید تڑپ، ایک اشتیاق بیدار ہوجاتا ہے۔

میں نے زیدی صاحب کے انداز بیان کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے، ان کا ہر بیان اور ہر تحریر میرے مشاہدے کی صداقت کی گواہ ہے۔ ان کا کوئی بیان لے لیجیے، آپ تفسیر کا یہی انداز پائیں گے۔ یہاں صرف ایک تقریر کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ مولانا کی تقاریر کا پہلا مجموعہ، ان کی شہادت کے بعد، اہلیہ شاہد ذوالفقار نے، مجموعۂ تقاریر کے نام سے کراچی سے شائع کروایا تھا، اس مجموعہ میں پانچویں تقریر تقریباً دو گھنٹے کے دورانیہ کی ہے، اس تقریر میں ان کا موضوع سورۂ احزاب کی تینتیسویں (۳۳) اور چوبیسویں (۲۴) آیت ہے۔

مولانا صاحب نے حسب عادت ان دو آیات کو اجزاء میں منقسم کرکے اس

کا ترجمہ کیا:

''ایمان والوں میں سے ہیں کچھ مرد، کچھ مردانِ ملتِ مردانِ وفا، جو سچ کر دکھاتے ہیں اس معاہدے کو جو وہ خدا سے کئے ہوئے ہیں، کوئی اپنے عہد کو پورا کر چکا ہے اور کوئی اپنے عہد کو پورا کرنے کے انتظار میں ہے۔ نظر ہے اس کی اس پر کہ کب وقت آئے اور کب وہ اپنا عہد پورا کرے''۔

دوبارہ پھر اسی داستان کو مختصر الفاظ میں دہرایا جاتا ہے کہ یہ ہیں ایسے عہد کے پورا کرنے والے کہ انہوں نے اپنے عہد میں اور وفائے عہد میں ذرہ کے برابر تبدیلی نہیں کی۔ جس شان سے عہد کیا، اُسی شان سے اپنے عہد کو پورا کر دکھایا۔ اللہ ان صادقین کو ان کی صداقت کی بہترین جزا دے گا اور ضرور منافقین پر عذاب نازل کرے گا۔ ہاں! ہمارے عذاب سے بچ جائے گا وہ جو اس گروہ سے توبہ کرتا ہوا نکل آئے گا۔

اس فصیح اور ذمہ دارانہ ترجمے کے بعد مولانا نے ایک دعویٰ کیا، دیکھنے میں ایک قول ہے یہ آیت مگر حقیقتاً یہ وہ آیت ہے جو دنیا سے منوا رہی ہے کہ یہ کلام غیر خدا کا کلام نہیں ہے۔ یہ خود خدا کا کلام ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے آیات کی تفسیر کی تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ ''پس ثابت ہوا کہ یہ اللہ کا کلام ہے''۔ یہ بات تو کلام کا ہر لفظ جہاں جہاں تھا، وہاں سے پکار کر کہہ رہا تھا۔

مولانا نے پہلی بحث آیت کے پہلے لفظ پر کی کہ یہاں ''الذین آمنوا'' نہیں کہا گیا، ''من المؤمنین'' کہا گیا ہے۔ یعنی موضوعِ گفتگو وہ نہیں جو ایمان لانے کے مدعی ہیں بلکہ ان کی بات ہے جن کو مومن کہہ کر اللہ خود ان کے ایمان کی

تصدیق کر رہا ہے۔ پھر ایک دلکش گفتگو ہے اس فرق پر کہ مؤمن کی طرف سے دعوائے ایمان میں اور اللہ کی طرف سے سندِ ایمان میں کیا فرق ہے؟

اس کے بعد لفظ رجل (مرد) پر بحث شروع ہوئی کہ یہ لفظ اگر خواتین کے مقابل بولا جاتا تو کیا معنی ہوتے اور جب مردوں کے مجمع میں کسی کو مرد کہا جائے تو یہ لفظ کیا معنی دے گا!

اس تشریح سے آگے بڑھے تو یہ سوال ہوا کہ اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ان مؤمنین نے اپنا عہد پورا کیا بلکہ ارشاد ہوا ہے کہ انہوں نے معاہدہ پورا کیا۔ اب عہد اور معاہدہ میں فرق یہ ہے کہ عہد صرف ایک فریق کرتا ہے جبکہ معاہدہ فریقین کے ایک دوسرے سے عہد کرنے کو کہتے ہیں۔

یہاں سے گفتگو ایک اور طرف مڑی اور سوال پیدا ہوا کہ مؤمن نے تو عہد اطاعت کیا تھا، معاہدے میں عہدِ الٰہی کیا تھا؟ اس سوال کا جواب انہیں سورۂ بقرہ کی آیت 124 میں "لا ینال عھدی الظالمین" میں ملا۔

پھر یہ نہیں کہ وہ تبدیل نہیں ہوئے بلکہ "وما بدلوا تبدیلا" کہہ کر فعل مطلق استعمال ہوا اور اگر فعل مطلق اثباتی طور پر استعمال ہو (جیسے یطھر کم تطھیرا میں) تو اس سے معنی کیا بنتے ہیں اور اگر نفی کی صورت ہو (جیسے زیرِ بحث آیت میں ہے) تو کیا مطلب ہوں گے؟

اس کے بعد اس بات پر غور و فکر شروع ہوا کہ اجر دیتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے ایفائے عہد پر اجر دیا جا رہا ہے بلکہ ارشاد ہوا کہ ان صادقین کی صداقت کا اجر ہے۔ ایفائے عہد کی بجائے یہ کہنا کہ انہوں نے اپنے قول کو سچ کر دکھایا، یہ انداز

بیان تکمیل عہد کے عمل کی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

جزاء کا ذکر کرتے ہوئے "لیجزی" میں حرف 'ل' آیا ہے، اس 'ل' نے جزاء کو ان کا واجب حق قرار دے دیا۔

پھر اس پر بحث کہ مؤمنین کے وعدہ کو سچا کر دکھانے کے تذکرہ میں منافقین پر عذاب کا ذکر کیا اہمیت رکھتا ہے اور پھر مؤمن کے مقابل شرک آتا، کافر آتا، منافق ہی کیوں؟

اس کے بعد توبہ کرنے والوں کو عذاب سے مستثنیٰ قرار دیا جانا اور ان توبہ کرنے والوں کا صیغہ جمع میں بیان ہونا ___

غرض زیدی صاحب آیاتِ قرآنی کے ہر جزو پر ٹھہر کر، ذہنوں کو مہمیز کرتے ہوئے، جب ایک ایک لفظ اور حرف کی معنویت اور مقصدیت پر بحث کرتے ہیں تو قرآن مجید کی عظمت ہر سامع کا ذاتی مشاہدہ بن جاتی ہے اور اس کے کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ محض ایک تقلیدی عقیدہ نہیں رہتا بلکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایک عظیم الشان کتاب کے ہر لفظ میں معنی و مفہوم کا بحرِ بیکراں کسی قابل سے قابل انسان کے بس کی بات نہیں اور قرآن یقیناً کلامِ الٰہی ہے۔

مناسب ہوگا کہ زیدی صاحب کی تقاریر کے اس مجموعے کے مطالعہ سے پہلے آپ ان کے کچھ اور فکری شاہ پاروں کا نمونہ ملاحظہ فرمالیں۔ البتہ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جیسے پہلے کہا جا چکا ہے کہ زیدی صاحب جملوں کے خطیب نہیں، افکار و نظریات کے مقرر ہیں۔ ظاہر ہے کہ فکر ہو یا آیاتِ قرآنی کی تاویل، ان سب کا حقیقی حسن اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب بیان اپنے پورے پس منظر

کے ساتھ سامنے آئے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں، اس لئے اختصار کے ساتھ صرف کچھ مقامات ہی نقل کیے جاسکیں گے۔

امام حسینؑ کا بیعت یزید سے انکار

''حق اپنے منوانے کیلئے کبھی تشدد نہیں کرتا مگر باطل اگر تشدد سے کام نہ لے تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا اور رسولؐ اور اولی الامر اپنے منوانے کیلئے کبھی نبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ ہو یا نبوت و امامت کا، اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو حرب وقتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے، کہتا رہے۔ یہ سب برداشت کیا جاسکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اس کو خدا مان لے، رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسولؐ برحق بھی اپنی رسالت کو خیر باد کہہ کر اس کو رسول مان لیں، ولایت اور امامت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان کو اولی الامر تسلیم کر لیں تو یہ ہر ایک کیلئے ناقابل برداشت، ناممکن اور محال ہے۔

اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا حقیقتاً خدا ہو گیا یا نہ ہوا، لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول، رسول نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہوگا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمال علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا، وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا''۔

اہلیت اور نااہلیت کی انتہائیں

''مجھے ایک نبی وہ نظر آتا ہے جس نے خدا سے اپنے فرزند کے بارے میں

کہا اور جواب ملا کہ ہمارے نبی ایک بار تو کہہ چکے، اب اگر کہو گے تو ڈوبنے والا تو نہ بچے گا لیکن تمہارا نام فہرستِ انبیاء سے نکال دیا جائے گا۔ اب اگر تم نے کہا تو نبی نہ رہو گے ___ ایک وہ مقام ہے کہ جہاں نبی کہے تو نبی نہ رہے، ذہن میں رکھے گا اسے، اور ایک مقام وہ ہے کہ اگر نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے:

"وَاِن لَّم تَفعَل فَمَابَلَّغتَ رِسَالَةَ"

"رسولؐ! اگر تم نے یہ نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہ پہنچایا"۔

"کچھ بھی نہ پہنچایا" کے معنی پھر یہی نکلے کہ نہ کہا تو رسول نہ رہے۔ وہاں اگر نبی کہے تو نبی نہ رہے اور یہاں اگر نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے۔

سبع مثانی کی تاویل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: (الحجر: 87)

"وَلَقَد آتَینٰکَ سَبعَامِنَ المَثَانِی وَالقُرآنَ العَظِیم"۔

"اے انسان! دے دیئے ہم نے تجھے سرمایۂ ہدایت قرار دے کر ایک سبعامن المثانی اور پھر وہ قرآن جو باعظمت ہے"۔

تو حضرات والا! مفسرین نے اگرچہ بڑی بڑی بحثیں قائم کی ہیں مگر قرآن مجید کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے پہلے جس شے (سبعامن المثانی) کا ذکر ہے، وہ قرآن العظیم سے وابستہ تو ضرور ہے مگر ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز۔

سبعامن المثانی میں سبع کے معنی سات ہیں۔ سات کو جب مکرر کیجیے تو چودہ خود بخود آپ کے سامنے آئیں گے۔ تو آپ محسوس فرمالیں گے کہ یہاں چودہ معصومینؑ کا ذکر ہے اور وہ سات وہ ہیں جو مکررات میں سے ہیں۔

اب یہ بحث واقعتاً بڑی دلچسپ ہوگی کہ چودہ کے ذکر کیلئے چودہ ہی کیوں نہ کہا، چودہ ہی کا عدد کیوں نہ پیش کردیا؟ تو حضرات! ایک عجیب راز ہے اس میں کہ اگر چودہ کا عدد کھلم کھلا استعمال ہوجاتا تو کوئی اس چودہ کو بتاتا اور کوئی اُس چودہ کو۔ خداوند عالم نے چودہ کا تعارف اس حیثیت سے کروایا کہ سوائے اصل موقف کے دوسری جگہ کوئی جا ہی نہ سکے۔

سات کہا اور پھر سبعامن المثانی کہہ کر یہ بتادیا کہ مراد یہاں چودہ ہیں، جو خود چودہ ہیں۔ مگر ان کے نام چودہ نہیں۔ گنتے جایئے تو چودہ ضرور کہیئے گا۔ لیکن اگر ناموں کو گنیں گے تو وہ سات ہی نظر آئیں گے۔ انہی میں سے گھوم پھر کر چودہ کی گنتی پوری ہوجاتی ہے، مثلاً اگر پنجتنؑ پاک ہیں، وہ جس طرح خود پانچ ہیں، اسی طرح ان کے نام بھی پانچ ہیں، ان کے درمیان کوئی نام مکرر نہیں آیا۔ ان کے بعد جو نو ہیں، ان کے ناموں پر نظر کی جائے تو جو نام بالکل نئے آئے ہوئے ہیں اور پہلے سے نہ آئے ہوں، وہ صرف دو ہیں: جعفرؑ اور موسیٰؑ ____

یہاں مراد یہ ہے کہ وہ چودہ حضرات دیکھو جن کے نام سات سے آگے نہ بڑھیں''۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ والصلوٰة والسلام
علٰی سید الاولین والآخرین اشرف الانبیاء
والمرسلین خاتم النبیین شفیع المذنبین
حبیب قلوب الصادقین رسول اللہ العالمین
سیدنا ومولانا و طبیب نفوسنا وحبیب قلوبنا
وشفیع ذنوبنا ابی القاسم محمدؐ و آلہ الطیبین
الطاہرین الغر المیامین المعصومین امابعد فقد
قال اللّٰہ الحمید فی الفرقان المجید.

پہلی

مجلس

کتاب

سلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ".

"قسم ہے وقتِ عصر کی، بے شک انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالاتے رہے اور (راہ) حق پر چلنے کی وصیت کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے"۔

یہ سورہ قرآن مجید کا وہ سورہ ہے جس کا آغاز لفظ "عصر" سے ہوا ہے اور اختتام لفظ "صبر" پر ہوا ہے۔ قرآن مجید کا کُل تو بہرحال اپنے مقام پر ہے اور کُل ہے لیکن میں اپنی ایک وجدانی کیفیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر قرآن کے ایک ایک جزو پر اپنی نگاہوں کو جما دیا جائے، مثلاً آیت زیرِ غور کو پورے طور پر مطمحِ نظر بنالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا یہ جزو اتنا بھاری ہے کہ کُلِ قرآن کا ہم پلہ ہوسکتا ہے اور پھر جو کُلِ قرآن میں ہے، وہ سب اسی میں نظر آنے لگتا ہے۔ وہی شان مجھے سورۂ انور کی نظر آتی ہے۔

خداوند عالم بیان فرما رہا ہے اور اپنے بیان سے مناسبت کیلئے وقتِ عصر کی قسم سے اپنے کلام کا آغاز کر رہا ہے۔ بعض اوقات کلام میں ابتداء میں ایک صنعت ہوتی ہے جس کو عربی میں صنعتِ برأتِ استہلال کہتے ہیں اور اس صنعت کے معنی یہ ہیں کہ پہلا ہی لفظ وہ بیان کر دیا جائے جو متکلم کے سارے بیان کا آئینہ بن جائے۔ اسی صنعت کو برتتے ہوئے قرآن کا ایک سورہ، سورۂ برأت ہے۔ تمام قرآنی سورتوں

میں یہی ایک سورہ ہے جس کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے نہیں ہوئی۔ اگرچہ باقی ہر سورہ کی ابتداء اس آیت سے ہے۔

یہاں ''بسم اللہ'' کا نہ ہونا اور ہر دُوسری جگہ ''بسم اللہ'' کا ہونا وہی صنعتِ براَتِ استہلال ہے جو انجام کی مخبر بن جاتی ہے۔ ''بسم اللہ'' کا شروع میں نہ آنا اس سورہ کے متعلق یہ بتانے کیلئے ہے کہ اس سورہ میں ذکرِ رحمت نہیں ہے، ذکرِ عذاب ہے، ذکرِ نفرت ہے۔ تو جہاں ذکرِ نفرت ہو، جہاں اظہارِ برأت ہو تو وہاں خدا کہے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' یعنی اپنے رحمٰن ورحیم ہونے کی خبر دے، یہ بات بالکل بے ربط ہو جاتی ہے۔

مجھے یہاں ایک واقعہ یاد آیا جو سنا دینے کے لائق ہوگا۔ اصمعی ایک عرب تھا اور بہترین بادب اور بہترین شاعر تھا۔ اُس کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مجھے سیروسیاحت کا شوق ہوا اور میں نے چاہا کہ کوہ ودشت وجبل میری نگاہ کے سامنے آئیں اور میں قدرتی مناظر کو دیکھوں۔ میں اپنے گھر سے نکل گیا۔ اب میرے سامنے بیابان ہے، پہاڑ ہیں، کوہسار ہیں، آبشار ہیں، سیر وتفریح میں ہوں، دُور دُور تک ایسے مقامات ہیں کہ جہاں انسان مجھے نظر نہیں آتا۔ میں پھر رہا ہوں۔ اسی اثناء میں میں نے بیابان میں ایک شخص کو دیکھا۔ سن رسیدہ ہے، معمر ہے۔ اتنی دیر ہو گئی تھی انسان کو دیکھے ہوئے کہ جب میں نے اُس کو دیکھا تو میرا دل ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اُس کی طرف کھنچا۔ میں اُس کے قریب پہنچا۔ کچھ گفتگو شروع ہوئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شیخ باذوق ہے اور کلام کا قدردان ہے۔

شاعر کو جب قدر دان مل جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کی تو مراد پوری ہوگئی۔ یہ اندازہ کرنے کے بعد اصمعی نے اُس عرب سے کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو میں اپنا کلام پیش کروں؟ شیخ چونکہ باذوق تھا، اُس نے اس سوال کے جواب میں بھی بہترین ذوق سے کام لے کر جواب میں کہا:

''جب کلام کا سننا ٹھہرا تو پھر تمہارا کلام کیوں سنوں؟ کیا کوئی کلام اللہ کے کلام سے بڑھ کر ہو سکتا ہے؟ تو اگر سنانا ہے تو اپنے کلام کو چھوڑو، اللہ کا کلام سناؤ''۔

اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے اُن کی فرمائش کو پورا کرنا شروع کر دیا۔ کلام اللہ کی تلاوت کر رہا ہوں اور شیخ چونکہ باذوق ہے، اس پر وجد کا عالم طاری ہے اور وہ اپنا سر دُھنتا جا رہا ہے اور ہر جملہ سن کر اُس کی زبان پر یہی لفظ آتا ہے:

''بَلٰی هٰذَا كَلَامُ اللهِ''.

''کیوں نہ ہو یہ اللہ کا کلام ہے''۔

یعنی جو اثرات اُس کے دل میں اُتر رہے تھے، اُن اثرات کے بارے میں کہہ رہا تھا ''کیوں نہ یہ اثرات ہوں، یہ اللہ کا کلام ہے۔ کیوں نہ ہو بہترین کلام اللہ کا کلام ہے''۔

اصمعی کہتا ہے کہ میں قرآن پڑھتا جا رہا تھا اور شیخ ''بَلٰی هٰذَا كَلَامُ اللهِ''، ''بَلٰی هٰذَا كَلَامُ اللهِ'' کہتا جا رہا تھا۔ اصمعی کہتا ہے کہ میرے پڑھتے پڑھتے ایک مرتبہ اُس شیخ نے اپنے جھکے ہوئے چہرے کو اُٹھایا اور مجھ سے پوچھا:

''هٰذَا كَلَامُ مَنْ؟''

''یہ کلام کس کا ہے؟''

اب اصمعی کہتے ہیں کہ میں حیران ہوگیا کہ یہ کیا بات ہوئی؟ اب تک تو شیخ تصدیق کرتا چلا آرہا تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اب یہ سوال کرنے لگا ہے کہ یہ کس کا کلام ہے اور میں نے جواب دیا:

"هٰذَا كَلَامُ اللّٰه".

"یہ اللہ ہی کا کلام ہے"۔

شیخ نے کہا:

"لَيْسَ هٰذَا بِكَلَامِ اللّٰهِ"

"نہیں، یہ اللہ کا کلام نہیں ہے"۔

اصمعی کہتا ہے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کہوں اور پریشان تھا کہ یہ بات کیوں بدل گئی؟ اس حیرانی کے عالم میں مجھے یاد آیا کہ جس آیت پر بات بگڑی ہے، اس آیت کے آخری حصہ میں مجھ سے ایک معمولی سا تغیر ہوگیا ہے۔ جب یہ یاد آیا تو میں نے کہا: "پھر سنئے" اور آخری لفظ جو اصل آیت میں تھا، وہی عرض کیا۔ شیخ نے سن کر کہا:

"بَلٰى هٰذَا كَلَامُ اللّٰهِ".

"کیوں نہ ہو، یہ اللہ کا کلام ہے"۔

کہتے ہیں کہ مجھے حیرت ہوئی کہ تغیر ایسا تو نہ تھا کہ شیخ اُس کے کلامِ خدا ہونے سے ہی منکر ہو جائے اور تغیر کیا تھا، آپ کے سننے کے لائق ہے۔ وہ سورۃ المائدہ کی آیت 38 یہ ہے:

"وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ"

"چوری کرنے والا مرد ہو یا عورت، کاٹو اُن کے ہاتھوں کو، یہ اُن کے کیئے کا بدلہ ہے اور یہ اللہ کی طرف سے عذاب ہے"۔

یہاں تک تو اصمعی نے آیت کو اُسی حیثیت میں پڑھا جس حیثیت میں یہ تھی۔ آخر آیت میں یہ الفاظ تھے:

"وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ"۔

"اللہ ہر چیز پر غالب ہے اور وہ صاحبِ حکمت ہے"۔

اصمعی نے بھول کر "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کی بجائے "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" پڑھ دیا۔ اب ظاہر ہے کہ "عزیز" بھی اُسی کا نام ہے اور "غفور" بھی اُسی کا نام ہے، "حکیم" بھی اُسی کا نام ہے اور "رحیم" بھی اُسی کا نام ہے۔ تو اُنہوں نے اپنی جگہ سمجھا کہ نام تو اُسی کے ہیں، "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کہہ دیا تو کیا ہوا اور اگر "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" کہہ دیا تو کیا فرق ہوگا۔

مگر جب اصمعی نے "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کی بجائے "غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" کہا تو شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اصمعی نے جب یاد آنے پر "عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" کہا تو دوبارہ شیخ نے کہا کہ ہاں! یہ اللہ کا کلام ہے۔

اصمعی نے پوچھا: "شیخ! بات کیا ہے؟ چلو یہ تو میں نے مانا کہ میں بھولا مگر یہ تغیر ایسا تو نہیں ہے کہ کلامِ خدا ہونے سے ہی انکار ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ کلام خدا کا نہیں ہو سکتا"۔

شیخ نے کہا: "تم بادب ہوتے ہوئے اور باذوق ہوتے ہوئے اتنا نہیں سمجھتے کہ جس آیت میں خدا اپنے عذاب کا ذکر کر رہا ہو، وہاں وہ کہے کہ میں غفور ہوں،

رحیم ہوں، کتنی بے ربط بات ہے۔ "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" تو وہاں کہنا درست ہوگا جہاں اس سے پہلے مغفرت اور رحمت کا ذکر ہو رہا ہو۔ یہاں تو عتاب و عقاب کا ذکر ہے، اس لئے "عزیز" کہا اُس نے (یعنی میں غالب ہوں ہر چیز پر، مجھے مجرم کو سزا دینے کا پورا حق حاصل ہے اور یہ سزا جو مجرم کو دینے کیلئے میں نے متعین کی ہے، بر بنائے حکمت مقرر کی ہے۔ سزا سے جرم کا سد باب ہوتا ہے، ہمتیں ٹوٹتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں لوگ جرم سے کنارہ کش ہوتے ہیں)۔

لہٰذا یہاں موقع و محل کی مناسبت سے "عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ" کے الفاظ کا ذکر مناسب تھا اور "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" کے الفاظ انتہائی غیر مناسب قرار دیئے جائیں گے۔

حضرات! بیانِ ماسبق سے ہم سب مل کر یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوں گے کہ جب مقامات اتنے متعین ہو چکے کہ خدا کے ایک نام کی جگہ اُس کا دوسرا نام نہ لے سکیں کیونکہ ماننا پڑے گا کہ بھول کر جو آیت کے آخری حصہ میں الفاظ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ کی بجائے "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" کہے گئے، کوئی ناجنس نہیں آیا بلکہ کسی اور کا نام نہیں آیا، اُسی کا نام آیا ہے۔ تو جب خدا کے ایک نام کی جگہ اُسی کا دوسرا نام نہ لے سکیں تو جہاں نام کا بھی واسطہ نہ ہو، وہ جگہ کتنی وحشت ناک ہو جائے گی۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ اس سورۂ والعصر میں بھی وہی صنعتِ براَتِ استہلال ہے۔ ذکر کچھ کر رہا ہے کرنے والا، اُس کے ذکر کی مناسبت سے نہ یہاں آفتاب کی قسم ہے، نہ یہاں ماہتاب کی قسم ہے، نہ یہاں نجوم و کواکب کی قسم ہے بلکہ صرف وقتِ عصر کی قسم ہے۔ پہلا لفظ سورۂ والعصر کا پورے بیان کا دروازہ کھول رہا ہے۔ بتا رہا ہے کہ کوئی وقتِ عصر ہے خدا کی نظر میں جس کی اتنی نمایاں اہمیت ہے کہ اُس کو موردِ قسم قرار دے

رہا ہے اور اتنی شدید قسم کے بعد فرماتا ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ"۔

"انسان عموماً زیاں کار ہے، خسارے میں ہے، گھاٹے میں ہے"۔

"اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا"

"سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان رکھتے ہوں"

"وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"

"اور نیکیوں کے بجالانے والے ہوں"

"وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"

"اور حق کی وصیت کرنے والے ہوں"

"وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ"

"اور صبر کی وصیت کرنے والے ہوں"۔

بس یہ حضرات نجات کے حقدار ہیں ورنہ عموم انسان زیاں کار ہیں۔

کیوں حضرات! یہ آیت مکمل قرآن کا کام دے رہی ہے یا نہیں۔ خداوند عالم کا مکمل فیصلہ سنا رہی ہے یا نہیں کہ اگر ایمان اور اعمالِ صالح ہیں، تب تو نجات ہے ورنہ اگر یہ نہیں ہیں تو نجات نہیں ہے۔ بیان کرنے کی ترتیب بھی معنی خیز ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی جماعت کے بارے میں حکم لگایا جائے گا تو کم کو مستثنیٰ کیا جائے گا، کم پر حکم لگانا اور زیادہ کو مستثنیٰ کرنا۔ یہ بالکل غلط چیز ہے، مثلاً مجمع ہے، اس میں کچھ لوگ پڑھے ہوئے ہیں، کچھ لوگ اَن پڑھ ہیں۔ تو اگر پڑھے ہوئے لوگوں کا مجمع زیادہ ہے، اُن کے افراد زیادہ ہیں تو حکم اُسی لفظ پر لگے گا اور یہی کہا جائے گا کہ یہ لوگ خواندہ ہیں،

سوائے چند لوگوں کے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے اس موقعہ پر کہ سب لوگ ناخواندہ ہیں سوائے کچھ آدمیوں کے تو یہ ترتیب کلام غلط ہو جائے گی۔

حکم لگایا جاتا ہے اُس مجمع پر، اُس تعداد پر، اُن افراد پر جو اکثریت میں ہوں۔ مستثنیٰ کیا جاتا ہے ہمیشہ کم کو۔ اس لئے لا اِلٰہ میں اکثریت پر حکم لگا دیا گیا کہ کوئی بھی خدا نہیں ہے کیونکہ جو نظر آتا ہے، وہ خدا نہیں۔ جو سمجھ میں آتا ہے، وہ خدا نہیں۔ جو سننے میں آتا ہے، وہ خدا نہیں۔ جو خیال میں آتا ہے، وہ خدا نہیں۔ جو گمان میں آتا ہے، وہ خدا نہیں۔ ماضی تھا تو خدا نہیں، حال ہے تو خدا نہیں، مستقبل ہے تو خدا نہیں۔ اب خدا نہ ہونے میں ایک اتنا عموم ہے کہ جدھر دیکھئے اور جسے دیکھئے، خدا نہیں تو اس لئے نفی عام کی گئی اور ایک خاص ذات کو جو اُس اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کی انتہا ہے، اُسے مستثنیٰ قرار دے دیا۔

بالکل اسی انداز پر ایک دوسرا مقام آتا ہے:

"قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا"۔

"کہہ دیجئے اے پیغمبر کہ میں اپنی تبلیغ رسالت پر کوئی اجر نہیں چاہتا"۔

اب عبادات ہوں، تسبیحات ہوں اور کار خیر ہوں، کوئی بھی چیز ہو، سب کی نفی ہو رہی ہے۔ صرف ایک چیز واحد کا مستثنیٰ ہے اور وہ ہے:

"مَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"۔

"محبت اہل بیت"۔

یعنی سوائے محبت اہل بیتؑ کے ہم اپنی تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے۔ اس کے معنی صاف یہ قرار پائے کہ اگر کوئی شخص بزعم خویش اپنے گمان میں یہ سمجھ رہا ہو

کہ میں نوافل پڑھ کر اجر رسالت ادا کردوں اور عبادات سے، رکوع وسجود سے اور قیام وقعود سے، تلاوت قرآن، حفظ قرآن، استمرار حج سے میں اپنے رسول کو راضی کرلوں اور اجر کے ذمہ سے سبکدوش ہو جاؤں تو ہر ایسے تخیل پر آیت کا جواب ہوگا:

"لَا اَسْئَلُكُمْ".

کسی فرض کو فرض سمجھ کر ادا کرو، کسی واجب کو واجب سمجھ کر ادا کرو، عبادت کو عبادت کی حیثیت سے ادا کرو لیکن اگر اجر سمجھ کر کوئی چیز پیش کرنا چاہتے ہو تو وہ صرف محبت اہل بیتؑ ہے۔ محبت اہل بیتؑ کے سوا کسی چیز میں یہ صلاحیت نہیں۔ کسی شے کی حیثیت نہیں کہ وہ ادائے اجر رسالت کے لفظ سے تعبیر کی جاسکے۔

اسی طرح سے خداوند عالم نے یہاں نجات پانے والوں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ اکثریت کا حکم بیان فرمانے کے بعد "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" اور اس زیاں کاری کیلئے پروردگار نے قرآن مجید میں پے در پے دو تاکیدوں کا ذکر کیا۔ ایک حرف تاکید لفظ "اِنَّ" ہے اور دُوسرا حرف "لَفِیْ" پر جولام مفتوح ہے، وہ لام تاکید ہے۔

دو تاکیدیں قائم کر کے مکمل فیصلہ سنا دیا کہ انسان عموماً زیاں کار ہے بلکہ میں تو یہاں یہ کہوں گا، باذوق حضرات خصوصیت سے توجہ کریں کہ اس میں یعنی "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" کے پورے جملے میں کسی فعل کا استعمال نہیں ہوا، نہ فعل ماضی ہے اور نہ فعل حال ہے اور نہ فعل مستقبل ہے۔ پورے کا پورا جملہ اسمیہ ہے۔ "زیاں کار ہوگا"، یہ نہیں فرمایا گیا اور نہ کہا گیا کہ زیاں کار تھا یا زیاں کار ہے۔ یہ "ہے" اور "تھا" اور "ہوگا"، یہ ہم اپنی طرف سے من سمجھوتا کرلیں مگر جملہ درحقیقت جملہ اسمیہ ہے اور جملہ اسمیہ قدیم اثر رکھتا ہے۔ اس کی تاثیر قدیم ہوتی ہے۔ وہ ماضی پر بھی حاوی

ہوتا ہے۔ اُس سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن یہ نہیں کہنا چاہتا کہ زیاں کار ہو جائے گا۔ ہو کیا جائے گا، اور ہے ہی نہیں رہے گا اور زیاں کاری کی اصل وجہ نہ جہنم ہے، نہ دہکتے ہوئے شعلے ہیں، زیاں کاری کی اصل وجہ جو ہے، وہ رحمتِ خدا کا ہٹا ہوا ہونا ہے۔ اگر رحمت کا رُخ نہیں ہے کسی طرف سے، خواہ سرِدست اُس کو تکلیف کا احساس نہ ہو رہا ہو، وہ خسارے میں ہے۔

لہٰذا "لَفِیْ خُسْرٍ" کے معنی یہ ہوئے کہ رحمتِ خدا سے دُور ہے وہ، یہاں بھی اور وہاں بھی۔ خدا کی رحمت کی نظر نہیں ہے اُس پر اور ایسے انسان عام ہیں۔

ہاں! روئے رحمت کن کی طرف ہے؟

"اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"

"وہ جو ایمان رکھتے ہوں اور اعمالِ صالح بجالاتے ہوں"۔

حق کی وصیت کرتے ہوں، صبر کی وصیت کرتے ہوں۔ جس کے معنی بظاہر ہمارے سامنے یہ ہیں کہ خود ہی نیکیاں کرنے پر اکتفا نہ کرتے ہوں بلکہ دُوسروں کو بھی نیکیوں کی ترغیب دیتے ہوں۔ حق پر چلنے کی دُوسروں سے بھی فرمائش کرتے ہوں۔

حضراتِ والا! وصیت کو ہم لوگ عموماً یہ سمجھا کرتے ہیں کہ آخر وقت کی بات کا نام وصیت ہے۔ آخر وقت میں جو بات کہی جائے، اُس کا نام ہم نے وصیت رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی آیات کو دیکھئے۔ خداوند عالم نے یہ لفظ بار بار خود اپنے لئے استعمال کیا ہے:

"یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ"۔

"اللہ تم سے وصیت کرتا ہے"۔

"وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا".

"اور انسان کو ہم نے وصیت کردی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے"۔

"ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ".

تو اگر وصیت مرتے وقت کی بات ہوتی تو خدا اپنی کسی بات کو وصیت کیوں کہتا؟ اصل میں وصیت کے معنی ایک ایسی قدرِ مشترک ہے۔ جو ہر جگہ استعمال کی جاسکتی ہے۔ وصیت اُس بات کو کہتے ہیں جو اٹل ہو۔ جس بات کیلئے اول بدل کا امکان نہ ہو۔ بے بدل، مستقل، اٹل، اُس چیز کا نام وصیت ہے۔ آپ کا خطیب جمعہ اور عیدین کو کہتا ہے:

"أُوْصِيكُمْ عِبَادَ اللهِ".

"اے اللہ کے بندو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں"۔

لہٰذا واضح ہوا کہ وصیت اُس قول کو کہتے ہیں جس میں تبدیلی کا امکان نہ ہو۔ اٹل بات کو کہتے ہیں اور چونکہ ہماری باتیں زندگی میں اول بدل ہوجاتی ہیں، مرتے وقت جو کہہ جائیں اور اُس کے بعد موت واقع ہوجائے، وہ بات اٹل ہوگی کیونکہ یہ بدلی نہیں جاسکتی۔ اس کی مناسبت کی وجہ سے اس بات کو یہ کہنا غلط نہیں ہے بلکہ صحیح ہے۔ مگر خود لفظ وصیت مرنے سے متعلق نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے اپنی بات کو وصیت جس کیلئے حیات ہی حیات ہے، موت کا وہاں گزر ہی نہیں۔ تو نجات پانے والے وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہوں۔ اعمالِ صالحہ کے بجالانے والے ہوں اور حق اور صبر کے متعلق ایسے عزم سے کہیں اور تلقین کریں کہ پھر اُن کی بات کبھی بدل نہ جائے۔ اُن کی بات

اہل ہو۔

حضرات! میں اس سورۂ انور کے بارے میں اگر موعظہ کا رنگ اختیار کروں گا تو آپ حضرات ست ہو جائیں گے۔ اس لئے میں آپ کی طبیعتوں کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے بیان کا ایک مخصوص رُخ قرار دیتا ہوں تا کہ نہ آپ کی طرف سے بے رُخی ہو اور نہ میرے بیان کا رُخ بدل سکے۔ مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا کوئی لفظ آپ سے ضائع نہ ہو جائے۔

خداوند عالم نے اس مقام پر اور اس کے علاوہ نہ معلوم کتنے اور مقامات قرآن مجید میں ہیں جہاں ایمان کے ذکر کے ساتھ 'عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' بھی کہا ہے۔

"وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ".

''خدا وعدہ کرتا ہے تم میں اعمالِ صالحہ بجالانے والوں کے ساتھ''۔

"اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا"

''جو لوگ ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالانے والے ہیں، رحمٰن عنقریب اُن کے بارے میں محبت کا حکم بھیجے گا''۔

ایمان لانے والوں کے ذکر کے وقت لفظِ ایمان کے بعد عمل کا بھی ذکر ہوتا ہے جو پیہم ایک کے بعد ایک یہ لفظ ہمیشہ دوہرا ہو کر آتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ دینداری نہ محض عمل کا نام ہے اور نہ محض ایمان کا نام ہے۔ دینداری جب ہی قرار پائے گی جب ایمان کے ساتھ عمل ہو اور عمل کی بنیاد ایمان ہو۔ اگر ایمان نہیں ہے تو میرے خیال میں آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عمل کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایمان کے بغیر عمل لاشے ہے اور عمل کے بغیر ایمان میں تازگی نہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی شے نہیں۔ لیکن ایک درخت ہے جس پر بہار نہیں۔ ایک شجر ہے جس پر پھل نہیں۔ اس لئے بہار جب ہی قائم ہوگی، جب اصلِ شجر قائم ہو۔ شجر کی شاخیں بھی موجود ہوں۔ اسی لئے ایمان اصولِ دین ہے اور عمل فروعِ دین کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو جو شاخ بے بہار درخت سے کٹ چکی ہے، اُس کی سرسبزی کچھ دیر کیلئے نمایاں رہے گی مگر کچھ دیر کے بعد مردہ ہو جائے گی، اس لئے کہ جڑ سے اُس کا کوئی تعلق رہا ہی نہیں۔

لہٰذا وہ عمل جس کی بنیاد ایمان نہ ہو، وہ لاشے ہے اور وہ ایمان جس کے ساتھ عمل نہ ہو، چونکہ استعدادِ عمل ایمان کی موجودگی کی بناء پر باقی ہے، استعداد و صلاحیت باقی ہے مگر درخت پُر بہار تب ہی ہوگا جب صاحبِ عمل ہوگا۔

حضرات! یہاں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ خداوند عالم نے وحدت اپنی ذات سے مخصوص رکھی ہے۔ رکھی کیا ہے، وہ خود بخود ہے۔ تنہا ہونا، ایک ہونا اور بے مثل ہونا، لاجواب ہونا اور "لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" ہونا۔ یہ خدا کے علاوہ اور کسی کیلئے نہیں ہے۔ اب خدا کے سوا جو کچھ بھی ہے، نظریات ہوں تو، تشخصات ہوں تو، موجودات ہوں تو، خدا کا خود یہ دعویٰ ہے:

"سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا"۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو دوہرا قرار دیا"۔

میں صحیح ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہر چیز کو اُس نے دوہرا قرار دیا ہے اور ایک دوسرے سے وابستہ قرار دیا۔ یہ دونوں ملے جلے رہیں تو کارآمد ہیں اور اگر ان دو میں سے ایک ہو اور ایک نہ ہو تو اس کا نام موت ہے۔ جسم اور روح کا اجتماع، یہ دونوں ہیں

تو زندہ ہے۔ اب ایک ہے اور ایک نہیں ہے تو افتراق ہو گیا۔ اُسی کا نام موت ہے۔ علم ہے اور عمل نہیں۔ اب ایک ہے اور ایک نہیں ہے۔ عمل ہے اور علم نہیں ہے تو ایک کافی نہیں ہے۔ علم ہو تو عمل بھی ہو۔ علم کے ساتھ عمل ہو، جسم کے ساتھ جان ہو، لفظ کے ساتھ معنی ہوں۔

یہاں سے اگر آپ تصور قائم کرلیں تو بڑی لطف کی بات ہے۔ معنی بغیر لفظ کے نہیں اور لفظ بغیر معنی کے نہیں مگر لفظ کی جگہ معنی نہیں آسکتے اور معنی کی جگہ لفظ نہیں آ سکتا۔ لفظ ہے کتاب کیلئے مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس کتاب پر لفظ ہے، اُسی پر معنی بھی ہیں۔ معنی کا مقام کوئی اور ہے۔ لفظ کتاب کیلئے ہے اور معنی صاحب علم کیلئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے پیغمبر کا شاہد لفظوں کو نہیں قرار دیا، کتاب کو نہیں قرار دیا بلکہ اُس طرف اشارہ کیا جہاں کتاب کے معنی ہیں۔ اس لئے کہ نبوت لفظی نہیں ہے، معنوی ہے۔ اُس کی شہادت کا ادا کرنا لفظوں کا کام نہیں ہے صاحب معنی کا کام ہے۔

"قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ".

"رسولؐ! آپ کہہ دیں انکار کرنے والوں سے، میرے اور تمہارے درمیان شہادت کیلئے کافی ہے اللہ اور وہ جس کے پاس علم ہے"۔

کتنے پاکیزہ اور نفیس الفاظ ہیں "وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ"، نام کتاب کہا مگر وہ برائے نام ہے۔ کتاب کو شاہد نہیں قرار دیا جارہا بلکہ اس کو جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔ کتاب کا علم کتاب کے پاس نہیں ہے، علم کی منزل کوئی اور ہے۔ تو لفظ کتاب کیلئے اور معنی صاحب علم کیلئے، دونوں چیزوں کا اتصال رہے۔

اب اس حقیقت کو سننے کے بعد اندازہ کیجئے کہ میں اگر یہ سمجھ لوں کہ لفظ ہی

لفظ کافی ہیں تو میرا یہ سمجھنا کتنا غلط ہوگا، یا یہ کہوں کہ میرا یہ لفظ کتنا بے معنی ہوگا۔ معنی سے صرف اتصال ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ معنی ہیں کاغذ پر، لفظ ہیں کاغذ پر، لفظ ہیں کاغذ کیلئے، کتاب کیلئے معنی ہیں سینوں کے اندر۔

"بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ"۔

''اصل قرآن تو اُن آیات کا نام ہے جو اُن لوگوں کے سینے میں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے''۔

تو حضرات! قدرت نے دُہرا رکھا۔ کبھی وہ بالکل ہم جنس، دو کان دو آنکھیں اور کبھی ایک کا دُوسری چیز سے اتصال جیسے دل کا اتصال دماغ سے۔ اب دل اور دماغ کا فرق محسوس کیجئے۔ جاننا ایک چیز ہے اور اُس کے ساتھ ہے ماننا۔ آپ جانتے ہیں کہ قول مشہور ہے جاننا اور ماننا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جاننے کیلئے ضروری نہیں کہ ماننا بھی ہو۔ دُنیا میں ایسی مثالیں نظر آئیں گی کہ جانتا ہے مگر مانتا نہیں۔ ظاہر ہے کہ جاننا جس کے نتیجہ میں ماننا نہ ہو، وہ بیکار محض ہے کیونکہ جاننا تو ہوتا ہی اس لئے ہے کہ علم میں آنے والی چیز کو مانے۔ نہ ماننے سے غرض تو مفقود ہوگئی، صرف مقدمہ رہ گیا۔ وضو کر چکا، نماز پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔

تو حضرات! میں کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف جاننا ہے اور ایک طرف ماننا۔ میرے خیال میں تو نہ جاننے والا بھی جانتا ہوگا کہ جاننے کا مقام دل نہیں ہو سکتا اور نہ ہے بلکہ اُس کا صحیح مقام دماغ ہے اور ماننے کا مقام دل ہے۔ دماغ جانتا ہے اور دل مانتا ہے اور جس طرح ماننے والا دل ہے، اُسی طرح نہ ماننے والا بھی دل ہی ہے یعنی ماننا بھی دل کا کام اور نہ ماننا بھی دل کا کام۔ اب اگر توازن صحیح ہے اور مانے جانے

والوں کو مانے اور نہ مانے جانے والوں کو نہ مانے تو کیا کہنا اُس دل کا اور کہیں انقلاب ہوگیا۔ مانے جانے والوں کو نہ مانے اور نہ مانے جانے والوں کو مانے، خاک ہے اُس دل پر! بالکل انقلاب ہوگیا۔ ماننا اور نہ ماننا، یہ دونوں منصب دل کے ہیں اور جاننا اور نہ جاننا، یہ دونوں منزلیں دماغ کی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے جب کسی کے ایمان کی مدح کی ہے تو دل کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

"حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ".

"ہم نے ایمان کو تمہارا محبوب قرار دیا ہے اور اُسی محبتِ ایمان سے تمہارے دلوں کو سجا دیا ہے"۔

نہ ماننے والوں کی مذمت کی تو فرمایا:

"فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ"

"اُن کے دلوں میں روگ ہے"۔

یہ ایمان نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا:

"لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ".

"ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا"۔

تو ایمان کے مقام پر دماغ کا نام نہیں لیا ہے، دل کا نام لیا ہے۔ ماننا اور نہ ماننا دل کا کام ہے اور اصل میں ماننا ہی کوئی دل سے ہے۔ مانتا ہے تو دل سے اور نہیں مانتا تو دل سے۔ مگر جاننے کا مقام دماغ ہے۔ میرے خیال میں بدیہی بات ہے کہ جب آپ کسی بات کو بھولیں گے اور سوچیں گے تو فوراً آپ محسوس کریں گے کہ سوچنے

میں دماغ پر زور پڑ رہا ہے۔ ایک احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مقامات الگ الگ ہیں۔ ایک کا کام جاننا ہے اور ایک کا کام ماننا ہے۔ اگر یہ دونوں کام ایک ہی کے ہوتے تو پھر جو جانتا، وہ ضرور اُس کو مانتا بھی۔

قدرت نے عموماً ہر چیز کو دوہرا رکھا ہے۔ چنانچہ دینداری کو بھی اُس نے دُہرا قرار دیا ہے۔ ایک طرف ایمان ہے اور ایک طرف عمل۔ اگر ایمان پر اکتفا کر کے بیٹھ جائیں اور عمل کو چھوڑ دیں تو پھر ہم بھی تو ایسے ہو گئے کہ دو میں سے ایک کو کافی سمجھ لیا کیونکہ ایمان پر قناعت کر لی اور عمل سے بے تعلق ہو گئے۔ پھر ویسی ہی بات ہو جائے گی، اگر عمل کو کافی سمجھ لیا اور ایمان سے بحث نہ رکھی تو حضرات والا! کام تب بنے گا جب دونوں چیزیں اپنے اپنے مقام پر ہوں۔ ایمان بھی اپنے مقام پر ہو اور عمل بھی اپنے مقام پر ہو۔

حضرات والا! میں اس کے تجزیہ میں پھر ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح دینداری کے دو شعبے ہیں: ایک ایمان اور ایک عمل۔ اب الگ الگ اِن کو دیکھئے عمل کے پھر دو شعبے ہیں: ایک عمل اور دُوسرا ترکِ عمل۔ یہی تو نہیں ہے کہ شریعت نے آپ سے محض یہ کہا ہو کہ یہ کام ہیں جنہیں تمہیں کرنا ہے۔ یہ بھی تو کہا ہے کہ یہ کام ہیں جنہیں تمہیں چھوڑنا ہے۔ ہے نا یہ بات! بھئی گناہ نہ کیجئے اور واجب کو ادا کیجئے۔ دونوں شعبوں پر حاوی ہونے کے بعد آپ باعمل ہوں گے۔ تو اگر آپ نماز پڑھتے رہے اور چوری بھی کرتے رہے تو کیا آپ باعمل ہو سکیں گے؟ کوئی آپ کو باعمل کہہ سکے گا؟ نہیں! جو نہ کرنے کے کام ہیں، اُنہیں نہ کیجئے اور جو کرنے کے کام ہیں، اُنہیں کیجئے۔ تب آپ باعمل ہوں گے۔

میرے خیال میں اس کا فرق دو لفظوں میں آپ محسوس کرلیں گے کہ کرنے کے کام ہوتے ہیں کبھی کبھی یعنی وہ ہر وقت نہیں ہوتے۔ نہ نماز ہر وقت ہے اور نہ روزہ ہر وقت ہے۔ نہ تلاوت ہر وقت ہے اور نہ حج ہر وقت ہے۔ جو کام کرنے کے ہیں، وہ کبھی کبھی ہوتے ہیں اور نہ کرنے کے کام ہیں تو اُن کے بارے میں شریعت سے پوچھیں۔ جھوٹ کس وقت نہ بولیں، چوری کس وقت نہ کریں، ظلم کس وقت نہ کریں، بد عہدی کس وقت نہ کریں، یہ سوالات مہمل ہیں۔ کسی وقت بھی نہ کریں۔ نہ کسی دن کریں اور نہ کسی رات کو کریں۔ نہ صبح کو کریں، نہ شام کو۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ جو نفی کا پہلو ہے، وہ وسیع تر ہے اور جو مثبت پہلو ہے، وہ کبھی ہے اور کبھی نہیں ہے۔ حضرات! جب نفی کا پہلو وسیع تر ہو تو فوراً یہ بات آ گئی کہ نفی کا پہلو مقدم ہے۔ مثبت کا جو پہلو ہے، وہ بعد کا پہلو ہے۔ اُس کے متعلق یاد رکھئے کہ وہ بعد کا پہلو ہے۔

یعنی صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ کرنے کے جو کام ہیں، وہ آپ بعد میں کریں اور جو نہ کرنے کے کام ہیں، وہ پہلے چھوڑیں، اُن کو چھوڑنا مقدم ہے۔

ظاہر ہے کہ گناہ کے کام آپ اُسی وقت چھوڑیں گے جب اُن سے نفرت ہو گی اور کرنے کے کام آپ اُس وقت کریں گے جب اُن سے محبت ہو گی۔ تو معلوم ہوا کہ عمل کے بھی دو شعبے بنتے ہیں: ایک مثبت اور ایک منفی۔ یعنی ایک طرف نفرت اور ایک طرف محبت۔ ایک طرف سے پرہیز ہے تو ایک جانب سے قربت۔ جس طرح عمل کے یہ دونوں شعبے بالکل کھل کر آپ کے سامنے ہیں، اس طرح ایمان بھی مفرد نہیں ہے۔ ایمان کے بھی دو شعبے ہیں۔ ایمان کے معنی ماننے کے ہیں مگر ماننا کب؟

جب نہ ماننا پہلے ہو، یہ نہیں کہ آپ نے اس کو بھی مان لیا ہے، اُس کو بھی مان لیا۔ اجتماع نہیں ہوسکتا۔ جیسے چوری اور نماز کا اجتماع نہیں ہوسکتا، جیسے جھوٹ کا اور روزے کا اجتماع نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حق و باطل دونوں کو آپ نے مان لیا۔ یہ ماننا آپ کا نہیں ہوا۔ اگر آپ کہیں گے کہ حق کو تو مان ہی لیا، تو جب باطل کو مانا تو حق کا ماننا وہیں ختم ہوگیا۔ یہ ماننا بھی ختم ہوگیا۔ اُس ماننے کا نہیں مانا جاسکتا۔ باطل سے انکار پہلے کیجئے، حق کا اقرار بعد میں کیجئے۔ دونوں پہلو ایمان کے اور دونوں پہلو عمل کے۔

اب حضرات! مجھے دو چار الفاظ یہاں کہنا ہیں اور وہ یہ کہ ایمان و عمل کی منزلوں میں بڑا فرق ہے اور میں بالکل موٹی موٹی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ایمان و عمل کا فرق۔ پہلی بات تو میرے بیان میں آچکی۔ ایمان نہ آنکھ سے ہوگا اور نہ کان سے ہوگا، نہ زبان سے ہوگا اور نہ ہاتھ سے ہوگا، نہ پیر سے ہوگا۔ ایمان کا تعلق اعضاء و جوارح سے نہیں ہے۔ ایمان کا تعلق روح سے ہے۔ ماننے میں کسی کو یا نہ ماننے میں کسی کو آپ کے اعضاء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ آپ لیٹے ہوئے بھی مان سکتے ہیں، چلتے ہوئے بھی مان سکتے ہیں، بیٹھے ہوئے بھی مان سکتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ جس طرح جاگتے ہوئے مان سکتے ہیں، اُسی طرح سوتے ہوئے بھی مان سکتے ہیں۔ اعضاء و جوارح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہٰذا ایمان چونکہ کوئی فعل نہیں ہے، ہمیں نہ کچھ کرنا ہے اور نہ کچھ کہنا ہے۔ نہ ہلنا ہے اور نہ جلنا ہے۔ وہ بس ایک تسلیم ہے روح کی جانب سے۔ اقرار ہے، زبان کا نہیں بلکہ روح کا۔

اور حضرات! دل کا نام بھی برائے نام آتا ہے ورنہ تعلق تو اس کا روح سے

ہے۔ ایمان کیلئے، ایمان لانے کیلئے، ایمان رکھنے کیلئے ہمیں نہ کسی فعل کا فاعل بننا پڑتا ہے اور نہ کسی قول کا قائل بننا پڑتا ہے اور چونکہ ہمیں ایمان کے مسئلہ میں کرنا کچھ بھی نہیں پڑتا، اس لئے ایمان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم میں ماننے کی طاقت ہے کہ نہیں کیونکہ طاقت کا صرف ہی نہیں ہے۔ لہٰذا پھر ایمان کیوں دیکھے کہ ماننے کی طاقت ہے یا نہیں۔ عمل تو کبھی کبھی دیکھے گا کہ پیسے والا ہے یا نہیں، زکوٰۃ کیلئے، حج کیلئے، خمس کیلئے یا روزہ کے کفارے کیلئے یا اُس کے فدیہ کیلئے۔ وہاں تو غور کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب ایمان کی مالی حالت کیا ہے مگر ایمان لانے پر آپ کا خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ خدا ورسولؐ کے ماننے پر آپ کو کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ وہاں آپ کے مال کا کونسا صرف ہے جو یہ مسائل بن سکیں کہ ماننا زردار پر ہے، نادار پر نہیں۔ تندرست پر ہے، بیمار پر نہیں۔ مطمئن پر ہے، مضطرب پر نہیں ہے۔

مہلت جس کو ہو، وقت وفرصت جس کو حاصل ہو، اُس کیلئے ایمان ہے، فرصت نہ ہو تو نہیں ہے۔ لہٰذا چونکہ ایمان کے مسئلہ میں (ذرا ایمان سے دیکھئے گا) آپ کو کچھ کرنا ہے ہی نہیں، تو وہ ہر ایک پر لازم ہے اور ہر حالت میں ہے۔ نہ اُس میں استطاعت کی قید ہے اور نہ اُس میں طاقت کی شرط۔ نہ اُس میں اوقات کا تجزیہ کہ کس وقت ایمان ہو اور کس وقت ایمان نہ ہو مگر عمل میں صرف طاقت ہے۔ قوت ہوگی تو کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا۔ طاقت ہوگی تو روزہ رکھ سکے گا، حج کر سکے گا۔

اب کون کر سکتا ہے اور کون معذور ہے؟ یہ مسائل درمیان میں آجائیں گے اور پھر شریعت رعایت دے گی، تخفیف کرے گی، بدل قرار دے گی۔ کہے گی کہ اگر یہ نہ کر سکو تو اُس کے بدلے میں یہ کر گزرو۔ مگر ایمان بے بدل چیز ہے۔ چونکہ اُس میں

استطاعت کا اور طاقت کا سوال نہیں آتا۔ اس لئے اُس کا کوئی بدل نہیں۔

حضرات! میں یہاں ایک بات کہوں گا اور وہ یہ ہے کہ ایمان کے مسئلہ میں جبر نہیں ہے۔ آپ خود غور کریں کہ آیا خدا کہہ سکتا ہے کسی کو کہ جبراً مجھے مانو۔ جب بھی جبر کا لفظ آجائے تو ماننا تو خود ہی ختم ہو گیا کیونکہ جہاں کہیں بھی جبر کا لفظ آگیا تو ماننا تو خود ہی زائل ہو گیا۔ ایمان کے معنی ماننے کے ہیں۔ اس لئے یہ طے شدہ ہے کہ ایمان کے بارے میں جبر نہیں ہے۔

"لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ".

زبردستی کافر کو مومن نہیں بنایا جا سکتا۔ جب زبردستی ہوئی تو مانا تو نہیں اُس نے اور جب مانا نہیں تو ایمان بھی نہیں۔ لہٰذا جبر اور ایمان کا اجتماع ہو ہی نہیں سکتا۔ خواہ مخواہ کوئی بحث چھیڑے کہ خدا نے اپنے نہ ماننے والے کے سامنے تلوار کیوں نہیں اُٹھائی اور اپنے آپ کو بزورِ شمشیر کیوں نہ منوایا؟ نبی نے اپنے آپ کو بزور کیوں نہیں منوایا؟ مگر دین میں اور ایمان میں زبردستی نہیں ہے۔

"فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ، وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ".

"جس کا دل چاہے، مانے اور جس کا دل نہ چاہے، وہ ہرگز نہ مانے"۔

لیکن حضرات! جب مان لیا اور مومن ہو گیا تو اب عمل کا وقت آگیا۔ نماز اُس پر واجب، روزہ اُس پر واجب، گناہوں سے بچنا اُس پر واجب۔ غرضیکہ تمام مستحسن باتوں پر عمل اور تمام برے کاموں سے اجتناب کرے گا۔ اب دیکھئے کہ ایمان کے بارے میں تو اختیار تھا کہ لائے یا نہ لائے۔ وہ بااختیار ہے مگر جب ایمان لے آیا تو پھر مجھے سوچ کر غور کے بعد بتایئے کہ عمل کے بارے میں بااختیار ہے؟ عمل کے

بارے میں جبر و اکراہ ہے۔ زبردستی عامل بنایا جائے گا۔ عمل نہ کرے گا تو سزا دی جائے گی۔ ایمان کے بارے میں سزا دُنیا میں نہیں ہو سکتی کیونکہ زبردستی ہو جائے گی، اکراہ ہو جائے گا۔ مگر باایمان اگر ترکِ عمل کرتا ہے تو سزایاب ہوگا۔ دُنیا میں بھی بازپرس کی جائے گی، اُس پر جبر کیا جائے گا، اکراہ کیا جائے گا۔ لہٰذا عمل وہ ہے جس میں اکراہ ہے اور ایمان وہ ہے جس میں اکراہ نہیں ہے۔

اب آیت الکرسی کی وہ آیت یاد کیجئے کہ:

"لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ".

یہاں "دین" سے مراد ایمان ہے یا عمل ہے؟ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ دین سے مراد عمل نہیں ہے اور عمل میں اکراہ ہے۔ جس چیز میں اکراہ نہیں ہے، وہ ایمان ہے مگر یہاں دین خداوندِ عالم نے عمل کو نہیں کہا، ایمان کو کہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جب دین کا لفظ اکیلا آئے گا تو مراد عمل نہیں ہوگا، ایمان ہوگا۔

دین میں اکراہ نہیں ہے تو وہ ایمان میں نہیں ہے، عمل میں یقیناً ہے۔ عمل تو زبردستی کروایا جاتا ہے مگر ایمان میں زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ تو کہا جا رہا ہے:

"لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ".

"دین کے بارے میں کوئی اکراہ نہیں"۔

تو آیت نے "دین" عمل کو نہیں کہا، ایمان کو کہا ہے۔ پھر اگر وہی کہنے والا یہ کہے کہ:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ".

"آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا"۔

تو ذرا سوچ کر بتایئے عمل کو کامل کر دیا یا ایمان کو؟ ذکر عمل کا ہو رہا ہے یا ایمان کا؟ یہ تو اُس شے کو کہا ہے جس شے میں کوئی اکراہ نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ عمل کا ذکر نہیں ہے اور اس سے قبل تم اس سے بے خبر تھے، آج کامل کر دیا۔ تب ہی تو آخر میں کہا

"رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا"۔

"اسلام کو بحیثیت دین ہم نے پسند کر لیا ہے"۔

تو جس دن بھی یہ آیت آئی، اس سے بحث نہیں کہ وہ کس دن آئی اور اس سے بحث نہیں کہ اُس دن کیا ہوا۔ مگر جو کچھ بھی ہوا، اس سے واضح ہے کہ ہمارے لئے کوئی جزو دین (ایمان) باقی تھا۔ "ہمارے لئے" کے الفاظ اس لئے کہے کہ ہمارے لئے ایمان کا کوئی جزو باقی تھا اور رسالت مآبؐ کے لئے رسالت کا کوئی جزو باقی تھا۔ ہمارے ایمان کا جزو باقی تھا تو وہ آ گیا اور ہمارا ایمان پورا ہوا اور رسالت مآبؐ نے رسالت کا ایک جزو بتلا دیا تو اُن کی رسالت مکمل ہو گئی۔ پھر آیت نے ہمیں سنانے کیلئے کہا۔ ہمارے ایمان کا جزو باقی تھا، وہ پہنچا دیا گیا، بتلا دیا گیا۔ بتانے والے کا کام بتانا ہے اور ماننے والے کا کام ماننا ہے۔ بتانے والے نے بتا دیا اور سنانے والے نے سنا دیا کہ آج تمہارے دین کو کامل کر دیا، یعنی تمہارے ایمان کو۔

میرے خیال میں مجھے زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایمان کے بارے میں اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ اگر کوئی جزو باقی نہ بھی رہا تو ایمان تو رہا، یہ بالکل غلط ہے۔ ایمان وہ چیز نہیں ہے کہ جس کا جزو رہ جائے اور کوئی جزو چلا جائے۔

ہمارا ایمان ہمارے لئے بالکل ایسا ہے جیسے رسالت رسولؐ کے لئے ہے۔ تو جب رسالت کے بارے میں فیصلہ کن حکم موجود ہے کہ اگر ایک حکمِ خدا نہ پہنچایا تو گویا

رسالت ہی نہ پہنچائی۔ وہی حکم جو رسالت مآبؐ کے لئے جزوِ رسالت تھا، وہی ایمان والوں کیلئے ایمان کا جزو تھا۔ تو جب آیت کے نہ پہنچانے کی صورت میں رسولِ خداؐ کو متنبہ کیا گیا کہ یہ رسالت کے نہ پہنچانے کے مترادف ہوگا تو اِس جزوِ ایمان کو قبول نہ کرنے کی صورت میں ہمارا ایمان مکمل طور پر زائل ہو جائے گا۔

یہاں میرا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ ایمان تو بہت بڑی چیز ہے۔ جب عمل کے کسی جزو کے رہ جانے پر عمل باقی نہ رہے تو ایمان کے کسی بھی جزو کے نہ ہونے پر ایمان کیسے باقی رہ سکتا ہے؟

غور فرمائیں کہ اگر واجباتِ نماز میں سارے واجبات ادا کر دیئے مگر اگر ایک واجب باقی رہ گیا تو کیا آپ کی نماز ہوگئی؟ آدھی، تہائی، چوتھائی، کوئی حصہ نماز کا ہوگیا؟ روزہ میں ساری شرائط پوری کر دیں، ایک چیز نہ ہوئی تو کیا اتنا روزہ رہ جائے گا جتنا اُس کا جزو ہوگیا؟ لہٰذا جب عمل اپنے ہزاروں اجزاء کے ہوتے ہوئے ایک جزو کے نہ ہونے پر بالکل نہ رہے تو پھر ایمان اتنی کمزور چیز ہوئی کہ کسی جزو کے نہ ہونے پر وہ رہ جائے۔ جو رہتا ہے، پورا رہتا ہے اور جو جاتا ہے تو پورا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز نہیں ہے کہ جو ناقص ہو کر رہے۔

غرضیکہ حضراتِ والا! قدرت نے ہر چیز کی دُہری بناء قرار دی ہے۔ دونوں ہوں تو وہ چیز کارآمد ہوگی۔ اگر ایک ہو اور ایک نہ ہو تو پھر ایک بھی نہ ہو۔ جسم و جان ہے، علم و عمل ہے، لفظ اور معنی ہیں، دل اور دماغ ہیں اور پھر کہہ لیجئے کہ قرآن اور اہلِ بیتؑ ہیں۔

اب پھر آجایئے اس آیتِ انور کی طرف جس میں ایک خاص وقت یعنی عصر

کی قسم اللہ نے کھائی ہے۔ خدا ہی جانے کہ وہ وقتِ عصر اُس کی نظر میں کتنا مہتمم بالشان ہے۔ حضرات والا! قسم اُسی شے کی کھائی جاتی ہے جس سے کھانے والے کو لگاؤ ہو۔ بغیر لگاؤ کے تو کوئی چیز اس لائق نہیں ہوتی کہ اُس کی قسم کھائی جا سکے۔ صاحبِ قسم کی نظر میں اہمیت ہو تو کوئی چیز مقامِ قسم میں آئے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ عصر جس کی قسم پروردگار کھا رہا ہے، خدا کی اُس سے خاص وابستگی ہے۔ ''وَالْعَصْرِ'' کا پہلا ہی لفظ پورے بیان کا دروازہ کھول رہا ہے۔ عصر متعین کی قسم ہے، عصر مخصوص کی قسم ہے۔ یوں تو عصر کا وقت روز ہی آتا ہے مگر ہر رز کا عصر قسم کے لائق نہیں ہے۔ یہ تو کائناتِ عالم کا کوئی ایک ہی دن ہے اور صرف اُسی دن کا ذکر قسم کھانے کے قابل سمجھا گیا ہے۔

اب ایسے وقتِ عصر کو تلاش کیجئے اُس میدان میں جس میں وقتِ عصر بھی مل جائے اور جہاں وہ دونوں گروہ بھی مل جائیں جو آمنے سامنے ہوں۔ اُن میں سے ایک وہ جس کی زیاں کاری کی کوئی حد نہ ہو اور دُوسرا اس شان والا ہو جس کے انتہائے ایمان و عمل کی مضبوطی کی کوئی حد نہیں۔

''لَفِیْ خُسْرٍ'' والے بھی ہوں اور ''اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ'' والے بھی ہوں۔ ایمان اور عمل صالح کا ذکر تو قرآن میں بہت مقامات پر آیا ہے مگر یہاں ایک اضافی جملہ اور بڑھایا گیا ہے ''وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ'' (دُوسروں کو حق کی تلقین بھی کرتے ہیں اور صبر کی تلقین بھی)۔

لفظ ''صبر'' بتا رہا ہے کہ وہ دن مصیبت کا ہے اور خصوصاً وقتِ عصر جو ہے، وہ انتہائے مصیبت کا وقت ہے۔

اس سورۂ انور کی مکمل تفسیر، جہاں ہر پہلو واضح ہو رہا ہے، کربلا کا میدان

ہے۔ عصر عاشورہ وہ وقت ہے جب آپ کے امامؑ کے دل میں ایک تمنا پیدا ہوئی، وہ کیا؟ کہ آج اس وقت میرے سوگوار میرے سامنے ہوتے، اور سب کے سب ہوتے، میری قوم کے بچے بھی ہوتے، جوان بھی ہوتے۔ بوڑھے بھی ہوتے، مرد بھی ہوتے، عورتیں بھی ہوتیں، میری ساری قوم کاش میرے سامنے ہوتی اور میں ان افراد قوم کے سامنے ہوتا۔

امامؑ کو معلوم تھا کہ اُنؑ کے عزادار ہوں گے۔ امامؑ یہ بھی جانتے تھے کہ جتنا گریہ اُن کی شہادت کے سلسلہ میں ہوگا، عالم میں کسی پر نہ ہوگا۔ جس اہتمام سے صفِ ماتم اُن کے ماتم پر بچھے گی، اُنؑ کے سوا کسی کیلئے نہیں بچھے گی۔ خود اُنؑ کے گھرانے کے دیگر آئمہ کیلئے اس قدر اہتمام نہ ہوگا جتنا اُن کی عزاداری کا ہوگا۔ ماتمدار بھی ہوں گے، عزادار بھی ہوں گے، ذاکر بھی ہوں گے، سامع بھی ہوں گے، گریہ کرنے والے بھی ہوں گے۔ شوق و جذب بھی ہوگا۔ یہ سب کچھ ہوگا مگر آج تو میرے اوپر انتہائی بیکسی ہے۔ میرے وہ عزادار، میرے وہ غمخوار آج ہوتے!

ایک کلمہ امامؑ کی زبان پر آگیا:

"لَیْتَ کُمْ فِیْ یَوْمِ عَاشُوْرَا جَمِیْعًا".

"کاش! تم سب کے سب ہوتے اور عاشور کے دن ہوتے"۔

ہر تمنا کی کوئی بناء ہوتی ہے۔ ہر آرزو کا مقصد ہوتا ہے۔ تو امامؑ کے دل میں یہ تمنا کیوں پیدا ہوئی؟ اس لئے نہیں کہ مجھے تلواروں کی زد سے بچاتے، اس لئے نہیں کہ میرے اصغرؑ کی لاش میرے ہاتھوں سے لے کر دفن کرتے، اس لئے نہیں کہ میرے ساتھ مل کر عباسؑ کی لاش اُٹھواتے، اس لئے نہیں کہ کڑیل جوانؑ کی لاش کو میرے لئے

اُٹھانا دو بھر ہو رہا تھا، تم میری مددگاری کرتے، اس لئے نہیں کہ زینبؑ کی چادر بچاتے، اس لئے نہیں کہ میرے اسیروں کی مدد کرتے۔

امام حسین علیہ السلام کی تمنا کا عجیب رُخ ہے اور وہ رُخ یہ ہے:

"تَنْظُرُوْنِیْ"۔

"میری قوم مجھے ایک نظر دیکھ لیتی"۔

سنئے! امامؑ دیکھنے کے وقت کا تعین فرما رہے ہیں۔ تم مجھے ایک نظر دیکھ لیتے اور کس وقت دیکھ لیتے؟ جب میں بے آب و شیر اصغرؑ کیلئے پانی مانگ رہا تھا۔ جب میرے ہاتھوں پر میرا طفل (بچہ) تھا۔ میرا شیر خوار جب میرے ہاتھوں پر تھا۔

کاش! تم ہوتے اور ایک نظر دیکھ لیتے کہ میں اپنے بے آب بچے کیلئے کس کس طرح سے پانی مانگتا رہ گیا۔ کس کس انداز سے میں نے سوال کیا۔ پانی کے ایک گھونٹ کا سوال بھی اکبرؑ کیلئے نہیں بلکہ اصغرؑ کیلئے۔ زبان سے بولنے والے کیلئے نہیں، زبان سے نہ بول سکنے والے کیلئے۔

"فَاَبَوْا اَنْ یَرْحَمُوْنِیْ"۔

"مگر دیکھتے تم تو یہ دیکھتے کہ بڑی بے رحمی سے مجھے جواب ملا"۔

یہ تو تھا امامؑ کا قول۔ اب آپ خود غور فرمائیں کہ کتنا بھیانک تھا عصر کا ہنگام جب کہ بھائی کا سر تن سے جدا نظر آ رہا تھا اور وہی وقت جناب زینب سلام اللہ علیہا کے بے چادر ہونے کا تھا۔ وہی وقت خیامِ حسینؑ کے جلنے کا تھا اور وہی وقت گھر لٹنے کا تھا۔

جناب فاطمہ کبریٰ ارشاد فرماتی ہیں کہ عصر کا وقت ڈھل گیا۔ باپ کا سر نیزے پر سوار ہو چکا۔ ہم بے وارث ہو چکے۔ ہمارا کوئی نہ رہا اور میں درِ خیمہ پر کھڑی

اپنے شہیدوں کی لاشوں کو دیکھ رہی تھی کہ تمازتِ آفتاب میں لاشیں پڑی ہیں۔ نہ کوئی شہداء کو غسل دینے والا ہے، نہ کفن دینے والا ہے، نہ سرہانے بیٹھنے والا ہے۔ حسرت سے در خیمہ پر شہداء کی لاشوں کو دیکھ رہی تھی۔

فرماتی ہیں کہ سوچ رہی تھی کہ مرد تو مارے گئے، خدا جانے ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟ دشمنانِ دین ہمیں قتل کریں گے یا قید کریں گے! اُس سے اُن کو روکنے والا کون ہے؟ پیاس کی وہ شدت تھی کہ کاسۂ سر پگھلا جا رہا تھا۔ اس اثناء میں میں نے دیکھا کہ ایک مہیب صورت شخص نیزہ ہاتھ میں لئے خیمہ کی طرف آتے ہوئے نظر آیا۔ خیال ہوا کہ رسولؐ خدا کی نواسی کے پاس جا کر اُن کے دامن میں پناہ لوں کہ ظالم نے بڑھ کر میری چادر چھین لی اور میری پشت پر ایک نیزہ مارا۔

فرماتی ہیں کہ نیزہ کی زد سے میں زمین پر گر پڑی۔ بے حال تو ہو ہی رہی تھی اور گرنے کے کچھ دیر بعد میرے کان میں متعدد مرتبہ یہ آواز آئی: ''بیٹی! اُٹھو''۔ اسی اثناء میں مجھے احساس ہوا کہ میرا سر بھی پھوپھی کی گود میں ہے۔

پھر آواز آئی: ''بیٹی! اُٹھو''۔ مجھے تو یتیموں کو دیکھنا ہے۔ تم کب تک یوں پڑی رہو گی؟ میں سمجھ گئی کہ پھوپھی حکم دے رہی ہیں۔ تو میں نے کہا: ''پھوپھی اماں! اُٹھوں کیسے، میری چادر تو رہی نہیں؟'' معظمہؑ نے فرمایا: ''بیٹی! ذرا آنکھ تو کھولو اور آنکھ کھول کر میرے سر کو تو دیکھو''۔

آنکھ کھولی تو میں نے یہ قیامت دیکھی کہ زینبؑ علیا کا سر بھی بے ردا ہے بلکہ سب مستورات بے ردا بیٹھی ہیں۔ میں اُٹھی اور پھوپھی کے ہمراہ اپنے بھائی کے خیمہ کی طرف گئی تو ایک آدمی کو اس خیمہ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اُس نے، جس بستر پر

بیمار بھائی لیٹا تھا، اُس کو اس بیدردی سے کھینچا کہ بیمار بھائی منہ کے بل گر پڑا۔ جب پھوپھی نے یہ دیکھا تو بیمار کو اُٹھاتے ہوئے کہا: "بیٹا! میں اس لئے زندہ رہ گئی کہ تمہیں یوں خاک پر پڑے ہوئے دیکھوں؟"

بھائی سجادؑ نے بھی سر اُٹھایا اور فرمایا: "پھوپھی اماں! میرا ابھرا ہوا کنبہ قتل ہو گیا، ایک میں زندہ رہ گیا، اس لئے کہ آپؑ کے سر کو برہنہ دیکھوں؟ کیسے تاب لاؤں کہ آپؑ کے سر کو برہنہ دیکھوں؟"

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔

دوسری

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَهُمْ رَاکِعُوْنَ". (المائدہ:55)

"بے شک تمہارے سرپرست اللہ اور اُس کا رسولؐ اور وہ ایمان والے ہیں جو صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور رکوع میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں"۔

حضراتِ والا! اس آیت کے بیان سے پہلے مجھے یہ کہہ دینا ضروری ہوگا کہ قرآن مجید نام ہے اللہ کے آخری کلام اور اُس کے آخری پیغام کا۔ چونکہ یہ کتاب آخری کلامِ خدا اور آخری پیغامِ خدا کی حیثیت سے نازل ہوئی، اس لئے جو کچھ اس میں کہہ دیا گیا ہے، اُسے قیامت تک باقی رہنا ہے اور جو حکم ہوگیا، وہ قیامت تک باقی رہے گا اور جو بھی چیز ہوگئی، وہ بھی قیامت تک باقی رہے گی۔ کسی کی مدح ہوگئی تو قیامت تک باقی رہے گی اور کسی کی مذمت ہوگئی تو وہ بھی قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ اس کے بعد قدرت کو نہ کچھ کہنا ہے اور نہ کچھ بھیجنا ہے۔ اس کی ہر آیت جس مسئلے کے بارے میں بھی ہو، حرفِ آخر ہے۔

توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن دیکھنے میں ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر جامع کتاب نے اور قرآن کے نازل کرنے والے نے اس کتاب کو ایسا "لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی" ذخیرہ قرار دیا ہے کہ تا قیامِ قیامت آنے والے تمام مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ نہ کوئی رطب کی بات ہے جو اس میں نہ ہو اور نہ کوئی یابس کی بات ہے جو اس میں مندرج نہ ہو۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَمَافَرَّطْنَافِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ". (الانعام:38)

"اور ہم نے کتاب میں کوئی بات نظر انداز نہیں کی"۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ کتابِ خدا کی محدود عبارت لامحدود معنی کی حامل ہے۔ تو پھر اس کیلئے خود بخود یہ امر ضروری قرار پا گیا کہ اس ایک بات میں دیکھنے میں بات ایک ہو اور مفہوم کے لحاظ سے ہزاروں باتیں چھپی ہوئی ہوں گی۔ اسی بناء پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اَلْقُرْآنُ لَهٗ ظَهْرٌ وَّلَهٗ بَطْنٌ".

"قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے"۔

"وَلِبَطْنِهٖ بَطْنٌ"۔

"اور اس کے باطن میں ایک اور باطن ہے"۔

"اِلٰی سَبْعَتِ اَبْطُنٌ".

"بلکہ سات باطن ہیں"۔

"بَلْ اِلٰی سَبْعِیْنَ بَطْنًا".

"بلکہ ستر باطن ہیں"۔

سرکارِ دو عالم ارشاد فرماتے ہیں:

'مَامِنْ حَرْفٍ فِیْ حُرُوْفِ الْقُرْآنِ اِلَّالَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَعْنًا'

"حروفِ قرآن میں سے کوئی حرف ایسا نہیں ہے جس میں کم از کم ستر ہزار معنی نہ ہوں"۔

ہم اپنی ناسمجھی کی بناء پر حیران ہونے لگیں کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک حرف میں ستر ہزار معنی ہوں؟ ہماری بات بہت سے بہت بڑھ گئی تو ہم اس کو 'ذو

مُغنیتیں" کہتے ہیں کہ ایک بات ہے اور دو معنی نکل رہے ہیں۔ ہماری رسائی بس اتنی ہی تھی۔ کہاں ہمارا کلام اور کہاں خلاقِ کلام کا کلام! ہم ہیں ضعف کی انتہا اور وہ ہے قدرت کی انتہا۔ یہاں عاجزی کا کمال ہے اور وہاں قدیری کا کمال! بھلا کیا قیاس کیا جاسکتا ہے اُس کے کلام کو ہمارے کلام پر؟

خداوند عالم کی ایک ادنیٰ قدرت یہ ہے کہ اُس نے ہم جیسے خاک کے ذرّوں کو گویائی کی زبان دے دی۔ اگر یہ سچ ہے کہ ہم خاک کے ذرّوں سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں اور اسے سچ ماننا ہی پڑتا، اس لئے کہ جو کوئی اصل میں ہوتا ہے، وہ بالآخر ہو کے رہتا ہے۔ خاک میں مل جاتا ہے اور خاک ہو جاتا ہے۔ اگر ہم خاک نہ ہوتے تو خاک نہ ہو جاتے۔ ہر چیز کی بازگشت اپنی اصل کی طرف ہوا کرتی ہے۔ ہمارا خاک ہو جانا بتا رہا ہے کہ ہماری اصل خاک سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہے۔

لہٰذا اگر یہ مسلّم ہے کہ ہم خاک کے چند ذرّے ہیں، قدرت نے اِن ذرّوں کو ملا دیا اور ان ذرّوں کو ایک مزاج دے دیا۔ جب وہ ذرّے الگ الگ تھے تو بولنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے، خداوند عالم نے ذرّوں کو اس طرح ملایا کہ اُسے زبانِ گویا عطا کر دی۔ تو جس نے خاک کو بولنا سکھا دیا ہو، اُسے کون بولنا سکھائے گا! اُس کے کلام کا مقابلہ، اُس کے کلام کی قادرالکلامی کی مثال بھلا عالم میں کہاں مل سکتی ہے!!

ایک حرف کہتا ہے اور ستر ہزار معنی اُس ایک حرف میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ چھپے ہوئے ہیں ہماری نگاہوں سے۔ لیکن اگر نور کی نظر ہو تو یہ پردے اُٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے:

"لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ لَمْ اَزْدَدْتُ يَقِيْنًا".

"بڑھا کرتی ہے وہ چیز جو گھٹی ہوئی ہوتی ہے"۔

یہ تمہید اس لئے قائم کی ہے کہ جب قرآن کی جامعیت اور وسعت کا یہ عالم ہو کہ ایک حرف میں ستر ہزار معنی ہوں تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ خدا کسی کی مدح میں ایک حرف بھی کہہ دے تو ستر ہزار حروف مدح ہو گئے اور کسی کی مدح میں ایک جملہ آ جائے تو پھر اُس کے لاکھوں فضائل بیان ہو گئے بلکہ ایسے جملے بھی نظر آئیں گے جن میں کروڑوں معنی ہوں گے اور کئی کروڑ فضائل ہوں گے۔ اگر کوئی آیت مستقل آ جائے تو پھر کتنے فضائل اُس کے بیان میں آ گئے اور اگر ایک سورت کی تیس آیات بصورت ھَلْ اَتٰی آ جائیں تو کس کی زبان میں طاقت ہے کہ ان کے فضائل و محامد بیان کرے!

حضرات! یہاں مجھے ایک بزرگوار کے کچھ شعر یاد آ رہے ہیں (جناب احسن جائسی کے) اور میں ایسے افراد کے کلام کو بڑی قدر سے دیکھتا ہوں جو کسی فرقہ اسلامی سے تعلق رکھتے ہوں مگر اُن کی نظر میں عصبیت نہ ہو۔ اپنی آزادیٔ خیال کو یہ کہہ کر بیان کرتے ہیں:

منم سنی و لیکن از تعصب الاماں گویم
پسند خاطرم انصاف از دُنیا و مافیہا

کتنا پاکیزہ خیال ہے، پھر فرماتے ہیں:

سخن سنجیدہ میگویم۔ مضامیں چیدہ می گویم
کتب را دیدہ می گویم۔ چہ باک از طعنۂ اعدا
نہ ہیم طاعنہ دارم کہ حق را در زبان دارم
خدائے دو جہاں دارم نہ دارم با کسے پرواہ

میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جائسی صاحب نے اتنا کچھ فرما دیا ہے کہ اگر میں ان چیزوں کو اپنے حوالہ کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کروں، حالانکہ میرے سامنے میری قوم ہے اور یہ لفظ بھی میرا کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میرے سامنے میرے، بہت سے معتقد حضرات ہیں جو مجھے راست گو سمجھتے ہیں لیکن اگر اُن کے خیالات کو میں اُن کے حوالہ کے بغیر عرض کر دوں اور اپنا کلام قرار دے کر پیش کروں تو ممکن ہے کہ میری قوم کے افراد غلو یا مبالغہ کہہ دیں گے یا ایسا کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ فرماتے ہیں:

ز تفسیر کلام اللہ چو می پرسی شود ناطق
کہ سہ صد آیہ نازل شد بشانِ شوہرِ زہراؑ

احسن جائسی کے سابقہ شعر کے مطابق تین سو آیتیں شوہرِ زہراؑ کی شان میں نازل ہوئیں۔ قرآن قولِ آخر و پیغامِ آخر ہے۔ ہر بیان حرفِ آخر ہے اور مجھے کہہ لینے دیجئے کہ قرآن وہ کتاب نہیں جس کا مقصد کسی کی مدح یا مذمت ہو بلکہ قرآن کے نزول کا مقصد (بڑی گہری بات کہنا چاہ رہا ہوں) ہدایت ہے۔ یہ ہدایت نامہ ہے۔ قانونِ الٰہی کو منکشف کرنے والی کتاب کا نام قرآن ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ قانون کو کیا غرض ہے کسی کی مدح سے یا مذمت سے۔ قانون کے تو معنی یہ ہیں کہ مقنن کو یہ بتانا ہے کہ تمہیں وہ کرنا چاہئے اور وہ نہیں کرنا چاہئے۔ قانون تو اوامر و نواہی کا مجموعہ ہے۔ یہ بتانا اُس کا کام ہے کہ کسے ماننا چاہئے اور کسے نہ ماننا چاہئے۔ کس کیلئے "نعم" کہو اور کس کیلئے "لا" کہو، کس کیلئے اقرار کرو، کس کیلئے انکار کرو، کونسا عمل کرنے کا ہے اور کونسا عمل چھوڑ دینے کے لائق ہے۔ یہی تو قانون کے معنی ہیں۔

چنانچہ قرآن خود غرض وغایتِ کتاب بتا رہا ہے:

"ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ. هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ".

"اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کیلئے"۔

کتاب ہدایت کیلئے آئی۔ کتاب کا جو سورہ آیا، ہدایت کی غرض سے آیا۔ سورتوں میں جو آیت آئی، وہ ہدایت کی غرض سے آئی۔ قرآن کُل کا کُل ہدایت کیلئے ہے اور اس کا ہر جزو برکت وہدایت کیلئے ہے۔ جو چیز جزوِ ہدایت کیلئے نہیں ہے، وہ کتاب یا اس کا حصہ نہیں ہو سکتا۔

"ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ. هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ".

اس ساری کتاب کیلئے کہہ رہا ہے۔ یعنی پوری کتاب ہدایت ہے اور پوری کتاب اُسی وقت ہدایت ہو گی، جب کوئی سورۃ اور کوئی آیت مقصدِ ہدایت سے خالی نہ ہو۔ جب کوئی سورۃ اور کوئی آیت مقصدِ ہدایت کے بغیر نہ ہو، جو کچھ ہے اُس سے غرض ہدایت ہے اور جو سورۃ ہے، اُس سے غرض ہدایت ہے، جزو سے غرض ہدایت ہے تو کُل سے غرض ہدایت ہے۔ جو کچھ بھی قرآن ہے، وہ سب کا سب ہدایت کیلئے آیا (ذرا سی توجہ رکھئے گا) کہ جب کُل قرآن ہدایت کیلئے ہے تو پھر ان کا یہ فرمانا کہ "سہ صد آیہ نازل شد بشانِ شوہرِ زہرا" تو یہ سب آیات تو اچھائی ہی کہتی ہوئی آئی ہیں۔ مدح ہی کرتی ہوئی آئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ تین سو آیات جو حضرت علی علیہ السلام کی مدح کرتی ہوئی آئی ہیں، اُن کا مقصد ہدایت ہے یا نہیں؟ اگر اُن کا مقصد ہدایت نہیں تو پھر یہ قرآن نہیں اور وہ یقیناً قرآن کی آیات ہیں۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اُن کا مقصد بھی ہدایت

ہے۔ تو پھر اس کے معنی صاف یہ نکلے کہ اُن کی مدح کے بغیر ہدایت کا حق پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ یعنی اُن کی مدح کا مقصد اُن کی مدح نہیں ہے بلکہ مقصدِ مدح ہدایت ہے۔ اگر اُن کی مدح نہ آتی تو ہدایت کا حق ہی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی مدح کسی ہدایت کی غرض سے کی گئی ہے اور وہ ہدایت اگر میں سادہ الفاظ میں کہوں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے منوانا چاہا، اس لئے پہچان کروانا چاہی۔

میں عرض کروں گا کہ مدح و مذمت دونوں چیزیں ہدایت کے امر میں اتنی مؤثر اور ضروری تھیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ پورے قرآن کے سارے خلاصہ کا نام سورۃ الحمد ہے۔ پورا قرآن سورۂ فاتحہ کی سات آیات میں سمٹ کر آ گیا ہے۔ جو تمام قرآن ہے، وہ سب کا سب سورۃ الحمد میں ہے اور چونکہ سورۃ الحمد کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے، یہ ہمیں آسانی دے دی ہے کہ سات آیتیں پڑھوا کر ہمیں کُل قرآن کا قاری بنا رہا ہے کیونکہ جو تمام قرآن ہے، وہ سب سورۃ الحمد میں ہے اور سورۃ الحمد کے بغیر نماز نہیں۔ یہ جملہ مشہور ہو گیا ہے:

"لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِفَاتِحَۃِ الْکِتَاب".

"کوئی نماز نہیں ہے سورۃ الحمد کے بغیر"۔

پنجگانہ نماز ہو، نماز جمعہ ہو، نماز عیدین ہو، نماز آیات ہو، کسی قسم کی نماز دیکھ لیجئے، الحمد سے خالی کوئی نماز ہے؟ دوسری سورتوں سے خالی نماز ہو سکتی ہے۔ سورۂ اخلاص نماز کا جزوِ مستقل نہیں ہے اور اس کے عوض ہمیں اختیار ہے کہ کوئی دوسری سورت پڑھ سکتے ہیں۔ مگر سورۂ فاتحہ وہ سورۃ ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے۔ ہم چاہیں کہ اس کی بجائے کوئی اور سورۃ یا اس کا کوئی حصہ پڑھ لیں، جی نہیں، اس کی جگہ کیا،

اُس کا قائم مقام کوئی سورۃ ہو ہی نہیں سکتی۔ الحمد کے بغیر کوئی نماز نہیں ہو سکتی۔

پھر ظاہر ہے کہ کوئی نماز رکوع کے بغیر نہیں ہے، سجدے کے بغیر نہیں ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ نماز کیلئے عالی ارکان ہیں جن سے خالی ہونے پر نماز، نماز نہیں رہتی۔ کسی بھی قسم کی نماز ہو، اُس میں الحمد، رکوع اور سجدہ ضروری ہیں۔

مگر حضرات! اُن نمازوں کے مقابلہ میں ایک نماز تو ہے جس میں نہ الحمد ہے، نہ رکوع ہے اور نہ سجدہ ہے لیکن وہ ہے نماز! یہ سب ارکان واجزاء اُس میں شامل نہیں ہیں۔ آج ہم پڑھ رہے ہیں اور کل اوروں سے پڑھوائیں گے یعنی نماز جنازہ۔ اس میں سورۃ الحمد کہاں ہے؟ اس میں کوئی رکوع یا سجدہ ہے؟

جو اتنے بلند مرتبہ ارکانِ نماز تھے، اُن میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا۔ مگر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نماز رکوع وسجود نہ ہونے کی بناء پر نماز نہیں ہے یا سورۃ الحمد کے نہ ہونے کی بناء پر وہ نماز نہیں ہے؟ کسی کی مجال ہے؟ قرآن نے اس کو نماز کہا ہے۔ لہٰذا ایک ایسی نماز ہے کہ اُس میں الحمد نہیں ہے مگر وہ نماز ہے۔ رکوع نہیں ہے مگر نماز ہے، سجود نہیں ہیں۔

مگر، اللہ اللہ! جو نماز الحمد کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، جو نماز رکوع کے بغیر بھی ہو سکتی ہے، وہ نماز بھی محمدؐ وآلِ محمدؐ پر درود کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے کہ جن نمازوں میں الحمد ہے، رکوع ہے، سجود ہیں، اُن میں بھی ہر ایک نماز میں محمدؐ وآلِ محمدؐ پر درود لازمی جزو ہے۔ یعنی اُن ہستیوں پر نماز میں درود کے بغیر نماز درست نہیں ہوتی اور درود، وہ مہتمم بالشان جزو ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی وہ نماز پسند نہیں جس میں محمدؐ وآلِ محمدؐ

کا ذکرِ خیر نہ ہو۔ جس نماز میں ان حضرات کی ثناء نہ ہو، جس نماز میں ان حضرات پر درود و سلام نہ ہو۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سات آیتوں میں پورا قرآن قدرت نے سما دیا ہے اور پورے قرآن کا خلاصہ قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ جب پورے قرآن کا خلاصہ یہ سات آیات ہیں تو پھر ہر آیت اس سورۃ الحمد کی کتنی عظیم الشان آیت ہوئی۔

اب اگر یہ چاہیں کہ اس خلاصہ میں حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بھی آ جائے یا کسی اور نبی کا قصہ درج ہو جائے تو پھر یہ خلاصہ تو نہ رہے گا۔ خلاصہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو باتیں نہایت اہم ہوں گی، وہ رہیں گی اور جو غیر اہم ہیں، وہ ظاہر بہ ظاہر نہ رہیں گی۔

قصصِ انبیاء سورۂ الحمد میں کہاں ہیں؟ قرآن کے بہت سے اوامر و نواہی سورۂ الحمد میں کہاں ہیں؟؟ اگر اوامر و نواہی سورۂ الحمد میں ہیں تو صراطِ مستقیم کے الفاظ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ منکشف ہونے کی حیثیت سے تو نہیں ہیں۔ تو اتنی عظیم چیزیں جو قرآن میں جا بجا ہیں، وہ بظاہر موجود نہ رہیں۔

اگر آپ چاہیں کہ اس خلاصہ میں سورۂ انعام بھی آ جائے اور سورۂ عنکبوت بھی تو اتنی گنجائش سات آیتوں والی سورۂ الحمد میں کہاں ہے؟ نہایت اہم چیز ہو تو وہ سورۂ الحمد میں رکھی جائے۔ کتنی اہم چیزیں اُس میں آئیں گی اور کتنی غیر اہم چیزیں نظر انداز کر دی جائیں گی۔

لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ مدح و مذمت، یہ دونوں پہلو قرآن کی نظر میں ایسے ضامنِ ہدایت ہیں کہ نہ مدح کے بغیر ہدایت کا حق پورا ہو سکتا ہے اور نہ مذمت کے بغیر ہدایت کا حق پورا ہو سکتا ہے۔ مدح کے مستحق کی مدح کے بغیر ہدایت، ہدایت نہیں اور

قابلِ مذمت افراد کی مذمت کے بغیر ہدایت دینا ممکن نہیں۔ لہٰذا سورۂ الحمد مقصد ہدایت کو نہیں چھوڑ سکتی اور نہ کھو سکتی ہے۔ تو سات آیتوں میں پورا قرآن سما گیا اور اُن سات آیتوں میں مدح بھی موجود ہے اور مذمت بھی۔

"صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ".

مدح کے استحقاق رکھنے والوں کی واضح نشاندہی کر رہے ہیں اور:

"غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ".

میں "غیر" کے بعد کے الفاظ مذمت اور لفظ "الضَّآلِّيْنَ" بھی مذموم افراد کے ذکر کو نمایاں جگہ دے رہا ہے۔ لہٰذا مدح وذم دونوں ہمارے سامنے آ گئے۔

ہر نماز پڑھنے والا کہتا ہے کہ بار الٰہا! مجھے اُن لوگوں کی راہ پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا ہے اور اُن کی راہ سے بچا جن پر تیرا غضب ماضی میں ہو چکا یا ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا۔ مدح بھی آ گئی اور مذمت بھی۔

مدح کا عنوان عجیب ہے اور مذمت کا عنوان بھی عجیب ہے۔ عام نگاہوں نے کہاں دیکھا ہے ان باتوں کو کہ مدح کی ہے ماضی کے صیغوں میں۔ "اَنْعَمْتَ" ماضی کا صیغہ ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ نعمتیں دی جا چکیں۔ اب دی جانے والی نہیں ہیں۔ نہ زمانہ حال کا صیغہ ہے اور نہ مستقبل کا یا مضارع کا صیغہ۔

اگر اسی کے ساتھ یہ کہا جاتا کہ اُن کے راستہ سے بچانا جن پر تو غضب نازل کر چکا ہے تو جو زمانہ ماضی میں گمراہ ہو گئے تھے، آ جاتے اور جن پر غضب ہونا ہے، وہ چھوٹ جاتے اور حال و مستقبل میں گمراہ ہونے والے بھی دائرۂ دُعا سے نکل جاتے۔ جب ان دونوں (مغضوب وضالین) کے تمام افراد سے بچنے کی دُعا نہ ہوئی تو پھر دُعا

کیا ہوئی ؟

یہ ہے کمالِ فصاحتِ قرآن جس پر عام نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ ''اَنْعَمْتَ'' کا صیغہ ماضی میں بیان کیا اور جب غضب و گمراہی کا ذکر آیا، فعل ہی استعمال نہ کیا بلکہ جملہ اسمیہ استعمال کر دیا جس کا اطلاق ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں پر ہوتا ہے۔

لہٰذا فعل ہی استعمال نہ کیا کہ اگر ماضی کا ذکر آئے گا تو حال اور مستقبل والے نکل جائیں گے اور اگر حال کا ذکر آئے گا تو ماضی اور مستقبل والے نکل جائیں گے اور اگر مستقبل کا فعل استعمال ہوگا تو ماضی اور حال والے نکل جائیں گے۔ لہٰذا مغضوب اور ضالین اس لیے فعل کی صورت میں رقم نہیں ہوئے کیونکہ اگر فعل آجاتا تو کوئی نہ کوئی زمانہ متعین ہو جاتا اور کسی ایک زمانے کے یا دونوں زمانوں کے مستوجب سزا لوگ بیان میں نہ آپاتے۔

لہٰذا خدا نے مذمت کے مقام پر صرف اسم استعمال کیا اور اسم دلیل ہے ثبات اور دوام کی! ''مغضوب علیہم کے راستہ سے بچانا''۔ اب وہ مغضوب علیہم پچھلے ہوں، حال کے ہوں، آئندہ کے ہوں، ''ضالین کے راستہ سے بچانا'' اب وہ ضالین زمانہ ماضی کے ہوں، حال کے ہوں، آئندہ کے ہوں۔ مگر نعمت مل چکی، جسے ملنا تھی۔ انعام تو ہو چکا، وہ تو ختم ہو گیا۔ جن کے نصیب میں یہ انعام تھا، انہوں نے پالیا۔

اب آیئے اس بیان پر کہ تین سو آیات شوہر زہراؑ کی شان میں قرآن نازل ہوئیں جس کے ایک حرف میں ستر ہزار معنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسالت مآبؐ نے فرمایا ہے، دونوں سنی اور شیعہ حضرات کے ہاں یہ حدیث موجود ہے کہ سرکارؐ نے فرمایا:

''لَوْ كَانَ الرِّيَاضُ اَقْلَامًا وَالْبُحُوْرُ مِدَادًا وَالْجِنُّ حُسَّابًا وَالْاِنْسُ كُتَّابًا مَا اَحْصٰى فَضَائِلُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ''۔

یعنی علیؑ کے فضائل کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اتنے فضائل تھے، تب ہی تو تین سو آیات اُنؑ کے فضائل میں آئیں، اور اس جامعیت کے ساتھ، کہ جب سوئے، سونے کی مدح (مَنْ یَّشْرِیْ) جاگے تو جاگنے کی مدح۔ گھر میں ہیں تو هَلْ اَتٰی آرہا ہے۔ میدان میں ہیں تو "لافتیٰ" آرہا ہے۔ مسجد میں ہیں تو "اِنَّمَا" آرہا ہے۔ کہیں سفر کی مدح اور کہیں حضر کی مدح۔ کہیں دن کی مدح اور کہیں رات کی مدح۔ کہیں صبح کی مدح اور کہیں شام کی مدح۔ کہیں نہ بولنے کی مدح اور کہیں بولنے کی مدح۔ کبھی سکون کی مدح اور کبھی حرکت کی مدح۔

اور مجھے کہنے دیجئے، میں یہ آیات پڑھ رہا ہوں اپنی زبان میں، کھڑے ہوتے ہیں تو اُس حالت کی مدح، بیٹھتے ہیں تو مدح اور کروٹیں بدل رہے ہیں تو کروٹیں بدلنے کی مدح۔

"يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ". (آلِ عمران: 191)

جو کچھ کرتے ہیں تو کرنے کی مدح ہے اور جب کچھ کہتے ہیں تو کہنے کی مدح ہے۔ قول بھی سراہا جارہا ہے اور فعل بھی سراہا جارہا ہے۔ گویا کہ قرآن مجید صاحبِ نظر ہے، ایسا کہ اُس کی نظر ہے اُن پر کہ اب کیا کہتے ہیں، وہ کہوں اور اب کیا کرتے ہیں، جو کریں، اُس کا تعارف کرواؤں۔ یہ کرتے جائیں، میں کہتا جاؤں۔ یہ کہتے جائیں، میں بیان کرتا جاؤں اور اُن کے قول آیتیں بنتی جائیں۔

کیا کہنا اُس معراج کا! اِن کے قول بلند ہوتے ہوئے کلام اللہ بن گئے۔ اُن کی باتیں معراج پر پہنچیں کہ اللہ کی باتیں قرار پائیں۔ جب یہ کہتے تھے تو وہ اِن کی

باتیں ہوتی تھیں اور جب ان باتوں کو اللہ انجائے قبول پر دیکھتا تھا تو اپنا کلام قرار دے کر نازل فرماتا تھا۔

شرح وبسط کا مقام نہیں ہے کہ میں بات کی وضاحت کرتا جاؤں۔ بہر حال مفسرین نے لکھا ہے کہ "إِنَّا لِلَّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" کا جملہ نہ قرآن میں تھا اور نہ حدیث میں تھا اور نہ مخلوقِ خدا کی زبان پر تھا۔ جب جعفر طیار علیہ السلام کی شہادت کی خبر حضرت علیؑ نے سنی تو امیرالمؤمنینؑ کی زبان پر یہ جملہ بے ساختہ وارد ہوا۔ بس اِدھر اُنہوں نے کہا، اُدھر آیت نازل ہوئی:

"وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ". (البقرہ: 155-156).

یہ قولِ علیؑ تھا مگر قبول ہونے کے بعد کلام اللہ بن گیا۔

بہر حال اُنؑ کے قول کو بھی قرآن جمع کرتا رہا اور اُنؑ کے عمل کو بھی قرآن جمع کرتا رہا۔ اُنؑ کی زندگی پر گویا قرآن کی نظر ہے کہ اُنؑ کی زندگی میں جو کچھ ہو، وہ میرے صفحۂ دل پر آجائے، وہ زینتِ کتاب بن جائے، وہ مذکورِ قرآن قرار پا جائے۔

تو جن کے لیل ونہار کو قرآن دیکھتا رہا اور تہیہ کیے رہا کہ جو کچھ بھی کہیں گے، میں کہے بغیر نہ رہوں گا۔ اُن کے اقوال وافعال کو جمع کرتا رہا تو اب بظاہر جس کتاب کا نام قرآن ہے، اُس کتاب کا جس میں اُنؑ کے سوانح زندگی کا بیان ہے، یہ اُنؑ کی سوانح عمری ہے جو جمع ہو گئی تو قرآن کی صورت میں نظر آنے لگی۔

یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ جس طرح آپ کا، میرا اور ہر ایک کا نامۂ اعمال لکھا جا رہا ہے، اسی طرح سے قرآن نام ہے محمدؐ وآلِ محمدؐ کے عمل کا۔ وہ اُن کا نامۂ عمل ہے۔

بڑا فرق ہے ہمارے نامہ عمل میں اور اُن کے نامہ عمل میں۔ کم سے کم فرق تو یہی ہے کہ میرا نامہ عمل آپ نہیں دیکھ سکتے، آپ کا نامہ عمل میں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کا نامہ عمل تو کیا، میں خود اپنا نامہ عمل نہیں دیکھ سکتا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ دُوسرے کے نامہ عمل کو دیکھوں۔

خداوند عالم لکھوا ضرور رہا ہے مگر چھپا رہا ہے اور نہ چھپاتا تو اُس کا نام ستار ہی کیوں ہوتا؟ اُس نے ہر نامہ عمل کو ہر نظر سے چھپا دیا اور واقعاً کہنا پڑتا ہے کہ اگر میرا نامہ عمل آپ کو دیکھنے کیلئے مل جاتا تو میری قدر و منزلت آپ کی نظروں میں رہتی؟ اگر نامہ اعمال دیکھے جاسکتے تو باپ کا وقار اولاد کی نظر میں رہتا؟ اُستاد کا وقار شاگردوں کی نظر میں رہتا؟ بوڑھوں کا وقار نوجوانوں کی نظر میں رہتا؟

اللہ تعالیٰ کا عظیم فضل ہے اور احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے ہمارے نامہ اعمال کو چھپا رکھا ہے۔ اگر ایک کا نامہ عمل دُوسرا دیکھنا بھی چاہے تو نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارے نامہ اعمال کو چھپاتا ہے اور ہم اس سے خوش ہیں۔ اچھا ہے کہ وہ چھپا ہوا ہے۔ خوش کیوں ہیں؟ اس لئے کہ اُس میں لغزشیں ہیں، کمزوریاں ہیں، عیوب ہیں، نقائص ہیں۔ اس لائق نہیں کہ اُسے طشت از بام کیا جائے۔ اس لائق نہیں کہ اُسے عوام کی نظر میں بے دھڑک رکھ دیا جائے۔ ہر نامہ قدرت کو قدرت نے لکھوایا مگر چھپایا۔ مگر محمدؐ و آلِ محمدؐ کا عمل جس کا نام ہے، قرآن اُسے کیوں چھپاتا؟

ہم سے یہ تقاضا ہے "فَاقْرَءُوْا"، "کیوں غفلت برت رہے ہو؟" اس کو پڑھو۔ قرآن پڑھنے کا اصرار ہو رہا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ بے عیب ذوات ہیں۔ اُن کے اعمال نامے میں عبادت ہی عبادت کا ذکر ہے۔ اور کیا کہنا اُن عبادت

گزاروں کا جن کی ایک ضربت عبادت ثقلین سے افضل ہو بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا کہنا اُن کی عبادت کا جو اپنے کمالِ عبادت کی بناء پر اُس درجہ عبادت پر ہیں کہ اُن کا دیکھ لینا عبادت ہے۔

علامہ جامیؔ جن کا ذکر ابتدائے بیان میں ہو چکا، فرماتے ہیں:

عبادت دیدن سہ شے بارشاد نبی آمد
یکے کعبہ، دوئم قرآن، سوئم روئے شہ والا

جس کے چہرہ پر نظر کر لینا عبادت ہو، تو وہ ذات خود کتنی عبادت گزار ہو گی!

پھر حضرات والا! یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ دیکھیں علیؑ کو اور عبادت خدا کی ہو۔ جس کو دیکھنا ہے، عبادت اُس کی نہیں ہے اور جس کی عبادت ہے، اُس کو دیکھنا نہیں ہے۔ خدا کا دیکھنا خدا کی عبادت تو کہلاتی ہی ہے مگر یہ کیا کہ دیکھے کعبہ کو اور عبادت خدا کی ہو۔ دیکھے علیؑ کو اور عبادت خدا کی ہو۔ قرآن کو دیکھنا، عبادت خدا کی ہو۔ بظاہر تو یہ بے ربط بات ہے مگر یہ بات ایک مرحلہ کو طے کر رہی ہے۔

ذرا سنیں! بات بے ربط نہیں بلکہ کمالِ ربط کے ساتھ ہے۔ آپ کو اس نظر میں کوئی قید لگانی پڑے گی۔ کس نظر سے دیکھنا عبادت ہے؟

کیوں جناب والا! ہر نظر سے دیکھنا عبادت ہے؟ کعبہ کو ڈھانے کی نظر سے دیکھے تو عبادت کب ہوئی؟ ابرہہ کا واقعہ یاد کیجئے۔ قرآن کو بہت سوں نے رد لکھنے کی نظر سے دیکھا۔ ایسا دیکھنا تو عبادت متصور نہیں ہو سکتا۔ مرحب حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آیا۔ اُس نے اُنؑ کے چہرے پر نظر کی، کیا یہ دیکھنا بھی عبادت ہو سکتا ہے؟ جی نہیں۔ یہاں سے طے کرنا پڑے گا کہ ہر نظر عبادت نہیں ہو سکتی اور واقعاً ہر نظر نے خود

بتایا کہ کس نظر سے دیکھنا ہے۔

اپنا سمجھ کے دیکھو تو عبادت نہ ہوگی۔ دُنیا کا سمجھ کے دیکھو گے تو عبادت نہ ہوگی۔ اگر یہ سمجھ کر خانہ کعبہ کو دیکھو گے کہ جہاں دُنیا میں اور گھر ہیں، یہ بھی ایک گھر ہے تو عبادت نہ ہوگی۔ ہاں! دیکھنا عبادت اُس وقت ہے جب یہ مان کر دیکھو کہ یہ بیت اللہ ہے۔ جب اللہ کی نسبت سے دیکھو گے، اللہ کا مان کر دیکھو گے تو پھر یقیناً اللہ کی عبادت ہوگی۔ کعبہ کو دیکھو تو بیت اللہ مان کر دیکھو۔ قرآن کو دیکھو تو کلام اللہ مان کر دیکھو اور بندہ پرور علیؑ کے چہرے کو دیکھو تو وجہ اللہ مان کر دیکھو یا ولی اللہ مان کر دیکھو۔

اس سلسلہ میں آپ کی توجہ درج ذیل آیتِ ولایت کی طرف دلاتا ہوں:

"اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ"۔ (المائدہ:55)

جو شانِ امیرالمومنینؑ میں نازل ہوئی۔ کیا کہنا اس عظیم الشان آیت کا۔ خداوند عالم ایک لفظ ایسا جمع کر رہا ہے جو خالق اور بہترین مخلوق سب پر منطبق ہو سکے۔ خدا کیلئے جو الفاظ ہیں، وہ نبی کیلئے نہیں ہیں اور جو نبیؐ کے لئے ہیں، وہ حضرت علیؑ کیلئے نہیں۔ رسول اللہؐ کے معنی میں نہ خدا آ سکتا ہے اور نہ علیؑ آ سکتے ہیں۔ وصی رسولؐ کے لفظ کو دیکھئے۔ اس میں علیؑ تو آ جاتے ہیں مگر رسولؐ اور خدا پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ نبی یا رسول کیلئے الگ ایک لفظ ہے اور اللہ کیلئے الگ لفظ ہے۔ بس جو لفظ جس کیلئے مخصوص ہے، اُسی پر منطبق ہو سکتا ہے۔

یہ الفاظ جدائی ثابت کرنے کیلئے ہیں، ملانے کیلئے نہیں۔ ہر ذات سے الگ ایک لفظ مخصوص ہے۔ نہ اُدھر استعمال ہو سکتا ہے اور نہ اِدھر۔ صرف مخصوص ذات ہی

کیلئے مختص ہے۔ قدرت نے چاہا کہ ایسی محفل جمالوں جس میں مجھے بھی اُسی لفظ سے یاد کیا جائے، رسولؐ کے لئے بھی وہی لفظ بولا جائے اور علیؑ کو بھی اُسی نام سے یاد کیا جا سکے۔ ہماری ذوات اور نام الگ الگ ہیں تو کوئی لفظ ایسا بھی تو ہو جو ہمیں ملا دے۔ انتخاب کی نظر جس لفظ پر پڑی، وہ لفظ "ولی" ہے اور ولی کہہ کر سب سے پہلے اُس نے اپنا نام لیا، پھر رسولؐ کو ولی کہا اور پھر حضرت علیؑ کے اوصاف بیان کر کے اُن کو ولی کا لقب عطا فرمایا۔

وہ کیا ہیں جو بحالتِ نماز، بوقتِ رکوع زکوٰۃ دیتے ہیں؟ وہ کون ہیں؟ ولی ہیں۔ رسول کیا ہے؟ ولی ہے۔ خود خدا کیا ہے؟ ولی ہے۔ تو لفظِ ولی میں اللہ تعالیٰ نے گنجائش دیکھی کہ اُس کیلئے استعمال ہو سکتا ہے۔ رسولؐ کے لئے بھی اور حضرت علیؑ کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ولی، وہ بھی ولی اور وہ بھی ولی۔

کتنا برمحل ہے میرا یہ جملہ کہ میں کسی کو ولی کہہ دوں۔ مگر عاقل غور کرے گا کہ کہنے والا خود بھی کچھ ہے۔ اُس کے پاس بھی کوئی سند ہے۔ جب کہنے والے ہی کے پاس کوئی سند نہیں اور بے سند نے کسی کو سند دی تو اُسے کیا سند ملی؟

ایک جاہل اگر کہہ دے کہ میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ عالم ہے۔ جب یہ مصدق ہے کہ تم جاہل ہو، ممکن ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، یہ بھی تمہاری ایک جہالت ہو۔ مگر عالم، عالم کی تصدیق کر سکتا ہے۔ بہادر وہ ہے جسے کوئی معروف بہادر کہہ دے کہ یہ بہادر ہے اور سخنور وہ ہے جسے سخنور کہہ دے کہ صاحبِ سخن ہے۔ ادیب وہ ہے جسے ادیب کہہ دے کہ ادیب ہے۔ فصیح وہ ہے جسے کوئی معتبر فصیح کہہ دے کہ فصیح ہے۔

اسی بناء پر مثل مشہور ہو گئی کہ "ولی را ولی می شناسد"۔ "ولی کو وہ پہچانے جو خود

ولی ہو"۔ میں کسی کو ولی کہہ دوں، میرا قول حجت نہیں رکھتا۔ ولی ہی کسی کو ولی کہے تو درست ہوگا۔

اب علیؑ کو ولی وہ کہہ رہا ہے جو اپنے کو بھی ولی کہہ رہا ہے اور جب وہ ولی ہے اور اُس سے بہتر کون ولی ہوگا! تو اگر ایک مستند ولی کسی اور کو ولی کہہ دے تو حقیقتاً وہ صحیح ولی ہوگا۔

یہاں مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ. بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا". (آیت:50)

"کیا تم لوگ شیاطین اور اُن کی ذریت کو اولیاء ماننا چاہتے ہو یا بنانا چاہتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دُشمن ہیں۔ ظالموں نے بدل بہت ہی برا بنایا ہے"۔

اول بدل جو کی ہے، بہت ہی بری کی ہے۔ اس کے بعد ایک جملہ آتا ہے:

"تم شیاطین کو ولی ماننا چاہتے ہو یا منزلت دینا چاہتے ہو؟ سنو!

"مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ. وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا". (آیت:51)

"میں نے ان کو دکھا کر زمین اور آسمان تو نہیں پیدا کئے۔ میں نے اُنہیں دکھا کر انہیں بھی نہیں پیدا کیا اور اُن گمراہ کنوں کو میں نے اپنا قوتِ بازو تو نہیں اختیار کیا"۔ وہ اولیاء نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ انہوں نے آسمانوں کو بنتے نہیں دیکھا، زمین بچھتے نہیں دیکھی، انسان پیدا ہوتے نہیں دیکھے۔

وہ اس لئے اولیاء نہیں ہو سکتے کہ ہم نے اُنہیں اپنا دست و بازو نہیں بنایا۔

نتیجہ کچھ نکلا؟ اس ''نہیں'' میں '' ہے'' موجود ہے کہ نہیں۔ اگر میں کہوں کہ آپ مجلس کیسے پڑھ سکتے ہیں جب آپ نے کبھی نہیں پڑھی؟ جب آپ اس کوچہ میں پھرے ہی نہیں۔ جب آپ نے یہ کام کبھی کیا ہی نہیں۔ جب آپ قابل نہیں، فاضل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجلس وہ پڑھے گا جو مجلس پڑھتا رہتا ہو، جو قابلیت رکھتا ہو۔

اس ''نہیں'' ''میں'' ''ہے'' موجود ہے۔ وہ اس لئے ولی نہیں کہ اُنھوں نے آسمان اور زمین بنتے نہیں دیکھے۔ اس کے معنی صاف یہ ہیں کہ ولی وہ ہیں جنھوں نے آسمانوں کو بنتے دیکھا ہے، زمین کو بچھتے دیکھا ہے، انسان کو پیدا ہوتے دیکھا ہے اور خداوند عالم کا یہ جملہ کہ ''میں نے اُنہیں اپنا قوتِ بازو نہیں بنایا'' شیاطین کے منفی صفات کے ذکر نے اُن کی ولایت کے استحقاق کو رد کر دیا۔ یہ جملہ صاف بتا رہا ہے کہ کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جنھیں قدرت نے دست و بازو قرار دیا ہے۔ وہ ید اللہ نہیں تو پھر کیا ہیں؟ اُن کو ید اللہ نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے؟

اب ولایت کی یہ شرطیں اور علامتیں ایسی عنقائے روزگار ہیں کہ نہ کوئی آسمان بنتے دیکھے گا، نہ کوئی ولی بننے کا مستحق ہو سکے گا، نہ کوئی زمین بچھتے دیکھے گا کہ ولی اللہ بن سکے اور نہ کوئی نوع کے اعتبار سے انسان پیدا ہوتے دیکھے گا کہ ولی اللہ کے لقب کا سزاوار بن سکے۔

زمین بچھتے وہ دیکھے جو زمین سے پہلے موجود ہو۔ آسمان بنتے وہ دیکھے گا جو آسمانوں سے پہلے موجود ہو۔ نوعِ انسانی کی تخلیق کو وہ دیکھے جو نوعِ انسانی سے پہلے ہو۔ لہٰذا پہلے ہو تو ولی ہو۔ خدا نے اپنے کلام میں اپنا قوتِ بازو فرمایا ہے، قوتِ بازو بنایا ہے اور قرآن نے ''یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ'' اُس کی شان میں فرمایا ہو تو ولی ہے۔

یہ شرائط پائی جاتی ہوں تو ولی ہے اور ان شرائط کے بغیر دُنیا چاہے تو جسے چاہے ولی مان لے۔ یہ دُنیا والوں کا ماننا ہے مگر اللہ تعالیٰ تو اُن کو مذکورہ شرائط کے ساتھ مانتا ہے۔ نہ پائی گئیں تو "اِنَّمَا" کا حصار کھینچ لیا۔ "اِنَّمَا" کے معنی ہیں "اور کوئی نہیں" سوائے اللہ کے، اس کے رسول اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے والوں کے۔

اللہ تو وہ ہے ہی جس نے آسمان پیدا ہوتے کیا دیکھے، اُسی نے پیدا کئے۔ زمین بچھتے کیا دیکھی، زمین کو پیدا کیا۔ اب رسول اور نماز میں زکوٰۃ دینے والوں کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ اُن کی اس نور سے خلقت ہے جو نورِ اوّل مخلوق ہے۔ آسمان نہ تھے اور وہ نور تھا، زمین نہ تھی اور وہ نور تھا اور "انا و علیٌ من نورٍ واحد" اسی بناء پر انحصار کر رہا ہے۔

اسعد بن ابراہیم ہمارے برادرانِ ملت کے ایک زبردست عالم گزرے ہیں۔ اپنی کتاب "اوّلین" میں جابر بن عبداللہ انصاری سے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مسجدِ نبوی میں موجود تھے۔ کوئی پیغمبرؐ سے بات پوچھ رہا تھا، کوئی مشغولِ نماز تھا، کوئی وضو کر رہا تھا کہ اس اثناء میں یکا یک ایک آدمی مسجد میں پہنچا۔

اُس میں اُس آدمی کا جو نقشہ کھینچا ہے "رسس الثیاب کانما خرج من التراب"۔ "اس کے بدن پر لباس کے پرزے تھے گویا کہ ابھی اتنا پھٹا ہوا ہونے کے باوجود میلا تھا جیسے ابھی مٹی میں سے نکل کر آیا ہے"۔ اس کے بعد یہ الفاظ درج کرتے ہیں:

پراگندگی اور پریشانی اُس کے چہرے سے عیاں تھی۔ نبیؐ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور نظم میں اپنا مدعا بیان کرنے لگا کہ سرکارؐ والا! میں اس حالت میں حاضر

ہوا ہوں جبکہ میری بچی فاقے کی تکلیف سے بیقرار ہو کر رو رہی تھی اور بچے کی ماں اپنے شیر خوار بچے سے بے خبر تھی یعنی اُسے اپنے بچے کے حال کی خبر نہ تھی، اس لئے کہ وہ بھی فاقے سے ہے اور ماں بھی۔

"اَتَيْتُكُمْ وَالْعَذْرَاءُ تُبْكِيْ بِرِقَّةٍ. وَقَدْ ذَهَلَتْ اُمُّ صَبِيٍّ عَنِ الطِّفْلِيْ وَاُخْتٌ وَاُمٌّ كَبِيْرَةٍ. لَقَدْ كِدْتُ مِنْ فَقْرِيْ وَزَالَتْ فِيْ عَقْلِيْ".

"مگر نبوت کا یہ عالم ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ میری عقل ضائع نہ ہو جائے"۔

"لَقَدْ مَسَّنِيْ عُرْيٌ وَفَقْرٌ وَفَاقَةٌ وَلَيْسَ لَنَا مَالٌ يُمِرُّ وَلَا يُحْلِيْ وَمَلْ مُنْتَهِيْ اِلَّا اِلَيْكَ مَفَرُّنَا وَلَيْسَ الْفِرَارُ اِلَّا اِلَى الرُّسُلِيْ".

سرکارؐ والا! برہنگی نے، فقیری نے اور فاقوں نے مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ یہ تین دشمن ہیں جو مجھے گھیرے ہوئے ہیں اور قسم لیجئے کہ از قسم مال اگرچہ وہ حقیر سے حقیر ہی کیوں نہ ہو، میرے پاس نہیں ہے۔

اے مولاؐ! پناہ کی کوئی جگہ آپؐ کے سوا نہیں ہے اور انسان بھاگ کر سوائے پیغمبرؐ کی بارگاہ کے کہاں جا سکتا ہے؟

یہ چار اشعار اُس نے پیغمبرؐ کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھے۔ پیغمبرؐ نے جب یہ بیانِ منظوم سنا، شدت سے رونے لگے۔ کسی کا انتقال نہ ہوا تھا جسے رو رہے ہیں۔ لِ مصیبت سنا اور شدت سے رونے لگے۔ درد کا سنا اور اُس کے سننے سے آپ کا دل دردمند ہوا۔ دل میں درد پیدا ہوا اور اشک جاری ہوئے۔ روئے اور اُس کے بعد

"اور فرمایا:

"ہے کوئی جو اس کی حاجت کو روا کرے اور اس کے دکھ درد کو زائل کرے؟

اے لوگو! خداوند عالم سعادتِ عظمیٰ گھیر کر اس مسجد میں لے آیا ہے۔ ہے کوئی سعادت حاصل کرنے والا؟ خدا نے اس وقت میری اس مسجد کے صحن میں حسنات کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہے کوئی اس انبار کا اُٹھانے والا؟"

اب راوی بیان کرتا ہے کہ جس وقت یہ الفاظ پیغمبرؐ خدا کی زبان پر آئے تو اُس وقت:

"عَلِیٌّ یُصَلِّیْ فِیْ نَاحِیَةِ الْمَسْجِدِ".

"مسجد کے ایک گوشہ میں حضرت علیؑ نماز پڑھ رہے تھے"۔

اور عین اُس وقت آپؑ رکوع میں تھے۔ آپؑ نے اپنی انگشتِ خورد سے سائل کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آپؑ کے اشارے کو سمجھا اور آگے بڑھ کر آپؑ کی انگشت سے انگشتری اُتار لی اور دامنِ سوال کو اپنے گوہر مراد سے بھر کرلے چلا۔

اِدھر آپؑ نے انگشتری دی، اُدھر فوراً آیتِ ولایت، جس کو سرنامہ کلام بنایا گیا ہے، حضرت علیؑ کی انگشتری سائل کو دینے پر نازل ہوئی۔

راوی کہتا ہے کہ حضورؐ کے اس انگشتری کے دینے کے بعد چار سو افراد نے اس سائل کو اپنی اپنی انگشتری دی مگر وہ لینے والا یہی کہہ رہا تھا:

"ھذامن برکات علیؑ ابن ابی طالبؑ".

"یہ چار سو انگشتریاں جو حضرت علیؑ کی ایک انگشتری کے بعد ملی ہیں، یہ بھی امیرالمومنینؑ کی برکات سے ہیں"۔

بہرحال دینے والوں نے انگشتریاں دیں۔ مگر وہ بات تو ختم ہو چکی کیونکہ

آیت تو اُس وقت اُتر چکی تھی جبکہ حضرت علی علیہ السلام نے انگشتری دی تھی۔ بعد میں چار سو انگشتریوں کے دیے جانے پر کوئی آیت نہیں اُتری۔ وہ تو آیت کے اُترنے سے پہلے دی گئی انگشتری کا حصہ تھا۔ جس وقت سائل نے حضور اکرمؐ سے اپنے فقر و فاقہ کا ذکر کرتے ہوئے برہنگی، بے لباسی، نہوت اور فاقہ کی شکایت کی، اُس وقت وہ اپنے بچوں کو مسجد میں لایا تو نہ تھا۔ ان بچوں پر پیغمبرؐ خدا کی نظر نہیں تھی۔ حال سنا، دل درد مند رکھتے تھے، سیدؐ عالم تھے بلکہ قلبِ عالم تھے۔ اتنے بے چین ہو گئے کہ رونے لگے اور حاضرین سے خطاب فرماتے ہوئے اُس کی معاونت پر متوجہ کیا۔

مگر وہ اُن فاقوں کو جانتے تھے جو حضرت امام حسینؑ، ان کے بچوں اور حسینؑ کے لشکر کے مجاہدوں پر گزرنے والے تھے۔ اچھا فاقے سہی، مگر یہ آنے والا شخص نہیں کہہ سکا کہ میرے بچے بے آب ہیں، بے دانہ وغذا ہیں۔ یہ الگ بات ہے مگر اُسے یہ شکایت تو نہ تھی کہ بچے بے آب ہیں، پیاس سے بیتاب ہیں۔ دودھ پیتے بچے دم توڑ رہے ہیں۔

اللہ اللہ، اے کربلا والو! ہماری جانیں تمہارے مصائب پر قربان ہوں۔ حضور اکرمؐ تو جانتے ہوں گے کہ یہ تمام مصائب بلکہ ان سے کہیں زیادہ میرے بچے جھیلیں گے۔ وہ چھوٹے چھوٹے تین دن کے پیاسے بھی ہوں گے۔ اُن میں سے ایک جھولے میں تڑپ رہا ہوگا۔ خیامِ آلِ نبیؐ، خیامِ حرم سے بڑی مستورات کی تو نہیں مگر بچوں کی العطش، العطش کی آوازیں بلند ہوں گی۔ انصار اِن آوازوں کو سن کر چیخیں مار کر روتے ہوں گے اور رو رو کر کہتے ہوں گے: "یا اللہ! ہم زندہ ہیں اور نبی زادیاں پیاسی ہیں اور اطفالِ حرم پیاسے ہیں اور ہم زندہ ہیں اور سن رہے ہیں!!"

کیسی پیاس ہوگی، تشنگی کی کیسی شدت ہوگی!!

حضرات! مجھے ایک وقت یاد آتا ہے اور آپ حضرات بھی اس کو بھول نہیں سکتے۔ تصور شرط ہے۔ آپ کے امامِ تشنہ کام پر یومِ عاشور ایک وقت آ گیا کہ:

نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسمؑ نہ علی اکبرؑ نہ عباسؑ

سارا باغ لٹ گیا۔ بھرا ہوا گھر تھا جو خالی ہو گیا۔ اٹھارہ جنازے ایک دن میں ایک گھر سے نکلے۔ اب امام حسینؑ اکیلے ہیں۔ وعدے کو وفا کرنا ہے۔ اپنے سر کی قربانی کو پیش کرنا ہے۔ امام حسینؑ نے آخرت کے سفر کیلئے کمر باندھ لی اور کمر باندھنے کے بعد خیمے کے دروازے پر آئے اور فرمایا:

"یَازَیْنَبُ وَیَااُمِّ کُلْثُوْمُ وَیَارُقَیَه وَیَارَبَابُ عَلَیْکُنَّ مِنِّی السَّلَامُ".

یعنی "میرا آخری سلام ہو"۔

وداعی سلام کی آواز امامؑ نے بلند کی، بہنیں درِ خیمہ پر آ گئیں اور شکوہ کر رہی ہیں کہ بھائی آپ نے کس دل سے یہ وداعی سلام کیا ہے؟ آپ نے سوچا بھی ہے کہ بہنوں کے دل پر کیا گزر جائے گی؟

جناب اُمِ کلثومؑ نے آگے بڑھ کر بھائی کا دامن تھام لیا اور عرض کیا:

"آپ شریعت کو جانتے ہیں، زمانہ کے امامؑ ہیں، شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب پردیس کو جاؤ تو اپنے بچوں کیلئے کسی سے سفارش کر کے جاؤ۔ اب آپ بتائیے کہ آپ اس سفر پر جا رہے ہیں جس سے واپسی نہیں ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے ہمیں کس

کے سپرد کیا؟"

امامؑ کا سر جھک گیا اور خدا جانے کس عالم میں آپؑ نے فرمایا:

"اے میری بہن! کس کا نام لوں؟ کون میرا رہ گیا ہے جس کا نام لے سکوں؟ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں:

"اَسْتَوْدِعُکُنَّ اللّٰہ"۔

"میں تمہیں اللہ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں"۔

جب یہ باتیں ہو چکیں تو فرمایا: "بہن زینبؑ! میری مدد کا وقت ہے"۔

اس مخدرہ نے فرمایا کہ میں کس لائق ہوں کہ مدد کروں؟ فرمایا کہ بڑی مہم درپیش ہے۔ مجھے اپنے بیمار سے رُخصت ہونا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔

جنابِ زینبؑ چلیں اور آگے بڑھ کر جنابِ علی عابدؑ کا شانہ ہلایا۔ بیمارؑ نے آنکھ کھولی۔ باپؑ کے چہرہ کو دیکھا، بیٹھنے کی ہمت کی مگر بیٹھا نہ گیا۔ عرض کیا:

"پھوپھی اماں! میرا حال دیکھ رہی ہیں؟ مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا۔ فرزندِ رسولؐ آئیں اور میں تعظیم نہ بجا لاؤں؟ ذرا مجھے بٹھا تو دیجئے"۔

پھوپھی نے بھتیجے کو بٹھایا تو فرمایا کہ میری پشت پر بیٹھئے اور اپنے سہارے سے مجھے بٹھایئے۔

جنابِ سجادؑ کی پشت پر جنابِ زینبؑ بیٹھ گئیں اور بیمارؑ کو اپنے سہارے سے بٹھایا۔ باپؑ نے بیٹے سے پوچھا:

"فرزند! کیسا مزاج ہے؟"

بیمارِ کربلا نے کہا: "الحمد للہ، بابا! آپؑ بتایئے کہ آج آپؑ اور آپؑ کے

دشمنوں میں کیا ٹھہری؟"
اب جنابِ زینبؑ نے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا کہ وہ اب کیا جواب دیتے ہیں۔ امامؑ نے ارشاد فرمایا:
"سجادؑ! کیا پوچھتے ہو؟ شیطان اُن پر مسلط ہے۔ ہدایت کا کوئی کلمہ اُن پر اثر نہ کرسکا۔ اے بیٹا! شہداء کے خون سے کربلا کی زمین سرخ ہے اور اب میں تم سے رخصتِ آخر کیلئے آیا ہوں"۔
دن بھر کی داستان امامؑ نے دو جملوں میں ختم کردی۔ جب بیمارؑ کے کانوں میں یہ جملہ سنائی دیا کہ "اب میں تم سے رخصتِ آخر کیلئے آیا ہوں" تو انہوں نے متحیر ہو کر کہا:

"این این عمی ابوالفضل العباسؑ"

یعنی یہ آپؑ رخصتِ آخر کیلئے کیوں آئے؟ میرے چچا ابوالفضل العباسؑ کہاں ہیں؟
امام حسینؑ نے فرمایا: "بیٹا! وہ دریا کی ترائی میں پڑے ہیں۔ شانے قلم ہو چکے ہیں، شہید ہو چکے ہیں"۔
اس پر حضرت علی عابدؑ نے ایک ایک کو پوچھنا شروع کیا۔
بابا! حبیب ابن مظاہر کہاں ہیں؟ مسلم ابن عوسجہ کہاں ہیں؟ زہیر ابن قین کہاں ہیں؟ جب ساری فہرست ختم ہوگئی تو آخر میں پوچھتے ہیں:

"اَیْنَ اَیْنَ اَخِیْ عَلِیُّ الْاَکْبَرْ"۔

"بابا! کوئی نہیں رہا تو یہ بتایئے کہ میرا بھائی، ہم شکل پیغمبر علی اکبرؑ کہاں ہے؟"

غالباً امامؑ سے لفظ "قُتِلَ" کہا نہ جا سکا۔ جواب میں ارشاد فرمایا:

"بیٹا! یہ سمجھ لو کہ مردوں میں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہے"۔

یہ سننا تھا کہ بیمارؑ نے کہا: "پھوپھی اماں! میری تلوار لا کر دیجئے، میرا عصا لا کر دیجئے"۔

امامؑ نے پوچھا: "بیٹا! تلوار اور عصا کو کیا کرو گے؟"

عرض کرتے ہیں: "بابا! عصا پر تکیہ کرتے ہوئے چلوں گا اور تلوار سے جہاد کروں گا۔ میں بھی اپنی جان آپ پر نثار کروں گا"۔

امامؑ نے فرمایا: "بیٹا! اگر تم بھی شہید ہو گئے:

"مَنِ الرَّادُّ حَرَمِیْ اِلٰی قَبْرِ جَدِّیْ رَسُوْلَ اللّٰہِ"۔

"قبر رسولؐ کا مجاور کون ہو گا اور میرے حرم کو اور نبی زادیوں کو نبیؐ کے روضے تک کون پہنچائے گا؟ بتاؤ کہ اس کنبہ کا وارث کون ہو گا؟"

بیمار کربلا نے حسرت سے کہا: "بابا! یہی میرا مقسوم ہے کہ آپ ذبح ہوں اور میں خیمہ کے اندر پڑا رہوں؟"

امامؑ نے فرمایا: "بیٹا! تم میری بہترین اولاد ہو۔ میرے بعد زمانہ کے امامؑ ہو۔ تمہاری مشکلات مجھ سے زیادہ ہیں۔ تمہارے صبر کا مقام بہت بلند ہے"۔

یہ کہہ کر آپ نے وصیتیں شروع کر دیں۔ ذرا میرا جملہ سنئے، فرمانے لگے:

"بیٹا! قید ہو گے تو صبر کرنا، طوق پہنایا جائے گا تو پہن لینا، بیڑیاں پیروں میں ڈالی جائیں گی تو پہن لینا۔ اے بیٹا! قید ظلم سے کبھی نہ کبھی چھوٹ جاؤ گے۔ جب چھوٹ کر مدینے جانا ہو اور میرے دوست مجھے پوچھیں تو اُن کو میرا سلام کہہ دینا اور کہنا

کہ جب آبِ خوشگوار پینا تو کربلا کے پیاسوں کو یاد کر لیا کرنا اور کہہ دینا کہ کاش ہم عاشورے کے دن ہوتے اور سب کے سب ہوتے اور مجھے ایک نظر دیکھ لیتے۔ اس وقت ایک نظر دیکھ لیتے جب میرے ہاتھوں پر میرا شیر خوار تھا۔ جب میں اصغرؑ ناتواں کیلئے پانی کے ایک گھونٹ کا سوال کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھتے، ایک نظر ڈالتے:

"كَيْفَ اَسْتَسْقِيْ لِطِفْلِيْ فَاَبَوْا اَنْ يَّرْحَمُوْنِيْ".

"دیکھتے کہ میں کس کس طرح سے سوالِ آب کرتا رہ گیا اور کتنی بے رحمی سے جواب دیا گیا"۔

❁❁❁

تیسری مجلس

Excellent

سورہ لقمان

- "کان" آیت کے الفاظ سے آشنا ہیں، "دل" ان حضرات سے آشنا ہیں۔
- انکا کا حصار، جیسے حائل حصار کھینچتے ہیں، کہ غیر داخل نہ ہوسکے۔
-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا". (الاحزاب:33)

"بے شک اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے اہل بیتؑ! وہ تم سے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک رکھے جس طرح پاک رکھنے کا حق ہے"۔

حضراتِ والا! جس آیت کو میں نے عنوانِ کلام قرار دیا ہے، آیہ تطہیر کے نام سے موسوم ہے اور مشہور ہے۔ کان بڑی حد تک اس آیت سے شناسا ہیں۔ صرف اُس آیت ہی سے آشنا نہیں بلکہ اُس کے مفہوم سے بھی آگاہ ہیں اور اگر کان آیت کے الفاظ سے آشنا ہیں تو دل اُن حضرات سے آشنا ہیں جن کے بارے میں یہ آیت ہے۔

بہر حال جو اہتمام ذکر اور بیان کا اس آیت میں کیا گیا ہے، وہ تمام آیات سے انوکھا اور نرالا ہے۔ سب سے پہلے اہتمامِ خاص اس آیت میں یہ ہے کہ "اِنَّمَا" سے اس آیت کا آغاز ہوا ہے۔ "اِنَّمَا" عربی میں حرفِ حصر کہلاتا ہے۔ میں اس کو سمجھانے کیلئے بطور مثال یہاں عرض کروں گا کہ بعض حضرات کسی مشکل کی آسانی کیلئے، کسی دشواری کے دفع کرنے کیلئے چلہ کھینچتے ہیں یعنی چالیس روز ایک عمل کرتے ہیں اور مخصوص پڑھائی کرتے ہیں۔ عامل عمل شروع کرنے سے پہلے جو کام کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک حصار کھینچتا ہے تا کہ یہ دشوار گزار عمل شیاطین کے دخل سے محفوظ رہے۔ وہ حصار کھینچتا ہے۔ حصر اور حصار ایک ہی چیز ہے۔

لہٰذا جس طرح ہم عامل کی حیثیت سے حصار پہلے کھینچتے ہیں، خداوند عالم

تطہیر کے عمل کیلئے "اِنَّمَا" کا حصار کھینچتا ہے۔ یہ حصار قدرت کی جانب سے ہے۔ یہاں اگر عامل کے حصار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو ذات قادرِ عمل بن سکیں، وہ مجھ تک حصار کے اندر نہ پہنچ سکیں۔

اسی طرح لفظ "اِنَّمَا" سے قدرت کا مقصد یہ ہے کہ اس انتہائی پاکیزگی کے مستحقین کے علاوہ اور کسی کا گزر آیت کے میدان میں نہ ہو سکے۔

تو غرض یہ کہ جو پہلا کام اس آیت کے سلسلہ میں ہے، وہ لفظ "اِنَّمَا" کا استعمال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے اس لفظ کو ان حضرات کیلئے دوسرے مقامات پر بھی فرمایا ہے۔ یہ آیت تو آیۂ تطہیر ہے اور ذکرِ طہارت سے آراستہ ہے۔ اسی قرآن میں ایک آیت آیۂ ولایت بھی ہے۔ اس آیت کا کام یہ ہے کہ وہ ولایت کے مرکز معین کر دے اور بتا دے کہ منصب ولایت کے منصب دار کون کون ہیں؟ یہ منصب خدا کی نظر میں کچھ اتنا بلند ہے کہ خداوند عالم نے اس منصب بلند کے ذکر سے پہلے اپنے آپ کو بھی الگ نہیں رکھنا چاہا اور ذکرِ ولایت کرتے وقت بھی قدرت نے وہی لفظ حصر "اِنَّمَا" آیت کے شروع میں رکھ دیا ہے:

"اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ".

"تمہارا ولی ہے بس اللہ اور اس کا رسولؐ"۔

اب "اِنَّمَا" کے ترجمہ میں "بس" کہہ دیجئے تو بس ہے یعنی کافی ہے۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ اگر ترجمہ کیجئے جو عام فہم اور ہر ذہن میں بیٹھ جانے والا ہو تو صاف لفظ یہ ہے کہ اور کوئی نہیں، تمہارا ولی ہے اللہ اور اس کا رسولؐ۔ مگر یہ ولایت ہے۔ اگر رسالت ہوتی تو رسولؐ کے بعد کوئی نام آ ہی نہیں سکتا تھا اور یہ کہہ دینا بھی

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر رسالت ہوتی تو اس کے بعد کسی اور کا نام نہیں آ سکتا تھا اور رسولؐ سے قبل اللہ کا نام نہیں آ سکتا تھا۔ مگر یہ ہے ولایت!

رسولؐ سے پہلے قدرت نے اپنا نام لیا اور رسولؐ کے ذکر کے بعد ذکر کے لائق کسی کو سمجھا تو فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ آمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ"۔

بہر حال مجھے اس آیت کی طرف مستقل طور پر نہیں جانا ہے۔ صرف میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ "اِنَّمَا" کے حصار کو قدرت نے ضروری سمجھا۔ اسی طرح ذکر طہارت کے مقام پر یعنی طہارتِ کاملہ کے مقام پر بھی خداوند عالم نے اُسی حرف "اِنَّمَا" کو صدرِ آیتِ تطہیر بنایا۔

ہر ابتداء کو انتہا سے ربط ہوا کرتا ہے اور ہر انتہا کو ابتداء سے ربط ہوا کرتا ہے۔ تو اگر آیت کا آغاز مخصوص ہے "اِنَّمَا" حرفِ حصر کی وجہ سے تو آیت کا انجام یعنی آیت کا آخری لفظی اہتمام تو اتنا مخصوص ہے کہ اس خصوصیت کے مقام پر اور تو اور نبی نہیں آ سکتے بلکہ میں یہ کہنے میں بھی بالکل حق بجانب ہوں گا کہ خدا کی کوئی کتاب نہیں آ سکتی، خدا کا کوئی گھر نہیں آ سکتا۔ تو شاید آپ حضرات نے محسوس فرمایا ہو کہ بہت بڑھ کر کہہ رہا ہے۔ مگر حضرات والا! ہمارا سب کا ایمان ہے کہ جتنے انبیاء ہیں، سب پاک و پاکیزہ ہیں بلکہ اگر حق پوچھیے تو انبیائے کرام کی حقیقی پاکیزگیوں کے علمبردار ہم ہیں۔

علمائے متقدمین اور متاخرین نے ہر عہد میں اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے کہ انبیاء سے گناہِ کبیرہ تو الگ، گناہِ صغیرہ کا بھی ارتکاب نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی کافی

مضمونِ عصمت نہیں ہے بلکہ نہ اُن سے جان کر گناہ ہو سکتا ہے اور نہ اُن سے بھول کر گناہ ہو سکتا ہے۔ نہ اُن کا ماضی گناہ میں گزر سکتا ہے اور نہ گناہ سے اُن کا مستقبل آلودہ ہو سکتا ہے اور گناہ تو گناہ ہمارا تو مسلک خیال یہ ہے کہ نبی گناہ کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔

میرے سامنے بحمد للہ صاحب ذوق مجمع ہے۔ میں بر سبیل تذکرہ ایک بات کہہ کر آگے بڑھوں۔ ماموں رشید، صاحبانِ نظر خوب جانتے ہوں گے کہ یہ اپنے عہد کا وہ ذکی اور طباع عالم تھا کہ جب یہ کسی موضوع پر بولتا تھا تو بڑے بولنے والے گنگ رہ جاتے تھے۔ اس کے بارے میں واقعات ہیں۔ اُن کی توضیح کا وقت نہیں ہے۔

یہ اپنے عہد کا باذوق عالم تھا اور میں نے باذوق کے الفاظ پر جان بوجھ کر زور دیا ہے۔ سب کچھ جانتا ہو اور ذوق نہ ہو تو میرے نزدیک کچھ نہیں۔ ہر فن میں علم کے صاحبِ ذوق کی ضرورت ہے۔ یہ باذوق عالم تھا اور اپنے زمانہ کا بہترین عالم تھا۔ جس طرح سے کوئی زمانہ اہلِ علم سے خالی نہیں رہتا، اسی طرح ہمارا ایمان اس بات پر ہے کہ کوئی زمانہ امامِ زمانہ سے خالی نہیں رہتا۔

یہ اپنے عہد کا بہترین عالم تھا۔ اس عہد کا کوئی امام بھی تھا اور آپ حضرات نے نام بھی بار بار سنا ہوگا۔ امام علی رضا علیہ السلام جن کے علم کے چشمے آج تک مشہور ہیں۔ ماموں بھی سمجھتا تھا کہ ہمارا علم اکتسابی ہے مگر آئمہ اہل بیتؑ کے علم کا مصدر بالکل دوسرا ہے۔ انہیں وہاں سے ملتا ہے اور ہمیں یہاں سے ملتا ہے۔

حضرات! بڑا فرق ہے انبیاء اور اوصیاء کے علم میں اور اہل عالم کے علم میں۔ ہم وہ ہیں جو پیدا ہونے کے بعد اور محنتیں کرنے کے بعد عالم ہوتے ہیں اور جیسے عالم ہوتے ہیں، وہ ہم بخوبی جانتے ہیں۔ یہاں آ کر عالم ہونا اور بات ہے اور خدا کی

طرف سے علم لے کر پیدا ہونا اور بات ہے، مثلاً جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس ضرورت کے تحت گویا ہوئے کہ آپ کی گویائی دلیل عصمتِ مادر بن جائے تو اُس گویائی نے اور آپ کے اُن الفاظ نے جو سورۂ مریم کی آیات 30 تا 32 میں مذکور ہیں، نبوت کی حقیقت بیان کر کے رکھ دی۔ ملاحظہ فرمائیں:

"قَالَ اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ".

"قَالَ" تو قولِ خدا ہے، آپ کا جملہ تو یہاں سے شروع ہوتا ہے: "اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ"؛ "یقیناً میں بندۂ خدا ہوں"۔

شاید دُنیا والوں نے، اُس وقت کے کلام کے سننے والوں نے یہ خیال کیا ہو کہ یہ الفاظ تو اس نوزائیدہ نے بے ضرورت بولے۔ اُس وقت کے اختلاف تھا ان کے بندۂ خدا ہونے سے؟ جب کسی کو اختلاف نہیں تھا تو پھر آپ کا کہنا اور زور دے کر کہنا کہ میں یقیناً بندۂ خدا ہوں، بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے محل بات ہے، بے ضرورت بات ہے۔

مگر اللہ! بچے کی نظرِ اوّل یہ دیکھ رہی تھی کہ تمہیں تو علم بھی نہیں ہے اپنے اندر پیدا ہونے والے اختلاف کا، میں پیدا ہوتے ہوتے جان رہا ہوں کہ ایک وقت آ رہا ہے کہ تم مجھے بندۂ خدا نہیں کہو گے، تم مجھے ابن اللہ کہو گے۔ وہ تو تمہارا مستقبل ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرا دعویٰ تمہارے مستقبل کے اعتبار سے ماضی بن جائے۔ تم تو کہنے والے ہو کسی زمانے میں مگر میں آتے ہی سنا دوں اور تمہارے آنے والے دعوے کی آج ہی تردید کر دوں کہ یقیناً میں بندۂ خدا ہوں۔

اب لفظ "عبداللہ" کا آپؑ کی زبان سے شدت سے جاری ہونا بتا رہا ہے کہ

مستقبل کے ابن اللہ کے دعوے کی آج تردید ہوگئی، لہٰذا اُسی وقت ہوئی تا جبکہ علم ہے:

"قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰىنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا".

اگر حضرت عیسیٰؑ یہ فرماتے:

"سَیُؤتِیَ الۡکِتٰبَ وَیَجۡعَلُنِیۡ نَبِیًّا".

خدا مجھے کتاب دے گا، خدا مجھے نبی قرار دے گا۔ مستقبل کا صیغہ، مضارع کا صیغہ، اگر یہ آپؑ کے کلام میں آتا تو بالکل بجا تھا۔ لوگ سمجھ جاتے۔ کتاب تو ملنے والی ہی تھی، نبوت بھی ملنے والی تھی۔ اگر آپؑ گہوارے میں یہ خبر دیتے کہ خدا مجھے کتاب دے گا اور خدا مجھے نبی بنائے گا تو بالکل ایک صحیح بات تھی یعنی ہمارے ذہنوں کے اعتبار سے چونکہ کتاب بھی ملنے والی تھی اور نبوت بھی ملنے والی تھی۔ مگر یہ نہیں کہا کہ مجھے نبوت دے گا، مجھے کتاب دے گا۔

میرے خیال میں تو عربی کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ اٰتٰنی کا یُؤتِینی مضارع ہے۔ جَعَلَ کا یَجۡعَلُ مضارع ہے۔ "اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ"۔ خدا مجھے کتاب دے چکا اور خدا مجھے نبی بنا چکا، قرار دے چکا، جہاں بھی میں رہوں۔

اب یہ عجیب جملہ ہے جو ہر زبان پر تو نہیں آتا کہ "جہاں بھی رہوں"۔ گویا کہ آج گہوارے میں کلام کرنے والے کے وسیع علم کا پتہ چل رہا ہے کہ مجھے کبھی زمین پر رہنا ہے اور کبھی آسمان کی بلندیوں پر رہنا ہے۔ یہاں رہوں تو مبارک اور وہاں رہوں تو مبارک۔

"اَیۡنَ مَا کُنۡتُ".

"میں جہاں کہیں بھی رہوں"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپؑ کے ذہن میں ہے کہ مجھے کہیں کہیں الگ الگ رہنا ہے۔ کبھی کہیں رہوں گا اور کبھی کہیں رہوں گا۔ مگر میں جہاں کہیں ہوں گا، میری شان میں اختلاف نہ ہوگا۔ میں یہاں ہوں گا تو مبارک اور وہاں ہوں گا تو مبارک ہوں گا اور وہاں کے بعد یہاں ہوں تو مبارک ہوں گا۔ بہر حال جہاں بھی رہوں۔

اب یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ خدا مجھے مبارک قرار دے چکا ہے۔

"اَلسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا".

اور سلامتی ہے میرے لئے، یعنی میرے ایمان کیلئے، میرے عمل کیلئے، میرے کردار کیلئے، میرے نام ونشان کیلئے۔ میری ولادت کا دن بھی مبارک ہے، میری موت کا دن اور بروز حشر، جس دن میں دوبارہ زندہ اُٹھایا جاؤں گا۔

حضراتِ والا! میرے خیال میں آپ بھولے نہ ہوں گے ابھی، یہ جو آپؑ گہوارے میں بولے ہیں، یہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کے بڑھتے ہوئے اضطراب پر خداوند عالم کا خاص اہتمام تھا۔ سب خاکہ آپ کے ذہن میں ہوگا۔ جب آپؑ پیدا ہوئے تو ماں کی زبان پر لفظ آئے ہیں جن کو قرآن نے دہرایا ہے:

"یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا".

کاش! میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری موت کو اتنا زمانہ ہو چکا ہوتا کہ میرا کوئی جاننے والا نہ ہوتا۔ دُنیا مجھے بھول چکی ہوتی (مگر یہ وقت مجھے نہ دیکھنا پڑتا کہ میرے شکم سے ایک بچے کی ولادت ہوئی)۔

خداوند عالم نے دھڑکتے ہوئے دل کو تسکین دی ہے اور اُس کی رحمت، جیسا کہ اس امر میں شامل حال تھی، ویسے ہی آپ کے اضطراب میں بھی شامل حال تھی اور

ارشادِ الٰہی ہوا کہ "مریم رنجیدہ مت ہو، "قَرِّیْ عَیْنًا" اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھو۔ اس کے بعد بڑا اچھا لفظ استعمال ہوا۔ یہ قرۃ العین تمہیں دیا گیا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک تو تمہیں عطا کی گئی ہے۔ تم آنکھوں کو ٹھنڈا رکھو۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ دل تنگ نہ ہو، رنجیدہ نہ ہو، محزون نہ ہو لیکن ہاں! اگر تم کسی انسان کو دیکھو، اور یہ لفظ آگے محذوف ہیں "اور وہ بشر تم پر معترض ہو" کیونکہ یہ تو طے ہے کہ جب بشر کو دیکھو گی اور وہ تمہاری گود میں بچہ دیکھے گا تو ضرور زبانِ اعتراض کشادہ کرے گا تو اُس موقعہ پر (یعنی اعتراض کے وقوع پر) یہ کہہ دینا:

"اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا".

"میں نے خدا کے واسطے روزہ کی نذر کی تھی تو میں آج کسی سے بات نہیں کر سکتی۔ اس نوزائیدہ کی طرف اشارہ کر دینا، بس پھر یہ آپ جانے"۔ (مریم:260)

چنانچہ حکم ہو چکا اور حکم کے بعد جب لوگ اُس طرف سے گزرے تو کہا:

"مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا کَانَتْ اُمُّکِ بَغِیًّا. لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا".

"یہ تم نے کیا کیا؟ تمہارا باپ تو نیک تھا، تمہاری ماں تو پاکدامن تھی"۔

دیکھئے! اِن کی زبانوں سے اِن کے ماں باپ اور رشتہ داروں کی مدح و ثنا ہو رہی ہے۔

تمہارے باپ میں کوئی برائی نہیں تھی اور تمہاری ماں پاکدامن نہ ہو، ایسی تو نہ تھی۔ مگر تم نے ماں باپ کی سب عزت و آبرو کھو دی۔

"فَاَشَارَتْ اِلَیْہِ".

"آپ نے اشارہ کر دیا اپنے بچے کی طرف"۔

میرے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اشارہ کیوں کیا؟ عیسیٰ سے کیا کہلوانا ہے؟ عیسیٰ کس ضرورت کے تحت بولنے والے ہیں؟ مسئلہ جس ضرورت سے متعلق ہے، وہ ضرورت کیا ہے؟

نہ تو ابھی نبوت کا کوئی سوال تھا اور نہ کوئی ابھی ابن اللہ کی ہی بحث تھی۔ نہ یہاں کسی انجیل کا مسئلہ تھا، نہ کسی کتاب کے نزول کا مسئلہ تھا۔ یہاں تو صرف ایک مسئلہ تھا کہ جس کے شوہر نہیں اور اگر اُس نے گناہ کا ارتکاب نہیں کیا تو پھر اُس کے بچہ کیسے پیدا ہوا؟ کلام کی یہی ضرورت تھی۔

مگر آپ شاید میرے اس یاد دلانے کے بعد حیران ہوں گے کہ عیسیٰ جس ضرورت کے تحت گویا ہوئے تو ہوئے مگر اپنے بارے میں سب کچھ کہا۔ جس مسئلہ کے متعلق ضرورت تھی، اُس کیلئے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یا تو میرے دیکھنے کا نقص ہے کہ میری نظر کسی ایسے لفظ تک نہیں پہنچ سکی۔ میں تو یہی دیکھ رہا ہوں:

"اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ. اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا. وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا. وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا". (مریم:30-32)

یہی لفظ تھے۔ ماں کے متعلق اور اُس ضرورت کے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہیں آیا۔ تو سرکارؑ بولے بھی تو پھر کہاں بولے؟

لطف کی بات ہے کہ آپؑ نے اُس مسئلہ خاص کے متعلق اگرچہ ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر بنی اسرائیل کی جو زبانِ طعن تھی، وہ بند ہوگئی۔ اب یہ جو ہمیں اشکال محسوس ہو رہا ہے کہ جس ضرورت کے تحت آپؑ کو بولنا تھا، اُس ضرورت کو پورا نہیں کیا۔ یہ

اشکال ہمیں اس لئے محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے ایک نبی کے بعد ایک نبی نہیں آتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ نقشہ ہمارے ذہن میں باقی نہیں رہا ہے کہ نبی کے ماں باپ کیسے ہوا کرتے ہیں۔ بس ایک تو ہمیں ایک نبی ملا جس کا کلمہ پڑھنا ہے اور پڑھ رہے ہیں اور اُن کو بھی زمانہ گزر گیا۔ وہ صدہا برس کے بعد نبی ہوئے تھے ورنہ صدیوں کا زمانہ خالی تھا۔

گویا ہم اپنی اس قوم کو اس عہد سے اُٹھا کر عہدِ رسولؐ تک بھی لے جائیں اور ہم یہ سمجھ لیں کہ ہم عہدِ رسولؐ کے لوگ ہیں، تب بھی ہمارے لئے یہ صورت ہے اور ہماری یہ حیثیت ہے کہ ہمارے زمانہ میں نبی ہوئے ہی نہ تھے۔ اس لئے ہم اس ماحول سے واقف ہی نہ تھے۔ مگر بنی اسرائیل میں رات دن نبی ہوا کرتے تھے، ہوتے تھے (انبیاءِ بنی اسرائیل اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے مشہور ہیں)۔ اُن کے انبیاء رات دن ہو رہے تھے اور ایک کے بعد ایک آتا رہتا تھا اور ایک عہد میں کتنے ہی ہو رہے تھے۔

چونکہ اُن کے انبیاء عہد میں ہوتے رہتے تھے، اس لئے وہ جانتے تھے کہ نبی کے آباء و اجداد کافر تو کافر، گناہِ کبیرہ کے بھی مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اب جب اُن کے علم میں ایک بات موجود تھی کہ نبی کی ماں ایسی نہیں ہو سکتی، نبی کا باپ ایسا نہیں ہو سکتا، دادا ایسا نہیں ہو سکتا تو مثل مشہور ہے:

"كَلِّمِ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ".

"جن لوگوں سے بات کرو، اُن کی عقلوں کے مطابق کرو"۔

لہٰذا اگر واقعی عیسیٰؑ ہماری قوم میں بات کرتے تو کہنا پڑتا کہ میری ماں پاکدامن ہے اور مجھ کو خدا نے اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کیا ہے۔ ہم سے

کہتے تو کہنا پڑتا کیونکہ ہم تو کافر تک تجویز کر رہے تھے مگر انبیائے بنی اسرائیل صدہا ہوئے۔ رات دن ہوتے رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس پیٹ سے نبی پیدا ہوتا ہے، وہ ماں کیسی ہوتی ہے اور وہ اصلاب کیسے ہوتے ہیں! اس لئے آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کہ میری ماں پاکدامن ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہو گیا کہ مجھے اللہ نے نبی قرار دیا ہے، نبی کی حیثیت سے بھیجا ہے اور جب میں نبی ہوں تو میری ماں نبی کی ماں ہے اور وہ جانتے تھے کہ نبی کی ماں کیسی ہوتی ہے۔

غرضیکہ حضرات! میں یہ کہہ رہا تھا کہ جتنے انبیاء ہیں، سب پاک ہیں، پاکیزہ ہیں اور انبیاء کا تو مقام ہی بہرحال بلندترین ہے۔ ملائکہ بھی پاک ہیں، پاکیزہ ہیں۔ خدا کی کتاب بھی پاکیزہ ہے۔ خدا کے خاص بندوں کے جو گھر اور مقامات عبادت گاہ رہے، پاکیزہ تھے۔ اس لئے اہل بیت کا پاکیزہ ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ پاکیزہ افراد تو اللہ کے بندے پیدا ہوتے رہے۔ انبیاء پاک و پاکیزہ، اولیاء پاک و پاکیزہ، ملائکہ پاک و پاکیزہ۔ خدا کے وہ گھر جو قبلہ قرار دیئے جاتے رہے، وہ سب پاک و پاکیزہ۔ یہ بھی پاک و پاکیزہ۔ لہٰذا پاکیزگی محض اہل بیت کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔

اب یہاں مجھے ایک لفظ کہنا ہے کہ لفظِ تطہیر، لفظِ طہارت جس کے معنی پاک اور پاکیزہ ہیں، یہ الفاظ قرآن میں بہت سی جگہوں پر بہت سے افراد کیلئے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ جنت کی حور کیلئے الفاظ ہیں:

"لَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ"۔

"اہل جنت کیلئے ازواج ہوں گی"۔

"مُطَهَّرَةٌ"، یہ لفظ تطہیر سے بنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو پاکیزہ فرمایا ہے،

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق یہ اعلان ہوا ہے اور اسماعیلؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ"۔

"اور ہم نے عہد لے لیا تھا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ سے کہ میرے گھر کو پاک رکھنا"۔

میں یہ ترجمہ نہیں کرنا چاہتا کہ حضرات ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے عہد لے لیا تھا کہ "میرے گھر کو تم پاک کرو"، پاک وہی چیز کی جاتی ہے جو پاک نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے ہاتھوں خانہ کعبہ بنا، پورا گھر، اگر وہ بھی پاک نہیں ہے تو جب بناتے بناتے پاک نہیں کر سکے تو پھر بعد میں کیا پاک کریں گے اور وہ کیا پاک رہے گا؟

میرے خیال میں تو اگر مسلمانوں کو معمار کی حیثیت دے دی جائے تو مسجد بناتے وقت وہ بھی ہر ایک اینٹ پر خیال رکھیں گے کہ یہ خانۂ خدا بن رہا ہے۔ جو فرشتے اللہ کے گھر کی بنیاد رکھیں گے، نجس پانی سے بچیں گے۔ اپنے ہاتھوں کو نجاست سے بچائیں گے۔

کسی اور کا گھر نہیں بن رہا، اللہ کا گھر بن رہا ہے۔ لہٰذا معمولی سا لااُبالی انسان جب اللہ کے نام پر، اللہ کے گھر کے نام کی وجہ سے طہارت کا اہتمام رکھے گا تو اگر یہ کام علماء کے سپرد کر دیا جائے اور متقین کے سپرد کر دیا جائے، ذمہ دار لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو وہ مسجد کیسی پاکیزگی سے بنے گی! ہر اینٹ کا رکھنے والا ایک عالم ہے، ایک ثقہ ہے، ایک متقی ہے، ایک پرہیزگار ہے جو آئین وصفاتِ طہارت سے اچھی طرح واقف ہے تو وہ طہارت کا اہتمام کتنا کرے گا!

تو پھر علماء کا کیا ذکر کروں؟ اگر خلیل اللہ جیسا معمار ہو، ذبیح اللہ سا معمار ہو،

انبیائے ذی العزم معمار ہوں تو انہوں نے بنایا تو کعبہ نجس بن گیا اور پھر اس کا الزام کس پر رہا؟ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ پر۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان سے ہٹ کر اُدھر خدا پر کیونکہ اُس نے انہیں معمار بنایا تھا۔

جب ان کے ہاتھوں سے نجس بن سکتا ہے تو پھر ان کے ہاتھوں کی تخصیص کیا رہی؟ پھر اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ نبی ہی بنائیں؟ عالم بھرا پڑا تھا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ نے شاید نظر فرمائی ہو کہ اُس وقت کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیمؑ سن رسیدہ ہیں اور جناب اسماعیلؑ کم سن ہیں۔ کم سنی میں بھی مشقت تکلیف دہ ہوتی ہے اور کبیر سنی میں بھی۔

ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اللہ کا گھر بنا رہے ہیں۔ ہماری نگاہ جہاں تک کام کرتی ہے اور جہاں تک کام کرسکتی ہے، ہمیں اس پر وثوق ہے۔ تیسرا کوئی فرد بیت اللہ کی تعمیر میں ان کا شریک بنایا ہی نہیں گیا۔ کوئی مزدور رکھ لیتے، کوئی اور معمار رکھ لیتے۔ مگر ایسا تو آپ نے بھی نہیں سنا ہوگا اور قرآن نے بھی نہیں کہا۔ قرآن کہہ رہا ہے:

"اِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ".

دونوں نام لئے۔ اگر تیسرا ہوتا تو اُس کا بھی ذکر ہونا چاہئے تھا۔ مگر ایک کے بعد دُوسرے کا نام آنا یہ بتلا رہا ہے کہ کلام والا اس طرف توجہ رکھتا ہے کہ جتنے کام کرنے والے ہیں، وہ ذکر میں آجائیں۔ تیسرا ہاتھ شامل نہیں کیا گیا، اس لئے کہ جیسا یہ گھر ہے، ویسے ہی اس کے بنانے والے ہوں۔ نااہل لوگ گھر کے کام میں شریک ہی نہ ہوں۔

لہٰذا جس طرح آغاز میں دو نے مل کر گھر بنایا، اسی طرح دو نے مل کر اس گھر

کا کام بنایا۔ یہ تعمیر ظاہر تھی کہ اس کی تعمیر میں ابراہیمؑ واسماعیلؑ دو تھے اور ایک وقت اس گھر کی باطنی تعمیر کا آیا ہے کیونکہ بتوں کا یہ گہوارہ تھا اور یہ گھر بتوں سے بھر دیا گیا تھا۔ اب ان بتوں سے اس گھر کو پاک کرنا تھا تا کہ اطمینان سے سجدہ گزار سجدہ کر سکیں اور اعتکاف کرنے والے اعتکاف کر سکیں۔

وہی ابتداء انتہا بن رہی ہے کہ اگر وہاں ابتداء میں دو تھے تو یہاں انتہا میں بھی دو ہوں۔

''یا علی! تم میرے کاندھے پر سوار ہو جاؤ اور ان بتوں کو توڑ دو''۔

حضرات! نہ تو مزید لوگوں کو شریک کرنے میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں کمی ہو سکتی تھی اور نہ ہمارے رسولؐ کے زمانہ میں۔ کعبہ میں اُس زمانہ میں بت شکنی ہوئی ہے کہ جب عروجِ اسلام کا زمانہ تھا اور ہزار ہا حلقہ بگوشِ اسلام موجود تھے۔ آپ کا ایک ادنیٰ سا حکم اِن بتوں کو توڑ دینے، ہٹا دینے اور پھینک دینے کیلئے کافی تھا۔ مگر خدا نے جیسے وہاں چاہا کہ معصوم ہی ہاتھ ہوں، ایسے ہی خدا نے یہی پسند کیا کہ یہاں بھی وہ ہاتھ کارفرما ہوں کہ جن ہاتھوں سے کبھی گناہ کا امکان ہی نہ ہو۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو خانۂ خدا کے پاک رکھنے کا حکم دیتے وقت لفظ ''طَھِّرَا'' استعمال کیا تو کیا کہنا پروردگار تیری عدالت کا اور کام کرنے والوں کی طاقت پر نظر رکھنے کا، پاک رکھنا، مگر یہ نہیں فرمایا کہ ایسا پاک رکھنا جتنا کہ پاک رکھنے کا حق ہے، اس لئے کہ پاک رکھنے کا جو حق ہے، اُس کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کیسے پورا کر سکتے تھے! یہ اُن کا حق تو نہیں تھا۔

اسے اصطلاح میں تکلیف مالایطاق کہتے ہیں، کسی پر ایسی ذمہ داری ڈال

دینا جس سے عہدہ برآ ہونے کی اُس میں طاقت نہ ہو۔ بس اتنا کہا کہ تم پاک رکھنا، یہ نہیں کہا کہ اتنا پاک رکھنا جتنا پاک رکھنے کا حق ہے۔

جنابِ مریمؑ کے متعلق اسی قرآن مجید میں آیت:

"اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ"

موجود ہے۔ مریم! اللہ نے تمہیں برگزیدہ قرار دیا ہے۔ اللہ نے تمہاری تطہیر کی ہے، تمہیں پاکیزہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد نہیں فرمایا کہ اتنا پاکیزہ قرار دیا ہے جتنا کہ پاک رکھنے کا حق ہے۔

میں اس پر آپ کی نظر ڈلوانا چاہتا ہوں کہ لفظ آتا ہے مگر اکیلا رہ جاتا ہے، دہرا نہیں ہو پاتا۔ "طَھَّرَکِ" اللہ نے تمہیں پاکیزہ قرار دیا ہے۔ جنابِ عیسیٰؑ کے متعلق، جو نبی ہیں، جو لفظ استعمال ہوا، یہ ہے: "مُطَھِّرُکَ" اللہ ہے تمہارا پاک رکھنے والا۔ مگر یہ نہیں کہا کہ ایسا پاک رکھنے والا جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

جنت میں ازواج ہوں گی "مُطَھَّرَۃ"، جو پاکیزہ قرار دی گئی ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ اتنی پاکیزہ جو پاکیزہ قرار دیئے جانے کا حق ہے۔

حد یہ ہوگئی کہ قرآن مجید کے اندر "فِیْھَا صُحُفٌ مُّطَھَّرَۃ" صحیفوں کو پاک قرار دیا گیا ہے مگر یہ نہیں کہا کہ ایسے پاکیزہ جو پاک رکھنے کا حق ہے۔ اگر ایسا کہا جاتا کہ ایسے پاکیزہ قرار دیئے گئے ہیں جیسے پاکیزہ قرار دیئے جانے کا حق ہے تو پھر آپ میں طاقت نہ ہوتی کہ آپ قرآن کے اوّل کو آخر کہہ سکیں یا اُس کی زبر کو زیر کر سکیں اور آپ نہ اغلاط کے مرتکب ہو سکتے تھے اور نہ ترتیبِ قرآن بدل سکتے تھے۔ کہاں طاقت تھی؟ مگر وہ جانتا تھا کہ میں نے تو پاکیزہ قرار دیا ہے، اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔

اب یہ تمہاری امانت ہے۔

لہٰذا میرے کہنے کا منشاء صرف یہ تھا کہ انبیاء کیلئے، قبلہ کیلئے، حوروں کیلئے، مریم کیلئے، بہت سوں کیلئے قرآن نے لفظ تطہیر استعمال کیا ہے مگر ہر جگہ یہ لفظ اکیلا رہا ہے۔ کہیں بھی "تطہیرا" کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ کہیں نہیں کہا کہ اس کو ایسا پاک قرار دیا ہے جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔

مگر اللہ اللہ! وہ لفظ جو ابتدائے افرینش عالم سے اکیلا رہتا رہا ہے، آج خداوند عالم نے ایک چادر میں ایسی برگزیدہ ہستیوں کو دیکھا ہے جن کیلئے وہ بچے ہوئے لفظ کو بچانا نہیں چاہتا۔ وہ بتانا یہ چاہتا ہے کہ جو لفظ میں نے ہر محفل سے بچایا تھا اور اُٹھا کر رکھتا رہا تھا، وہ انہی کا تو حصہ تھا، یہی تو اس کے حقدار تھے۔ اس لئے بچایا کہ اب تک کوئی اس اکہرے لفظ کا حقدار نہیں تھا۔

بالفاظ دیگر اس انتہائی پاکیزگی کا کوئی حقدار نہیں تھا۔ اس معراج طہارت کا اگر حقدار کوئی ہوتا تو ہم پہنچا کر رہتے مگر جب حقدار نہیں ملا تو نہیں دیا گیا۔ اب حقدار ملا اور موجود ہے تو کس کیلئے اُٹھا کر رکھیں!

آپ ذرا نظر میں زور کلام کو لائیے کہ خداوند کریم یوں ارشاد فرمائے:

"وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا".

خدا چاہتا ہے اور چاہتا رہے گا کہ تم کو حدث سے دُور رکھے اور تمہیں پاک رکھے، ایسا کہ جو پاک رکھنے کا حق ہے۔

میں اپنے قارئین سے کہا کرتا ہوں کہ حضرات والا! زور کلام خدا کو ملاحظہ فرمائیں۔ کلام کی طاقت اور قدرت تو اپنی جگہ رہی، اگر یہ بولنے والے، وعظ کہنے

والے، مثلاً مجلس ہی کے پڑھنے والے، صدہا مجالس جنھوں نے پڑھی ہوں، ہزاروں مجالس جنھوں نے پڑھی ہوں، اگر کسی دن منبر پر بیٹھ کر کہہ دیں کہ سرکار والا! آج میں ایسی مجلس پڑھوں گا کہ جو مجلس پڑھنے کا حق ہے۔ تو ہر شخص سنتے ہی سمجھ جائے گا کہ مجالس تو اس نے ہزاروں پڑھی ہیں، اس سے پہلے بھی یہ بات نہیں کہی۔ آج اس کے منہ سے یہ بات نکلی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنی بھی طاقت اس میں گویائی کی ہے، بہتر سے بہتر بیان کرنے کی جو بھی طاقت ہے، اس موضوع کے بارے میں جتنے بھی ہنر ہیں، یہ اُٹھا نہیں رکھے گا۔ حالانکہ انسان کیا اور اس کی طاقت کیا!!

مجھے اگر کہنے کا موقعہ ہے تو کیوں نہ کہوں کہ خداوند عالم نے بہت سوں کو کہا: تجھے پاک کیا، تجھے پاک کیا، اُسے پاک کیا، انھیں پاک کیا۔ مگر کہیں نہ کہا کہ ایسا پاک کیا جو پاک کرنے کا حق ہے۔ آج یہ کوئی نئی بات ہے۔ آج خدا کا یہ نیا لب و لہجہ ہے۔ آج زبانِ بے زبانیٔ قدرت پر وہ بات ہے جو آج سے پہلے نہیں آئی تھی۔

چاہتا ہوں اور چاہتا رہوں گا کہ تمہیں اتنا پاک رکھوں جتنا پاک رکھنے کا حق ہے۔ کہاں کہا تھا اس سے پہلے؟! اگر کوئی آیت ہو، کوئی دوسرا کلام ہو تو مجھے دکھاؤ۔ کہیں نہیں کہا۔ یہ زورِ کلام تو کہیں نہیں ملتا۔ یہ زورِ کلام کو کہہ رہے ہیں۔ اگر میں کہہ دوں تو آپ کو شاید یقین نہ آئے۔

کعبہ کی تطہیر کا وعدہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے لیا کہ تم پاک رکھنا۔ وہ نبی اور رسول سہی، ذبیح اللہ سہی، خدا تو نہیں ہیں۔ معصوم سہی مگر فانی ہیں، متغیر ہیں۔ سو جانے والے بھی ہیں۔ کعبہ کے پاس ہیں تو دور بھی ہو سکتے ہیں۔ کعبہ سے متصل ہیں تو جدا بھی ہو سکتے ہیں۔ ذمہ داری کسی کی کسی چیز کے متعلق اسی وقت تک ہو سکتی ہے جب

تک وہ جاگ رہا ہو، جب تک وہ زندہ ہو۔ اگر وہ خود ہی نہیں تو ذمہ دار کون رہے گا؟ جب وہ اُس شے کے قریب ہو۔ دُور ہے، بلادِ بعیدہ میں ہے تو ذمہ داری کون لے گا؟ جب وہ اُس شے کے قریب نہ ہو، دُور ہو۔

معنی یہ ہیں کہ تطہیر بیت کا اہتمام خدا نے "ممکن" ہاتھوں میں دیا ہے۔ "ممکن" کے معنی تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ خدا واجب ہے اور خدا کے سوا باقی سب "ممکن" ہیں۔ ممکن اُس کو کہتے ہیں جس کا ہونا بھی ممکن ہو اور نہ ہونا بھی ممکن ہو۔ نبی بھی اُس میں ہے، ولی بھی اُس میں ہے، گنہگار بھی اُسی میں ہے، خس و خاشاک بھی اُسی میں ہے۔ خدا کے سوا کوئی واجب نہیں ہے۔ واجب صرف اُس کی ذات ہے اور اُس کے سوا جو ہے، وہ ممکن ہے۔

لہٰذا اللہ نے تطہیریات کا کام ممکن ہاتھوں میں دیا ہے جس کے معنی یہی نکلے کہ طاہر رہنا بھی ممکن ہے، طاہر نہ ہونا بھی ممکن۔ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ کب تک ذمہ دار ہیں؟ جب تک خود ہیں اور اس کے بعد ذمہ داری ختم ہوگئی۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر اکبر الفاظ بھی آیہ تطہیر میں ہوتا، یوں کہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک رکھے۔ تو پہلا فرق تو یہ ہوگیا کہ کعبہ کے پاک رکھنے والے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور وہ اُن کا پاک رکھنے والا۔ کعبہ کا مطہر فانی، اُن کا مطہر باقی۔ کعبہ کا مطہر حادث، اِن کا مطہر قدیم اور ایسا قدیم کہ:

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ"۔

اونگھتا نہیں، سوتا نہیں، غافل نہیں ہوتا۔ کہیں دُور نہیں جاتا، نہ اُس کیلئے بیماری ہے کہ میں کیا کرتا، بیماری کے سبب یہ کام نہ کرسکا۔ نہ اُس کو قید ہے، نہ موت

ہے۔ لہٰذا اگرچہ مجھے موزوں لفظ نہیں مل رہا مگر میں ضرور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کعبہ اس عہد نامہ کی بناء پر پاک رہے گا جب تک ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ رہیں گے۔ اس عہد نامہ کی بناء پر کعبہ کب تک پاک رہے گا؟ جب تک ابراہیمؑ واسماعیلؑ رہیں گے۔

اہل بیتؑ کب تک پاک رہیں گے؟ تو میں یہ لفظ تو نہیں کہنا چاہتا کہ جب تک خدا رہے گا بلکہ گر کر، بالکل پست ہو کر، اتنا تو کہہ دوں کہ اہل بیتؑ اس وقت تک پاک رہیں گے جب تک خود رہیں گے۔ جب تک ہیں، پاک ہیں۔

اکہرا لفظ بھی ہوتا تو بیت اور اہل بیت کی پاکیزگی میں فرقِ بیّن قرار پاجاتا کیونکہ بیت کی پاکیزگی وہ ہے جو حضرات ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے ہاتھ میں ہے اور اہل بیتؑ کی پاکیزگی وہ ہے جو خدا کے ہاتھوں میں ہے۔

یہاں پر دوہرا لفظ "ایسا پاک رکھوں گا جیسا کہ پاک رکھنے کا حق ہے"۔ میں آپ کے سامنے جو مثال دے چکا ہوں کہ ایسا بیان کروں گا جو بیان کرنے کا حق ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی طاقت بچا کر نہیں رکھوں گا۔ جتنے طریقے، جتنے ہنر ہیں، جتنے نکات میرے بس میں ہیں، میں کوئی چیز اُٹھا کر نہیں رکھوں گا۔

تو اے اہل بیتؑ! تم کو ایسا پاک رکھے گا جو پاک رکھنے کا حق ہے۔ اس کے معنی کم سے کم یہی تو ہوئے کہ اللہ تعالیٰ سے ایک ممکن کا جتنا پاک رکھنا ممکن ہے اور ایک واجب سے ایک ممکن کا جتنا پاک رکھنا ممکن ہے، اُتنا پاک رکھوں گا۔ اب پاک رکھنے کی اپنی کوئی طاقت کسی اور کیلئے بچا کر نہیں رکھوں گا۔

حضرات والا! جبھی تو ان حضراتؑ کی یہ شان قرار پاگئی کہ ایک پاکیزگی سے دوسری پاکیزگی، جو ہر پاکیزگی سے مشتق ہے، وہ آخری زمانہ کا امامؑ ہے۔ وہ اتنا

پاکیزہ ہے کہ جب عیسیٰ، جن کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ رَافِعُکَ وَمُطَھِّرُکَ"

"اللہ تمہیں اُٹھالے گا اور پاک رکھے گا"۔

اور جب وہ آخری پاکیزگی کے مشتق پاس پہنچیں گے تو اپنا مصلیٰ امامِ زمانہ کے پیچھے بچھائیں گے کیونکہ یہ تطہیر وہ ہے جس پر طہارت ختم ہے۔

حقیقتاً اسی ارادۂ قدرت کا یہ زور ہے کہ دشمن عیب نہیں لگا سکا۔ حضرات! اس میں تو شک نہیں ہے کہ جتنی دشمنی ان سے ہوئی ہے، عالم میں کسی سے نہیں ہوئی اور جیسی سیراب زمین اُن کے خونوں سے ہوئی، اتنی کسی کے خون سے نہیں سیراب کی گئی۔ یہ جناب زینب سلام اللہ علیہا کا جملہ ہے۔ حضرت زینبؑ کے منہ سے نکلا ہے، جس وقت جنابِ زینبؑ نے دیکھا کہ ابن زیاد نے جنابِ زین العابدینؑ کے قتل کا حکم دے دیا اور واقعاً وقت بھی کچھ ایسا نازک آگیا تھا کہ یہ شقی اور نجس جنابِ زینبؑ سے گفتگو کر رہا تھا اور ہر گفتگو کا انداز بے ادبی، بے عزتی کیونکہ جنابِ زینبؑ اُس کے سامنے قیدی کی حیثیت سے کھڑی تھیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے کچھ دیر تو صبر کیا۔ اور صبر ختم ہے سید سجادؑ پر۔ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جتنے صابر اس گھرانے میں یہ ہوئے ہیں یعنی جتنا صبر کا اظہار اس امامؑ سے ہوا ہے، ایسے صبر کا ظہور کسی سے نہیں ہوا۔ علیؑ ہوں، فاطمہؑ ہوں، حسنؑ ہوں یا حسینؑ ہوں، جیسے صبر کا ظہور سید سجادؑ سے ہوا ہے، اور کسی سے نہیں ہوا۔

ہاں! بڑا صبر کیا مظلوم کربلا نے، بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اپنا جوان بھی

دیا اور اپنا شیر خوار بھی دیا یعنی بھائی بھی دیا اور بچے بھی دیئے۔ مگر سید سجادؑ کی منزل اس سے آگے ہے۔ جب کسی شخص نے بیقراری سے روتا دیکھا ہے سید سجادؑ کو، ظاہر ہے کہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی کو بیقراری کے عالم میں دیکھتا ہے تو دیکھنے والا بھی بیقرار ہو جاتا ہے۔ ایک ماں اگر اپنے غم میں رو رہی ہے اور آپ کے کان میں اُس کی آواز پہنچتی ہے تو آپ گھبرا اُٹھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُس کو تسلی دیں، دلاسہ دیں، کسی طرح اُس کے ہجومِ غم میں کمی پیدا کریں۔

تو بیمارِ کربلا اس بیقراری سے رو رہے تھے کہ دیکھنے والا بڑا بیقرار ہو گیا اور اُس نے بیقرار ہو کر کوشش کی کہ وہ اس جوشِ غم میں کسی قدر کمی کا سبب بن سکے۔

اب یہ ہے کہ وہ ماموم ہے اور رونے والا امام ہے۔ اگر کوئی معمولی سا فرد ہی ہوتا تو سب کچھ کہا جا سکتا تھا۔ اُس نے بڑے ادب سے کہا: آپؑ سے زیادہ صابر کون ہو سکتا ہے؟ مولاؑ! صبر کیجئے۔ فرزندِ رسولؑ! صبر کیجئے۔ امامؑ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی اور پسند نہ فرمائی۔ آپؑ نے شاکی ہو کر فرمایا:

''بھائی! تو نے صبر کیلئے اور نہ رونے کیلئے تو کہا مگر ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا''۔

خدا جانے کیسے تڑپ اُٹھے ہیں امامؑ! فرمایا:

''تم نے ہمارے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ یوسفؑ کے بچھڑ جانے پر یعقوبؑ اتنا روئے کہ نابینا ہو گئے۔ بھائی! تو نے میرے گھرانے کو نہیں دیکھا کہ میرے گھر سے دوپہر میں اٹھارہ جنازے نکلے اور جنازے بھی کیسے نکلے:

''لَا مِثْلَ وَلَا نَظِیْر''۔

"جس کا عالم میں کوئی مثل یا نظیر نہیں ہے"۔

اب میں جتنا بھی روؤں، کم ہے"۔

اُس نے کہا: "مولاؑ! خدا کی راہ میں قربانیوں کا پیش کرنا تو آپؑ کے گھرانے کا شعار ہے اور خدا کی راہ میں اپنی جانوں کا دینا تو آپؑ کے بزرگوں سے (حضرت ابراہیمؑ سے خامس آلِ عبا تک) ہوتا آیا ہے"۔

جب امامؑ نے یہ سنا تو میرا دل کہتا ہے کہ چیخیں مار مار کر روئے ہوں گے اور عجب بیقراری سے یہ جملہ زبان پر جاری کیا ہوگا:

"ہاں بھائی! سچ ہے، خدا کی راہ میں جانوں کا دینا تو میرے بزرگوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ مگر کیوں بھائی! کیا ماں بہنوں کا بے پردہ ہونا، اسیر ہونا، کیا گھرانے کی عورتوں کا قید ہو کر در بدر اور شہر بہ شہر پھرایا جانا بھی کبھی میرے خاندان کے بزرگوں میں ہوا ہے؟

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ''۔(سورہ محمد:7)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا''۔

خوشا نصیب اِس زمین کا کہ آج اس کے صحن میں اُن کی مجالس ہوتی ہیں جن کی مجالس کبھی عرش پر قائم ہوئیں۔ کبھی بلندیٔ افلاک پر یہ مجالس منعقد ہوئیں۔ یہ مجالس کبھی زیرِ چادر سجیں، کبھی مباہلہ کے میدان میں سجیں اور آیاتِ قرآن میں تو یہ مجالس سجتی ہی رہیں۔ کیا کہنا اُن چیدہ بزرگ ہستیوں کا جن کی ثناء و توصیف زبانِ بے زبانیٔ قدرت پر آتی رہی۔

خداوند عالم جن کی مدح و ثناء جا بجا کرتا رہا اور یہ اہتمام اُس کی نظر میں قائم رہا کہ میری جو کتاب زمین پر پہنچے، وہ ان کی کتابِ مدح قرار پا کر پہنچے۔ توراۃ آئی تو انؑ کی مدح و ثناء کرتی ہوئی آئی۔ انجیل کا نزول ہوا تو ثنائے آلِ محمدؐ لئے ہوئے، زبور آئی تو ذکرِ اہلِ بیتؑ لے کر آئی اور قرآن کے بارے میں یہ کہنا امرِ حق کہنا ہے کہ قرآن کی تخمیر ہی انؑ کے ذکر سے ہوئی۔

جس آیت کو میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کیا ہے، حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے خوش نصیب ہیں وہ بندے جن کی جانب اس آیت کا رُخ ہے، جن کا ذکر آیت اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے، خداوند عالم فرما رہا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ". (سورہ صف: 74)

"بے شک اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں صف باندھ کر (اس طرح) لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو"۔

حضراتِ والا! آیت نے کسی کا نام نہیں لیا مگر اس میں کیا شک ہے کہ کار نمایاں ضرور دکھایا ہے اور بتا دیا ہے کہ وہ کون ہیں جن سے اللہ محبت رکھتا ہے۔

میں سب سے پہلے عرض کروں گا کہ محبت کسی بھی جانب سے ہو، قابل قدر شے ہے۔ اس دُنیا میں کونسا شخص ایسا ہوگا جس کے دل میں یہ تمنا نہ ہو کہ یہ دُنیا والے مجھے محبت کی نظر سے دیکھیں۔ یقیناً اس تمنا سے کوئی دل خالی نہیں۔ محبت کے لائق ہو تو یہ تمنا رکھتا ہے، اس لائق نہ ہو، تب بھی آرزو رکھتا ہے۔ محبت کچھ ایسی جاذب اور دلکش چیز ہے کہ ہر شخص اس کا آرزومند ہے۔

لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ دُنیا والے کیا اور اُن کی محبت کیا! محبت اصل میں اُس کی محبت ہے جو قائم رہنے والی ہو۔ محبت اُس کی محبت ہے جو محبت کی بدولت سب کچھ دینے والا ہے۔ نادار نے نادار سے محبت کی تو اُس کی محبت کی وجہ سے اُس نے کیا پایا؟ لیکن ہاں! اگر وہ محبّ ہو جائے اُس کا جس کے ید قدرت میں سب کچھ ہے تو مجھے کہہ لینے دیجئے کہ اگر وہ محبّ ہو جائے تو پھر اُس کے محبوب کو ضرورت نہیں کہ کوئی اُس کا محبّ ہو جائے۔

خدا جس سے محبت کرے اور جس سے محبت رکھے، وہ ہر محبتِ ماسوا سے بے

نیاز ہیں۔ اُنہیں کیا ضرورت ہے کہ اب کوئی اور بھی اُن سے محبت رکھے؟ ہاں! اگر کوئی اُن سے محبت رکھے، یہ سمجھ کر نہ رکھے کہ انہیں ضرورت ہے میری محبت کی بلکہ یہ سمجھ کر رکھے کہ اُن کی محبت کی مجھے ضرورت ہے۔

خدا کی محبت اپنے مقام پر کافی ہے۔ جب وہ محبّ ہو گیا تو اب کوئی ہو یا نہ ہو۔ جن پر خدا کا درود وسلام ہو، اب اُنہیں کوئی اور سلام کرے یا نہ کرے، کوئی اور اب اُن پر درود بھیجے یا نہ بھیجے، وہ اب کسی اور کے درود کے حاجت مند نہیں۔ وہ اب کسی اور کے سلام کے حاجت مند نہیں۔ اپنے لئے اگر کوئی چاہے کہ میرا انجام بخیر ہو جائے تو بے شک درود گزار بنے، بے شک اُن کا سلامی بنے۔

ذرا سوچئے کہ اگر خدا کسی کا مداح ہو جائے اور مدح کا التزام یہ کہ جو کتاب آئے، اُن کی مدح لے کر آئے اور منظورِ قدرت یہ ہو کہ چاہے وہ دُنیا میں نہ پہنچیں مگر اُن سے پہلے اُن کی ثنائیں دُنیا میں پہنچ جائیں، اُن کے بارے میں صدائیں دُنیا میں پہنچ جائیں۔ جن کا خدا ایسا ذاکر ہو کہ کہیں اُن کے رکوع کا ذکر ہو، کہیں اُن کے سجود کا ذکر ہو، کبھی اُن کے قیام کا ذکر ہو، کبھی اُن کے قعود کا ذکر ہو، کبھی اُن کا جاگنا، کبھی اُن کا سونا، کبھی اُن کا ٹھہرنا، کبھی اُن کا رواں ہونا، کبھی اُن کی حرکت، کبھی اُن کا سکون۔ یہ سب ذکر کے لائق سمجھے جائیں۔

کبھی اُن کی لیل کا ذکر، کہیں اُن کے انہار کا ذکر، کبھی اُن کی شام کا ذکر۔ جن کا ذاکر ایسا خدا ہو تو اُنہیں پھر ضرورت رہی کہ اور بھی کوئی اُن کا ذاکر بنے؟ اُنہیں اب ضرورت ہے کہ کوئی اور بھی اُن کا مداح بنے؟

وہ بے نیازِ مدحِ عالم ہیں جن کا ثناخواں خدا ہے۔ بے نیازِ ذکرِ عالم ہیں وہ

جن کا ذاکر خود خدا ہے۔ ہم جو اُن کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کو سجانے کیلئے نہیں بلکہ اپنی درستی کیلئے کرتے ہیں۔ اُن کو بلند کرنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے درجات کو بلند کرنے کیلئے۔ ہم اُن کا ذکر اُن کی خاطر نہیں کرتے، ہم اُن کا ذکر اپنی خاطر کر رہے ہیں۔

محبت، اور محبت بھی وہ جو خالق کائنات کی طرف سے ہو۔ کسی کا محب خدا ہو اور وہ ارشاد فرمائے کہ اللہ تو اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں پرا باندھ کر قتال کرتے ہیں، ثابت قدم ایسے کہ جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے۔

مجھے یہاں ایک لفظ کہنا ہے اور وہ اپنے گھر سے نہیں بلکہ فضائے قرآن سے۔ چاہتا ہوں کہ جہاں جہاں میری بات پہنچے، سب کو پہنچ جائے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

"اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ".

دیکھو! اگر تم خدا کی نصرت کا جذبہ لے کر میدانِ قتال میں پہنچو گے تو پھر خدا بھی تمہاری نصرت کرے گا۔ اگر تم اللہ کی نصرت کیلئے میدانِ قتال کی طرف قدم بڑھاؤ گے تو وہی تمہارا ناصر بنے گا، وہی تمہاری نصرت کرے گا۔ اُس کی نصرت کا پہلا نشان یہ ہوگا کہ وہ وعدہ کرتا ہے کہ تمہارے قدموں اور پیروں کو جما دے گا۔ تمہاری ایسی تائید کرے گا اور تمہاری ایسی نصرت کرے گا کہ پھر میدانِ قتال سے تمہارے قدم اُکھڑ نہ سکیں گے۔ وہ تمہارے پیروں کو ثابت کر دے گا، تمہارے قدموں کو جما دیگا۔

حضرات! وعدہ تو شریف آدمی کا بھی وفا ہو کے رہتا ہے، چہ جائیکہ امام کا وعدہ اور چہ جائیکہ نبی کا وعدہ اور پھر کیا کہنا اللہ کے وعدے کا!! خدا کی جانب سے ایفائے وعدہ کیلئے کوئی امر مانع ہو ہی نہیں سکتا۔ اُسے کوئی مجبوری ایسی پیش ہی نہیں

سکتی جس کی بناء پر وہ عذر خواہی کر سکے کہ یہ مجبوری ہوگئی تھی جو میں نے اپنے وعدے کو پورا نہ کیا کیونکہ جو مجبور ہو جائے، وہ خدا نہیں ہے۔

لہٰذا جب مجبور انسان بھی مرتے مرتے اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہے تو وہ خالق جو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ہے، اُس کے وعدہ میں جھول کیسے رہ سکتا ہے اور اُس کا وعدہ پورا ہونے سے کیسے رہ سکتا ہے! ضرور وفا ہوا اور ہوتا رہے گا۔ جو اُس نے کہا ہے، وہ صداقت سے بھرا ہوا ہے۔ اگر تم اللہ کی نصرت کا جذبہ لے کر جاؤ گے تو پھر اللہ بھی تمہاری نصرت کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں، شاید آپ اس بات تک نہ پہنچے ہوں کہ اگر خدا نخواستہ میرا اور آپ کا قدم میدانِ جہاد میں نہ جمے اور اُکھڑ جائے اور اتنی آزادی کے ساتھ کہ کئی کئی دن کی دُوری ہو جائے تو پھر یا تو یہ کہیے کہ نصرتِ خدا کا جذبہ لے کر تو ہم گئے تھے مگر خدا نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اور نہیں کیا تو ہمارے ہٹ جانے پر کیا الزام! اب تو خدا، خدا نہ رہا۔ صداقت نہ رہی تو خدا نہ رہا۔ تو یا تو یہ مان لیجیے کہ خدا نے اپنا وعدہ بھلا دیا اور اپنا خدا ہونا وہ بھول گیا۔ اگر یہ نہیں مانا جا سکتا اور خدا کا ماننے والا اسے ہرگز نہیں مان سکتا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جانے والا نصرتِ خدا کا جذبہ لے کر ہی نہیں گیا تھا۔ اگر جذبۂ نصرتِ الٰہی لے کر گیا ہوتا تو خدا نصرت کرتا اور یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ کے ارشاد کے مطابق اُس کے پیر ایسے لوہے کے ہو جاتے کہ میدان سے ہل ہی نہیں سکتے تھے۔

لیکن قدم کی جنبش رازِ دل منکشف کر رہی ہے۔ دل کا راز کھول رہی ہے کہ میں جذبہ نصرتِ الٰہی لے کر ہی نہیں گیا تھا، جس کی وجہ سے میرے پیر جم ہی نہ سکے۔

اب اگر کسی کے پیر جمتے دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ اللہ کا ناصر ہے۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے قصور کی منزل الگ ہے۔ یہ بات ذرا سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ عفو خطا کی منزل تو الگ ہے۔ یہ تو کریم کا کرم ہے کہ بڑے بڑے قصور کو نظر انداز کر دے۔ قصوروار کو عفو درگزر سے چھوڑ دینا قصوروار کا کمال نہیں ہے۔ یہ تو اُس کا کمال ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، اپنے آپ کو "غفوٌ غفوْر" کہتا ہے۔

لیکن یہ بات کہاں جائے گی کہ جنگ میں شامل ہونے والا جذبہ نصرت خدا لے کر ہی نہیں گیا تھا۔ لہٰذا جو جذبہ وہ لے کر ہی نہیں گیا تھا، وہ وقت تو گزر چکا۔ اب اُس وقت کا وہ جذبہ تو نہیں بدل سکتا۔ وہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔ اسی لئے اللہ کا ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ تو اُن لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں جم کر قتال کرتے ہیں۔ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

میرا باذوق مجمع اندازہ لگا سکتا ہے کہ مثبت میں منفی کا پہلو موجود ہے یا نہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظِ آیات بصورتِ مثبت ہیں۔ بیان تو یہ ہو رہا ہے کہ اللہ تو اُن سے محبت کرتا ہے جو میدان سے ہٹتے نہیں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدم رہ کر قتال کرتے ہیں۔ خدا تو اُن سے محبت رکھتا ہے مگر اس مثبت کی ضد میں نفی ہے کہ نہیں، یعنی جہاں اس آیت نے یہ بتایا کہ وہ کون ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے، اُسی آیت نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ کون ہیں جن سے خدا محبت نہیں رکھتا۔

میدان سے نہیں ہٹتے، جم کر قتال کرتے ہیں، سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدم رہ کر قتال کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن سے خدا محبت کرتا ہے۔ تو پھر جب یہ وہ ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے تو پھر جو ایسے نہیں ہیں، کیا آپ یہ بھی کہہ

سکیں گے کہ خدا اُن سے بھی محبت کرتا ہے؟ لہٰذا پھر محبت کی ضد بھی ہے۔ محبت کا پھر کوئی تقابل بھی ہے۔ اس لئے کہ جب ثبات کی ضد موجود ہے، ثبات قدمی کے مقابلہ میں کوئی شے بھی موجود ہے تو پھر جو چیز محبت کے مقابلہ میں ہے، وہی چیز اُن کے مقابل آئے گی یعنی خدا اُن سے محبت نہیں رکھتا۔

میں تو اپنے مجمع سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خداوند عالم نے اپنی محبت کا ذکر کسی ہدایت کی بناء پر کیا ہے۔ میں ذرا اپنے مجمع کو بلند کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن کی کوئی خبر، خبر کی حیثیت میں نہیں ہے۔ قرآن اخبار کا نام نہیں ہے بلکہ قرآن کے نزول کی جو غرض و غایت ہے، وہ کلام میں موجود ہے:

"هُدًى لِلْمُتَّقِينَ".

"یہ کتاب پرہیزگاروں کی ہدایت کیلئے ہے"۔

تو جب کتاب ہدایت کیلئے ہے تو اُس کا ہر جزو ہدایت کیلئے ہے۔ جو سورت اس کتاب کی ہے، وہ سراسر ہدایت کیلئے ہے۔ جو قصہ کتاب میں درج ہے، وہ ہدایت کیلئے ہے۔ مثل ہے تو ہدایت کیلئے ہے، امر ہے تو ہدایت کیلئے ہے، خبر ہے تو ہدایت کیلئے ہے۔ جو قرآن ہے، وہ ہدایت کیلئے ہے اور جو ہدایت کیلئے نہیں ہے، وہ قرآن نہیں ہے۔ قرآن کا کُل بھی ہدایت کیلئے، قرآن کا جزو بھی ہدایت کیلئے۔

لہٰذا جب قرآن کا جزو وکُل ہدایت کیلئے ہے تو یہ آیت بھی قرآن ہی کی ہے:

"اللہ اُن سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں جم کر قتال کرتے ہیں اور اُن کے قدم نہیں اُکھڑتے، وہ میدانِ قتال میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ جملہ خبر کا جملہ ہے مگر قرآن کی کوئی خبر، خبر کیلئے نہیں، ہدایت کیلئے ہے۔ اگر اس

سے ہمیں کوئی ہدایت نہیں ملتی تو پھر یہ قرآن نہیں ہے۔

لہٰذا اس میں ہدایت کیا ہے؟ بالکل صریحی چیز ہے کہ اللہ نے خبر دے کر کہ ہماری محبت کا رُخ اُن کی جانب ہے جو میدانِ قتال سے ہلتے نہیں، اس لئے ہمیں سنایا تاکہ ہم بھی اپنی محبتوں کا رُخ اُسی جانب کرلیں جس جانب خدا کی محبت کا رُخ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ کی محبت کا رُخ کوئی اور ہو اور ہماری محبت کا رُخ کوئی اور ہو۔ اگر ہم نے اُس کے رُخ کو مختلف کرلیا تو پھر یہ خدا سے ہماری بے رُخی قرار پا گئی۔

قرآن یہ خبر دے کر اصل میں اس امر کی دعوت دے رہا ہے کہ اب تم اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ ہم تو اپنی بات سنا چکے کہ ہم تو اپنی محبت اُن سے کرتے ہیں جو میدان سے ہٹتے نہیں۔ تو سننے والو! تم اپنے دل کو ٹٹولو اور اپنے دلوں کی فضا کو دیکھو کہ تمہیں کن سے محبت ہے؟ آیا اُنہی سے ہے جن سے ہمیں ہے یا اُن سے ہے جس سے ہمیں محبت نہیں ہے؟

حضراتِ والا! یہاں درمیان میں ایک لفظ کہوں گا کہ دُنیا والوں کی محبت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اہلِ دُنیا میں اور خدا میں۔ میں کم از کم ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں محبت ذات سے یا کسی ہستی سے ہو جاتی ہے، کسی شخص سے ہو جاتی ہے۔ پھر جب اُس سے محبت ہوگی تو اب اُس کی محبت کی وجہ سے ہمیں اُس کی صفات سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ آپ کو عاقلانہ انداز میں ذرا سا فرق محسوس کرنا ہے۔ ہمیں کسی کی ذات سے محبت ہوئی اور چونکہ کسی ذات سے محبت ہوگئی تو جو بھی اُس کی صفات ہیں، محبتِ ذات کے سبب اُن صفات سے بھی محبت ہوگئی۔ چونکہ ابتداء ہے محبّ کی ذات سے، اس لئے محبت اُس کی ذات کی صفات سے ہے۔

اب کج ادائی ہے تو اُس سے بھی محبت، بے وفائی ہے تو اُس سے بھی محبت۔ خلافِ وعدہ دیکھتے ہیں تو خلفِ وعدہ سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ ہر بات میں ہم ایک ادا محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ ہمیں ذات سے محبت ہے۔ جب محبت ہو چکی تو جو کچھ بھی ہو اور جیسے بھی ہو۔ اُس کی صفات ہمارے لئے محبت کے لائق قرار پا گئیں۔ اب ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ یہ صفات اچھی ہیں یا بری ہیں۔

میرے خیال میں آپ میرے مقصد کو سمجھ رہے ہوں گے۔ اب محبوب کے عیب بیان کئے جا رہے ہیں اور وہ ہنر نظر آ رہے ہیں۔ ہم اُن چیزوں کو خود صفت قرار دے کر پیش کر رہے ہیں جو چیزیں عقلاً عیب ہیں۔ مگر ہم اُن کو بھی ہنر سمجھ کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ محبت کچھ اور ہے، یہ اندھی محبت ہے۔ ایسی محبت کے متعلق ضرب المثل ہے "حُبُّ شَیٍٔ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ"؛ "جب کسی شے سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ محبت کرنے والے کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے"۔ یعنی عیب اُس کے دکھائی دیتے ہیں مگر ایسے ہیں کہ جیسے نظر ہی نہیں آتے۔

عیب سنتا ہے مگر وہ سننا ایسا بے اثر ہے کہ گویا وہ سن ہی نہیں رہا۔ یہ عیب اُس محبت میں ہے جس کی ابتداء ذات سے ہوئی اور یہ محبتِ ذات محبتِ صفات کی طرف لے جائے گی۔

خداوند عالم کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کسی ذات کا محبّ ہو جائے یا کسی شخصیت سے محبت ہو جائے بلکہ اُسے صفات سے محبت ہوا کرتی ہے۔ اُس کی محبت کی بناء ذات نہیں ہے بلکہ اُس کی محبت کی بناء صفات ہیں۔ پھر جب صفات سے محبت ہوتی ہے تو صفات کی وجہ سے ذات سے محبت ہو جاتی ہے۔

ذرا یہ لوٹ پلٹ ہے جو آپ کے سمجھنے کے متعلق ہے۔ ہمیں ذات سے محبت ہوتی ہے، ذات کی وجہ سے صفات کی محبت ہوتی ہے۔ اُسے صفات سے محبت ہوتی ہے اور صفات کی وجہ سے ذات سے محبت ہوتی ہے۔ جب صفات سے محبت ہو گئی تو رنگ کچھ ہی ہو، سن و سال کچھ ہی ہو، یہ باشندہ کہیں کا ہو، اب اگر غلام حبشی بھی اُن صفات کا مالک ہو تو جونِ حبشی سے بھی اُسے محبت ہو جائے گی اور اگر بے صفات ہے اور قریشی ہے تو اُسے اس قریشی سے بھی محبت نہیں ہوگی بلکہ "تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ" اُس کے بارے میں نازل کرنے کیلئے تیار ہے۔

لہٰذا آپ نے غور فرمایا کہ وہ ذات کا محب نہیں بنتا، وہ صفات کا محبّ ہوا کرتا ہے۔ وہ صفات جس میں بھی ہوں، کسی رنگ میں ہو، کسی قد میں ہو، کسی قامت میں ہو، کسی خطے میں ہو، کسی علاقے میں ہو، کسی گھرانے میں ہو، اُسے تو مطلب صفات سے ہے۔ جہاں وہ صفات پسندیدہ دیکھتا ہے، اُن صفات کو پسند کرتا ہے اور جس میں بھی وہ صفات ہوں، وہ ذات بھی اُسے محبوب ہو جاتی ہے۔

پھر صفات والی ذات کا جو مسکن ہو، اللہ کو وہی مسکن اور گھر محبوب ہوتا ہے۔ وہ ذاتیں جہاں چلیں، وہی راہ خدا کو محبوب، جہاں وہ سوئیں، وہی خواب گاہ خدا کو محبوب، جہاں وہ ہوں، وہ جگہیں خدا کو محبوب۔

مجھے قرآن مجید کی آیت یاد آگئی:

"لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ".

مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور البلد مکہ کا ہی نام ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ ہم اس شہر کی قسم کے ساتھ کہتے ہیں، جب تم اس شہر میں ہو۔ مکہ کی قسم ہوئی یا پیغمبرؐ کی کی قسم

ہوئی، مگر قسم کے عنوان کی لطافت ملاحظہ فرمائیں کہ خدا یہ نہیں چاہتا کہ براہِ راست اپنے پیغمبر کی قسم کھائے بلکہ اُس پیغمبرؐ کے بود و باش کا جو مقام ہے، اُسے قسم کے لائق قرار دے رہا ہے یعنی مکہ کی قسم کھائی جارہی ہے کہ جب رسولؐ اس شہر میں موجود ہوں اور اُسی وقت یہ شہر خدا کے قسم کھانے کے لائق ہے۔ حالانکہ اگر آپ نے توجہ نہیں فرمائی تو توجہ فرما سکتے ہیں کہ یہ ذکر اُس شہر کا ہو رہا ہے جس شہر میں مستقل طور پر خدا کا گھر ہے اور یہ گھر وہ گھر ہے جسے نہ کہیں آنا ہے اور نہ کہیں جانا ہے، نہ اُس کی جگہ کو بدلنا ہے۔ مگر خدا نے اپنی قسم کا مرکز بیت اللہ کو نہیں قرار دیا بلکہ اہل بیتؑ کو قرار دیا اور یہ فرمایا کہ تم جب تک اس شہر میں ہو تو یہ شہر قسم کے لائق ہے۔

مفہوم یہی نکلتا ہے کہ اگر تم کہیں اور ہو تو وہی جگہ یا مقام قسم کے لائق ہوگا۔

اللہ، اللہ! یہ اُن ہستیوں کا ذکر ہے جو معراج پاتی نہیں بلکہ معراج دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فرشتے نے فلک کی بلندیوں کو ہیچ سمجھا۔ جبرئیلؑ امین آسمانوں کی بلندیوں پر تھے جب وہ اعلانِ قدرت ہو رہا تھا:

"بِعِزَّتِیْ وَجَلَالِیْ اِنِّیْ مَاخَلَقْتُ سَمَآءً مَبْنِیَّةً وَلَا اَرْضًا مَدْحِیَّةً وَلَا قَمَرًا مُنِیْرًا وَلَا شَمْسًا مُضِیْئَةً وَلَا فَلَكًا یَدُوْرُ وَلَا بَحْرًا یَجْرِیْ وَلَا فُلْكًا یَسْرِیْ اِلَّا فِیْ مَحَبَّةِ هٰؤُلَاءِ الْخَمْسَةِ الَّذِیْنَ هُمْ تَحْتَ الْكِسَآءِ"۔

"میرے ملائکہ اور میرے آسمانوں پر بسنے والو! میں اپنی عزت و جلال کی قسم کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے محکم آسمانوں کو نہیں پیدا کیا اور میں نے زمین کا فرش نہیں بچھایا اور نہ ماہِ تاباں کو اور خورشیدِ درخشاں کو وجود میں لایا اور نہ گھومنے والے افلاک کو اور نہ بہتے ہوئے دریاؤں کو اور نہ چلنے والی کشتیوں کو، مگر ان پانچ ہستیوں کی محبت میں

جو چادر کے نیچے ہیں"۔

اور ظلمتِ عدم کو نور سے بدلا۔ یہ سب کچھ میں نے ان پانچ ہستیوں کی محبت میں پیدا کیا ہے جو اس وقت گنتی میں پانچ ہیں مگر سب ایک چادر میں ہیں۔

یہ تو میں نہیں مان سکتا کہ جبرئیلؑ امین کو ان پانچ کی خبر نہ ہو اور اُس چادر کی جس میں وہ پانچ ہیں۔ مگر بہر حال سوال کے ذریعہ سے بہت سی باتیں دُنیا پر ہویدا کروائی جاتی ہیں۔ جبرئیلؑ نے پوچھ لیا:

"يَارَبِّ وَمَنْ تَحْتَ الْكِسَاءِ".

"بارِالٰہا! وہ پانچ جو زیرِ چادر ہیں جن کی بدولت تو نے سب کچھ پیدا کیا، وہ کون ہیں؟"

اب ذرا سب لوگ توجہ فرمائیں، پہچان کروائی جاتی ہے کہ کون ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ وہ پانچ کون ہیں؟ فرمایا جاتا ہے:

"هُمْ اَهْلُبَيْتِ النُّبُوَّةِ وَمَعْدِنُ الرِّسَالَةِ هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوْهَا وَ بَعْلُهَا وَبَنُوْهَا".

لفظوں سے مطالب کا سمجھنا ہی تو عقل کا کام ہے۔

جبرئیلؑ! یہ نبوت کے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ رسالت کے معدن ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ یہ نبی کے اہل بیتؑ ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ رسول کے معدن ہیں بلکہ فرمایا کہ نبوت کے اہل بیتؑ ہیں اور رسالت کے معدن ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں نبوت سے رشتہ ہے، یہ وہ جو رسالت کی کان ہیں۔

سب سے پہلے اہل بیت تو نبی کہنے سے کمی یہ ہو جاتی کہ اہل بیت تو نبی میں

سب رہتے سوائے نبی کے اور جو نبی ہی نہ رہے تو پاکیزگی کی جان نہ رہتی۔ لہٰذا اگر اہل بیتِ نبی کہہ دیا جاتا تو پھر فاطمہؑ تو کہا جا سکتا تھا مگر ''اُمِّ اَبِیۡھَا'' نہیں کہا جا سکتا تھا۔ فاطمہؑ ہیں اور اُنؑ کے باپ؟ تو اُنؑ کے باپ تو نبی ہیں، خود وہ اہل بیتِ نبی تو نہیں ہیں۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ رسولؐ اہل بیتِ نبی تو نہیں ہیں، خود نبیؐ ہیں۔ اس لئے اہل بیتِ نبی کہنے میں نبی کی گنجائش نہ رہتی۔

فاطمہؑ کے بعد ''اُمِّ اَبِیۡھَا'' نہیں کہا جا سکتا تھا، اہل بیتِ نبی رہتے۔ مگر حضرات! یہ الفاظ کہنے سے پھر اہل بیتِ نبی کی بھی عزت و وقار کا صحیح منظر آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا تھا۔

یہ بات توجہ کے لائق ہے۔ جو وقار واقعی تھا، وہ آنکھوں کے سامنے نہیں آ سکتا تھا کیونکہ جو نبی سے رشتہ تھا، وہ غیر معصوم کو بھی ہو سکتا ہے۔ نبی سے رشتہ خاطی کو بھی ہو سکتا ہے۔

حضرات والا! مجھے کہنے دیجئے اور یہ میرا کہنا کہاں ہے؟ یہ حقیقت کی گویائی ہے کہ نبی کا رشتہ یا نبی سے رشتہ ہونا، نبی کا رشتہ دار ہونا اس امر کی بھی ضمانت نہیں ہے کہ وہ جنتی ہو۔ کتنے نبی کے رشتہ دار محرومِ جنت ہیں۔ ہیں یا نہیں؟ مثلاً نوحؑ کا بیٹا۔ کتنی خطرناک حالت تھی کہ حضرت نوحؑ کو ٹوک دیا کہ اب تو کہہ چکے، اگر دوبارہ تم نے کہا تو تمہارا نام انبیاء کی فہرست سے مٹا دیا جائے گا۔ حضرت نوحؑ کو چپ ہونا پڑا۔ نبوت کا کھو دینا منظور نہیں تھا، نبوت سے ہاتھ دھونا گوارا نہیں تھا، بیٹا نہیں رہتا، نہ رہے، نبوت تو رہے، خرقِ رسالت تو نہ اُتر جائے، یہ بیٹا جنتی تو نہیں ہے۔

آذر نبی کا قرابت دار ہے۔ بعض تو اُس کو نبی کا باپ کہتے ہیں جو ہمیں تسلیم

نہیں ہے۔ مگر ہمیں اُن کو رشتہ دار تسلیم کرنے میں تو کوئی باک نہیں ہے۔ اُس نے پالا تھا، پرورش کی تھی۔ وہ رشتہ کا بزرگ تھا، مثلاً چچا تھا۔ نبی سے رشتہ تو تھا مگر یہ رشتہ جنت میں اُس کو پہنچا دے گا؟

استغفار کرتے کرتے ابراہیمؑ کو روک دیا۔ دوبارہ مت کہنا۔ وہاں نوحؑ کو روکا اور یہاں ابراہیمؑ کو روکا۔ خبردار! اب نہ کہنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نااہلیت کی انتہا ہوتی ہے، وہاں نبی کیلئے خطرے پیدا ہو جاتے ہیں کہ اگر اس نااہل کے بارے میں نبی کہے تو نبی نہ رہے اور ایک وہ مقام نظر آئے گا جہاں اہلیت کا کمال ہے۔ اُس کے بارے میں اگر نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے۔ جو ہم کہہ رہے ہیں، وہ زبان سے کہہ دو اور ہاتھ سے کر کے دکھا دو۔ قول بھی ہو، فعل بھی ہو۔ کہنا بھی ہو، کرنا بھی ہو:

"وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ."

"اور جو تم نے نہ کیا تو تم نے رسالت نہ پہنچائی"۔

اور نتیجتاً وہ رسول نہ رہے۔ لہٰذا ایک وہ ہیں جن کے بارے میں نبی کہے تو نبی نہ رہے اور ایک یہ ہیں جن کے بارے میں نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے۔ وہ نااہلیت کا کمال رکھتے تھے، یہ اہلیت کا کمال رکھتے ہیں۔

میں نہیں کہنا چاہتا کہ نبی سے رشتہ باعث شرف نہیں ہے۔ باعث شرف ہے مگر کفر کے ساتھ ارتداد کے ساتھ نہیں۔ یہاں مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ نبی سے رشتہ ہے اور کفر ہے تو پھر یہ کافروں سے زیادہ مستوجب عذاب ہے۔

ذرا انصاف سے بتایئے گا کہ ابوسفیان نے کتنی لڑائیاں رسول سے لڑی ہیں

اور تمام جنگوں کا دارومدار، بدر ہو یا اُحد وغیرہ، اُسی پر تو ہے کہ اُسی کی سرداری میں مخالفتِ رسولؐ ہوئی۔ مگر کہیں قرآن میں ابوسفیان کا نام آیا؟ ابوجہل نے کتنی اذیتیں پہنچائی ہیں۔

ایک عجیب سا منظر ہے جو میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس وقت ابوجہل سے زیادہ شدید بھی کوئی دشمن تاریخ کی نظر میں ہوگا۔ ہمارا بچہ بچہ نفرت کی جہت سے اُس کا نام جانتا ہے، اچھائی کے اعتبار سے نہیں بلکہ برائی کے اعتبار سے۔ کون ایسا ہوگا جو ابوجہل سے واقف نہ ہو۔ کوئی جاہل ہی ہو سکتا ہے۔

کتنی اذیتیں نبی کو پہنچائیں مگر کہیں قرآن میں اُس کا نام ہے؟ ابوجہل کا نام نہیں، ابوسفیان کا نام نہیں۔ نام آیا تو ابولہب کا آیا۔ میں تو اس کے معنی یہ سمجھتا ہوں کہ خداوندِ عالم اس مسئلہ میں اتنا غیر جانبدار ہے کہ وہ نبی کی قرابت کا استحقاق نہیں تو کوئی لحاظ نہیں رکھتا مگر ایسا آزاد ہے کہ غیروں کا نام لے یا نہ لے مگر اگر کوئی مجرم قرابت دار ہے تو اُس کا نام اُچھالے گا، اُس کیلئے کوئی رعایت نہ کی جائے گی۔

صاف آیت بھی قرآن میں ہے، دیکھ لیجئے گا، اس وقت پڑھ لیجئے:

"يُضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ".

"اسے عذاب دوگنا کیا جائے گا"۔ (الاحزاب:30)

اس درجہ قرابت ہونے پر بھی، رشتہ دار ہونے پر نبی کی رشتہ داری کی وجہ سے جرم بڑھ جاتا ہے۔ یہ شخصیت بیگانہ نہ تھی، یگانہ تھی۔ دُور رہنے والی نہ تھی، قریب رہنے والی تھی۔ لہٰذا ہم اکہری سزا نہیں دیں گے جو عام مجرم کو دی جاسکتی تھی بلکہ دوگنی سزا دیں گے۔

لہٰذا جو قرابت داریٔ رسول کی وجہ سے جرم کی سزا دوگنی کر دیتا ہو، وہ خدا اگر نبی کے کچھ رشتہ داروں کی محبت کو رسالت کا اجر قرار دے دے اور اس محبت کا حکم عام کر دے تو ہمیں سے سمجھنا پڑے گا کہ وہ قرابت دارانِ نبی ہونے کی بناء پر محبوبِ خلائق نہیں بنائے گئے بلکہ اُن کے ایسے کمالات تھے اور یہ اُن کے مقامات تھے جن کی بناء پر ان سب کی محبت واجب ہوئی۔

حضراتِ والا! نبی سے قرابت آج بھی تمام سادات کو حاصل ہے۔ سب آلِ رسولؐ ہیں، رسولؐ کی اولاد ہیں۔ اولاد ہونے سے زیادہ کوئی اور رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ میراث کا یہ پہلا طبقہ ہے۔ اولاد میں سے اگر ایک بھی ہو، چاہے وہ کتنی ہی دُور ہو، نہ بھائی کو میراث مل سکتی ہے، نہ بہن کو مل سکتی ہے، نہ چچا کو مل سکتی ہے، نہ پھوپھی کو مل سکتی ہے، نہ ماموں کو مل سکتی ہے، نہ خالہ کو مل سکتی ہے۔

اولاد اور اولاد کی اولاد تا قیامِ قیامت پہلے طبقہ میں ہیں۔ خواہ اولاد کی نسل کتنی ہی دُور چلی جائے مگر وارث ہے۔ وارثوں کی وارث ہے اور درمیان میں کوئی حائل نہیں ہے۔ وہ بذاتِ خود وارث ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ پوتا محروم ہو جاتا ہے، یہ اُس وقت ہے جب مرنے والے کا بیٹا یا بیٹی موجود ہو۔ اگر اپنا بیٹا یا بیٹی موجود نہیں ہے تو وہی وارثِ کُل ہوگا۔ اس میں تو طبقہ اُولیٰ موجود ہے، اس میں اولاد ہے۔ محجوب تو وہ تب ہوگا جب کوئی حاجب ہو۔ محروم تو وہ تب ہوگا جب کوئی محروم کرنے والا اس سے بہتر رشتہ رکھنے والا ہو۔

لہٰذا اولاد قیامت تک طبقہ اُولیٰ میں ہے اور اس سے زیادہ دُنیا میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔

لیکن میں سادات کرام سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کو یا مثلاً مجھے نبی سے رشتہ ہے مگر سوچتا ہوں کہ کیا مجھے نبوت سے بھی رشتہ ہے؟ میرے خیال میں تو کوئی پیچیدہ بات نہیں ہے۔ نبی سے رشتہ ہے لیکن کیا نبی کے رشتہ داروں کو نبوت سے بھی رشتہ ہے؟ عالم سے تو رشتہ ہے مگر کیا علم سے بھی رشتہ ہے؟

جی نہیں! ذات سے رشتہ ہونا اور بات ہے اور صفات سے رشتہ ہونا اور ہے۔ عالم کے کتنے رشتہ دار ہوتے ہیں مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُس کو علم سے بھی رشتہ ہے؟ طبیب کے بہت سے رشتہ دار ہو سکتے ہیں مگر کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں طبابت سے بھی رشتہ ہے؟ فقیہ سے رشتہ ہو تو کیا اس کا مطلب ہے کہ انہیں فقہ کے علم سے بھی رشتہ ہے؟ نبی سے رشتہ ہے تو کیا اس کے معنی ہیں کہ نبوت سے بھی رشتہ ہے؟

نبی سے رشتہ ہونا اور بات ہے اور نبوت سے رشتہ ہونا اور بات ہے۔ عالم سے رشتہ ہونا اور بات ہے اور علم سے رشتہ ہونا اور بات ہے۔ معصوم سے رشتہ ہونا اور بات ہے اور عصمت سے رشتہ ہونا اور بات ہے اور یہ اُنہی اہل بیتؑ کے افراد کا حصہ تھا۔

"هُمْ اَهْلُ بَيْتِ النُّبُوَّة"۔

"یہ لوگ نبوت کے اہل ہیں"۔

یہ نہیں کہا کہ نبی کے اہل بیت ہیں۔ نبی کے رشتہ دار تو اور بھی ہیں اور قیامت تک رہیں گے مگر نبی سے رشتہ ہونا فضل و کمال کا مظہر نہیں بن سکتا۔ کمال تو یہ ہے کہ جیسے انہیں نبی سے رشتہ ہے، ویسے ہی اُنہیں نبوت سے بھی رشتہ ہے۔ جیسے انہیں رسولؐ سے رشتہ ہے، ویسے ہی اُنہیں رسالت سے بھی رشتہ ہے۔ نبی کہلائے

بغیر یہ نبوت کا کام انجام دینے والے تھے۔ رسول کہلائے بغیر رسالت کا کام کرنے والے ہیں۔ جب نبوت کو کوئی مرحلہ پیش آیا تو نبوت کے رشتہ داروں کو ساتھ لے جایا گیا:

"قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ كُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ، ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ".

یہ تھا نبوت کا کام۔ تو نبوت کے رشتہ داروں کو دیکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو نبی کے رشتہ دار تھے مگر نبوت سے رشتہ نہ تھا، انہیں چھوڑ دیا گیا کیونکہ نبی کے تو رشتہ دار تھے، نبوت کے رشتہ دار نہیں تھے۔

تمام عالم میں سے ایک خاتون کو لے جایا گیا، حالانکہ آیت مذکورہ میں جمع کا صیغہ تھا اور نہ معلوم کتنے قرابت داروں میں سے ایک کو نفس قرار دے کر لے جایا جا رہا ہے، اس لئے کہ نبوت سے رشتہ دیکھا جا رہا ہے۔ جنہیں نبوت سے رشتہ تھا، وہ چنے گئے اور رسولؐ نے نہیں چنا۔ خدا نے چن کر خود حکم دیا، تب نبیؐ لے گئے۔

اس بناء پر آج عالم میں کسی کو یہ کہنے کی مجال نہیں ہو سکتی کہ نبیؐ خود لے گئے تھے کیونکہ قرآن میں ان کے لے جانے کا حکم موجود ہے اور نہ کسی کا دم ہو سکتا ہے کہ کہے کہ خود چلے گئے تھے یا نبیؐ خود لے گئے تھے۔ آیت آئی: "لے جاؤ"۔ اب تو نبی کی نبوت اُن کو لے جانے میں ہے۔ اب تو حکم کی تعمیل رسولؐ پر لازم ہوگئی۔

اب ذرا غور فرمائیں کہ جن کو نبیؐ خدا کے حکم سے لے جائیں گے، اُن کو جا کر کیا کہنا ہے؟ صرف یہ جملہ:

"لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ".

یہ جملہ تو چھوٹا سا ہے۔ میں بھی کہہ دوں، آپ بھی کہہ دیں۔ سچا کہہ دے،

جھوٹا کہہ دے، کہنے میں کیا لگتا ہے!

مگر یہ خدا کے حکم سے کہنا ہے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ یہ جملہ جس زبان پر آئے، وہ زبان ایسی ہو جس پر کذب نہ آیا ہو۔ نہ اُس کے قول میں کذب ہو اور نہ اُس کے فعل میں کذب ہو تاکہ خلوصِ کامل کے ساتھ کہہ سکے لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ' ورنہ اگر اُس نے خود کبھی جھوٹ بولا ہے یا جھوٹ کہا ہے تو کہنے کو تو کہہ دے گا مگر اُس کا دل خود گواہی دے رہا ہوگا کہ لعنت کا رُخ کسی قدر میری طرف بھی ہے۔

غرضیکہ یہ بڑا لطیف مقام ہے کہ خدا اُن کی پہچان کروائے اور یہ کہہ کر پہچان کروائے کہ یہ نبوت کے اہل بیتؑ ہیں، یہ رسالت کے معدن ہیں اور امین وحی نے نام پوچھنا چاہا تو فرمایا:

"هُمْ فَاطِمَةُ وَاَبُوْهَا وَبَعْلُهَا وَبَنُوْهَا".

"فاطمہؑ ہیں اور اُنؑ کے باباؐ ہیں، فاطمہؑ کے شوہرؑ ہیں اور اُنؑ (فاطمہؑ کے) بیٹے ہیں"۔

پانچوں میں سے ایک کا نام لیا۔ کتنا پر لطف ہے یہ مقام کہ نام بھی معظمہ کا لیا۔ مردوں میں سے کسی کا نام نہیں لیا، بزرگوں میں سے کسی کا نام نہیں لیا، خوردوں میں سے کسی کا نام نہیں لیا۔ خاتونؑ جنت کا نام لیا جا رہا ہے۔

اب جس کی اُن کے رشتہ سے یہ کہہ کر پہچان کروائی گئی کہ فاطمہؑ کے شوہر ہیں، وہ فاطمہؑ کے بیٹے ہیں۔ جتنے ہیں، فاطمہؑ کے ہیں۔ جو ہے، وہ فاطمہؑ کا ہے۔

یہاں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جس کی چادر تھی، اُسی کے نام سے قدرت نے ہر ایک کی پہچان کروائی۔ اس لئے کہ جو چادر میں آیا، چادر والی سے رشتہ تھا، اس

لے آیا۔ اگر چادر کسی اور کی ہوتی تو چادر والے کسی اور رشتہ سے آتے اور اُس کے رشتہ سے آتے تو اُسی کے رشتہ سے پہچان کروائی جاتی۔ مگر چادر تو خاتونِ جنت کی تھی، جو آیا، وہ فاطمہؑ کے رشتہ سے آیا۔

چونکہ وہ باپ ہیں، اس لئے آئے۔ چونکہ وہ شوہر ہیں، اس لئے آئے۔ چونکہ وہ بیٹے ہیں، اس لئے آئے۔ یہ چادر کا احترام ہے اور چادر والی کا احترام ہے۔

لہٰذا خداوند عالم نے عصمت وطہارت کا مرکز خاتونِ جنت کو قرار دیا اور دکھا دیا کہ جس طرح فاطمہ زہراؑ کیلئے باعث شرف ہے کہ ایسا باپ ہو، اُسی طرح سرکارؐ رسالت کیلئے باعث شرف ہے کہ اُن کی ایسی بیٹی ہے۔

خدا جس نبی کی تعظیم کرے اور عنوانِ تعظیم یہ ہو کہ کبھی نام لے کر نہ پکارے۔ آپ قرآن پڑھے ہوئے ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں۔ اُس نے آدم کو یا آدم کہہ کر پکارا حضرت نوحؑ کو یا نوح کہہ کر پکارا، یا ابراہیمؑ کا خطاب بھی آپ کو قرآن میں نظر آئے گا۔ یا موسیٰؑ اور یا عیسیٰؑ کے نام بھی قرآن مجید میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

غرض جس نبی کو بھی پکارا، اُس کا نام لے کر پکارا۔ لیکن ایک جگہ بھی خدا نے ''یا محمدؐ'' نہیں کہا، ''یا احمدؐ'' نہیں کہا۔ کسی ایک جگہ بھی اُس نبی کو اُس کا نام لے کر نہیں پکارا۔ پکارنے کا نشان عظمت رکھا۔ کبھی ''یا نبی'' کہہ کر پکارا، کبھی ''یا ایہا الرسول'' کہہ کر پکارا، کبھی ''مزمل'' کہہ کر پکارا، کبھی ''مدثر'' کہہ کر پکارا، کبھی ''طٰہٰ'' کہہ کر پکارا، کبھی ''یٰسین'' کہہ کر پکارا۔ صفات سے پکارا، القاب سے پکارا، خطابات سے پکارا مگر کہیں بھی نام لے کر نہیں پکارا۔

خدا کی نظر میں جس کی اتنی تعظیم ہو، وہ نبی فاطمہؑ کی تعظیم کیلئے اُٹھے! ذرا آپ

مجھے کہہ لینے دیجئے کہ یہ تعظیم بیٹی کی نہیں تھی۔ بیٹی کے مقام کی تعظیم تھی، بیٹی کے وقار کی تعظیم تھی، بیٹی کی عظمتوں کی تعظیم تھی، یا اس کے کمالات کی تعظیم تھی۔

اگر یہ تعظیم فقط بیٹی کی ہوتی تو واقعی کسی نے کیا خوب جملہ کہا ہے کہ اگر یہ تعظیم فقط بیٹی ہونے کی وجہ سے ہوتی تو پھر قیامت تک یہ بات سنت قرار پا جاتی، سنتِ رسولؐ ہو جاتی۔ مگر یہ تعظیم سنتِ رسولؐ نہیں ہے۔ ہم اپنی بیٹیوں کی تعظیم نہیں کرتے کیونکہ ہماری بیٹی ایسی کہاں جیسی بیٹی خدا نے اس رسولؐ کو عطا کی!!

یہ اُن کی صفات کی تعظیم تھی۔ یہ اُن کے کمالات کی تعظیم تھی۔ یہ اُن کے جاہ و جلال کی تعظیم تھی۔ نہ اس جاہ و جلال کی بیٹی کسی نے پائی، نہ کوئی باپ اپنی بیٹی کی تعظیم کر سکا۔

لہٰذا خدا اپنے نبی کی اس طرح تعظیم بجالائے اور فاطمہؑ کی یہ شان کہ دروازے سے فاطمہؑ کو آتے ہوئے دیکھ لیا تو یہی نہیں کہ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جاتے بلکہ فاطمہؑ کے راستہ میں استقبال کیلئے چلنے لگے، یہ نبیؐ ہی تو ہیں جو فاطمہؑ کو لینے کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

یہ فاطمہؑ کا وقار ہے۔ ایسی باوقار ہیں خاتونِ جنت! اس میں کوئی شک نہیں کہ جس کی تعظیم سرکارِ رسالت اس طرح فرمائیں، اب اُس کی تعظیم دُنیا کرے یا نہ کرے۔ عظمت کی منزلیں تو طے ہو گئیں۔ فاطمہ زہرا کی عظمت رسولؐ سے پوچھئے۔ خود علیؑ سے پوچھئے۔ ہونے والے امام بیٹوں سے پوچھئے یا فاطمہؑ کی شان و عظمت جنابِ زینب سلام اللہ علیہا سے پوچھئے۔

ایک واقعہ مجھے اچانک سے خیال میں آ گیا۔ وہ سنا کر مجلس کو ختم کر دوں گا۔

رسول کا عہد ہے۔ نبی کی مسجد مدینہ میں نماز ہو چکی ہے۔ صفوف میں سے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا:

میں مردِ مسافر ہوں، دُور سے اسلام سے مشرف ہونے کیلئے آیا تھا، مسلمان ہو چکا۔ مہینوں سے یہیں مقیم تھا۔ اب میرا دل اپنے بچوں کو دیکھنے کیلئے بیقرار ہے۔ وطن واپس جانا چاہتا ہوں مگر نہ لباس رکھتا ہوں، نہ زادِ سفر ہے، نہ سواری ہے اور میں بھوکا ہوں۔

مردِ عرب نے اپنی حاجتوں کو پیش کیا۔ پیغمبرِ اسلام نے ارشاد فرمایا: (اُس زمانے کے حالات سخت تھے) "تم میں کوئی ہے جو اس حاجت مند کی حاجت روا کرے؟ جزا کا ذمہ دار ہوں"۔

کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ جناب سلمانؓ فارسی کھڑے ہو گئے اور آپ نے اس مردِ عرب سے کہا کہ میں خود تو کچھ نہیں رکھتا مگر تجھے ایسے دروازے پر لئے چلتا ہوں جہاں سے کوئی محروم نہیں گیا۔ میرے ساتھ چل۔

جناب سلمانؓ نے اس مردِ مسافر کو اپنے ساتھ لیا۔ آپ اُس دروازے کو سمجھ گئے۔ اسی دروازے کی طرف بڑھے۔ چلے جا رہے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے اُس کو مخاطب کر کے فرمایا:

"دیکھو! اس دروازے پر جب نبی بھی پہنچتے ہیں تو باآوازِ بلند فرماتے ہیں:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ بَيْتِ النُّبُوَّةِ وَمَعْدِنَ الرِّسَالَةِ".

نبی اس طرح سلام کرتے ہیں: (اے نبوت کے اہل بیتؑ! اے رسالت کی کان! تم پر سلام ہو)۔ تم بھی وہاں دروازے پر پہنچ کر اسی طرح سلام کرنا"۔

اُس مردِ عرب نے اس بابِ کرم پر پہنچ کر، اس سخاوت کے دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا۔ خاتونِ جنت نے سلام کی آواز کو سنا، دروازے پر آ گئیں۔ مسلمان مسافر نے عرضِ حال کیا۔ حضرت سلمانؓ فارسی نے فرمایا:

''سرکار! اس مسافر کو آپؑ کے دروازے پر میں لایا ہوں۔ مسافر ہے، حاجت مند ہے، بھوکا ہے، بے زاد و بے راحلہ ہے''۔

خاتونِ جنت نے آہستہ سے فرمایا: ''میرے بچوں کو آج تیسرا فاقہ ہے مگر میں اپنے دَر کے سائل کو محروم نہ لوٹاؤں گی''۔

یہ کہہ کر گلوبند گلوئے اقدس سے کھولا اور ہاتھ بڑھا کر عطا کر دیا۔ حضرت سلمانؓ نے وہ گلوبند سائل کو دیا۔ سائل نے اُس گلوبند کو دیکھا، بیش قیمت نہ تھا۔ اُس کی حاجتیں زیادہ تھیں۔ وہ حیران ہونے لگا کہ میں کس لئے آیا تھا اور مجھے کیا ملا؟ حضرت سلمانؓ نے اُس کو دیکھ کر کہا:

''تو یہ نہیں جانتا کہ یہ عطیہ کس کا ہے؟ تیری حاجتیں روا ہو گئیں، تیری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ خدا جانے تجھے کیا کچھ مل گیا؟ اب چل''۔

سائل کو لئے ہوئے مسجد میں آئے۔ یہاں پیغمبرؐ خدا کی نگاہیں منتظر تھیں اور آپؐ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ دیکھوں بیٹی کے دروازے سے سائل کو کیا ملا! سائل کو قریب بلا کر پوچھا کہ تجھے کچھ ملا؟

اُس نے گلوبند دکھایا کہ آپ کی پارۂ جگر سے یہ لے کر آ رہا ہوں۔ رسولؐ اللہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فاطمہؑ کی محبت کے جوش میں فرمایا:

''دُعا دے میری بیٹی کو''۔

اُس مردِ مسافر نے دُعا دیتے ہوئے یہ کہا:

"اَللّٰهُمَّ اَعْطِ فَاطِمَةَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَمَالَا اُذُنٌ سَمِعَتْ".

"اے پروردگار! فاطمہؑ کو وہ کچھ دے جو کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہو اور کسی کان نے نہ سنا ہو"۔

اُس نے دُعا دی۔ فاطمہؑ کا گلوبند مردِ مسافر کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمانوں سے مسجد بھری ہوئی ہے۔ اس میں وہ سب مسلمان تھے جن سے مردِ مسافر نے سوال کیا تھا اور کسی میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سیدہؑ کا گلوبند دیکھ کر مسلمانوں کو غیرت آ گئی۔ چھین کر نہیں لایا تھا، لوٹ کر نہیں لایا تھا، ظلم سے نہیں لایا تھا، سیدہؑ نے اپنی مرضی سے دیا تھا مگر مسلمانوں کو غیرت آ گئی۔

آپس میں گفتگو ہو رہی ہے۔ جب طے پا گیا تو اُس مرد سے مسلمانوں نے کہا کہ اگر تو اس گلوبند کو بیچ دے تو ہم ایک ہزار اشرفی دیں گے، ایک ناقہ تیری سواری کیلئے دیں گے، تجھے اتنا کھانا دیں گے اور پہننے کیلئے تجھے اتنا لباس دیں گے۔

مردِ مسافر نے سنتے ہی کہا: "سبحان اللہ! میں تو غنی ہو گیا"۔

وہ گلوبند ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ مردِ عرب نے فروخت کر ڈالا۔ قیمت وصول کی۔ گلوبند خریدنے والے مسلمان اپنے گھروں کی طرف گئے۔ اُس گلوبند کو معطر کیا گیا اور بردِ یمانی میں لپیٹا گیا۔ ایک شخص نے اپنے غلام کو دیا اور کہا کہ ہم دونوں کی طرف سے یہ چادر میں لپٹا ہوا گلوبند رسولِ خداؐ کی بارگاہ میں تحفہ کے طور پر پیش کر دینا اور غلام سے کہا کہ جاؤ! میں نے تمہیں بھی رسولِ خداؐ کی غلامی میں دیا۔

اب یہ غلام جنابِ سیدہؑ کا چادر میں لپٹا ہوا گلوبند لے کر مسجد میں رسولِ خداؐ

کی بارگاہ میں پہنچا۔ پیغام پہنچایا، گلوبند پیش کیا۔ تحفہ تھا، آپؐ نے قبول فرمالیا اور اُس کی غلامی بھی قبول فرمائی۔ پھر فرمایا:

''اب یہ گلوبند اور چادر میری جانب سے سیدہ فاطمہؑ کو تحفہ قرار دے کر میری بیٹی کے پاس لے جا اور اُسے پیش کر۔ اُس نے تجھے میری غلامی میں دیا، میں نے تجھے اپنی بیٹی کی غلامی میں دیا''۔

اب یہ غلام اُس امانت کو لے کر سیدہؑ کے دروازے پر آیا۔ باپ کا پیغام بیٹی کو پہنچایا۔ عرض کیا: ''سیدہؑ! میں آپؑ کا غلام ہوں''۔

سیدہؑ نے فرمایا: ''میں نے تجھے خدا کی راہ میں آزاد کیا''۔

یہ جملہ سن کر غلام کچھ مسکرایا۔ اُس کے تبسم پر کسی نے برمحل اُس سے پوچھا کہ اس وقت تیرے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟ اُس نے کہا کہ میرے اس وقت مسکرانے اور حیران رہ جانے کا سبب یہ ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ گلوبند اپنے گھر سے حاجت روائی کو نکلا تھا، ایک مسافر تھا جسے اس گلوبند نے وطن میں پہنچا دیا، ایک بے لباس تھا جسے اُس نے بالباس کر دیا، ایک بھوکا تھا جسے اس نے شکم سیر کر دیا، ایک محتاج تھا جسے اس نے غنی کر دیا، ایک غلام تھا جسے اس نے آزاد کروا دیا اور مشکل والوں کی تمام مشکل کو حل کر کے یہ اپنے گھر واپس آ گیا۔

مجلس تو میں ختم کر چکا ہوں، یہی جملہ دُہرانا چاہتا ہوں کہ باپ کا سایہ سر پر تھا تو فاطمہؑ کا اتنا وقار تھا اور فاطمہؑ کا یہ جاہ و جلال تھا۔

حضرات! اس میں کیا شک ہے کہ زینبؑ نشان تھیں فاطمہؑ کا۔ زینبؑ فاطمہؑ کے جگر کا ٹکڑا تھیں۔ وہ عصمتِ کبریٰ تو یہ عصمتِ صغریٰ۔ یادگارِ سیدہؑ ہیں۔ سیدہؑ نے

گلوبند ہاتھ سے دیا تھا، مسلمانوں کو غیرت آ گئی، غالباً اس خیال سے کہ جو گلوبند سیدہؑ کے گلے میں رہ چکا ہے، اُسے ہم غیر کو کیسے دے دیں؟ مگر جناب سیدہؑ کی بیٹیوں کے متعلق مشہور ہے:

شامیاں بستند بازو زینبؑ و کلثومؑ را
اے فلک آں ابتداء ایں انتہائے اہل بیتؑ

وَاِنَّ بَنَاتَهَا فِی الْکَرْبَلَائِیْ
خَرَجْنَ مِنَ الْخِیَامِ بِلَارِدَائِیْ

کیا یہ اُسی فاطمہؑ کی بیٹیاں ہیں جو خیموں سے بغیر چادر کے نکلی ہیں؟ آہ! کیا یہ وہی زینبؑ و کلثومؑ ہیں؟ اُس فاطمہؑ کی بیٹیاں ہیں جو کبھی ابن زیاد کے دربار میں، کبھی کوفہ کے بازار میں، کبھی دمشق کے بازار میں ہیں۔ سر پر چادر نہیں ہے اور کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ سر پر حسینؑ نہیں ہیں۔ سر پر بھائی نہ رہا تو زینبؑ کے سر پر چادر نہ رہی۔ بے بھائی و برادر بھی اور زینبؑ بلا چادر بھی ہیں۔ جہاں جس کا جی چاہے اور جس راہ سے چاہے، لے جائے اور جہاں جی چاہے، کھڑا کر دے۔

دمشق کا بازار ہے اور اس قافلہ کا گزر اس راہ سے ہونے والا تھا۔ ابھی قافلہ بازار میں نہیں پہنچا، دکانیں سجی ہوئی ہیں شہر کی آئینہ بندی ہو چکی ہے شہر کو سجایا گیا ہے۔

مجھے ایک لفظ یاد آ رہا ہے۔ اصحاب نبیؐ میں سہل ابن سعد شامل ہیں اور یہ سہل ابن سعد ساعدی وہ بزرگوار ہیں جن کا نام روزِ عاشور امام حسین علیہ السلام نے یہ کہتے ہوئے لیا ہے کہ اگر تم لوگ میرے مراتب سے بے خبر ہو تو میرے نانا کے اصحاب ابھی زندہ ہیں۔ اُن سے پوچھو کہ میرے بارے میں کیا فرمایا تھا! ابھی سہل

ابن ساعدی موجود ہیں۔ اُن سے پوچھو کہ میرے بیان میں کس قدر صداقت ہے!

جس شخص کا نام روز عاشور لیا تھا، وہ اتفاق کی بات دیکھئے، یہ شام کے شہر سے گزرتے ہوئے بیت المقدس جا رہے تھے۔ جب شام سے ان کا گزر ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ شہر سجا ہوا ہے اور آئینہ بندی ہو چکی ہے۔ شہر کی رونق بڑھا دی گئی ہے۔ وہ تو مسافرت میں تھے۔ لوگوں سے پوچھا کہ آج کوئی عید تو نہیں ہے، پھر یہ شہر کیوں سجایا گیا ہے؟

لوگوں نے کہا کہ تو مرد مسافر معلوم ہوتا ہے۔ ایک لٹا ہوا قافلہ جو حکومت کا دشمن تھا، وہ لاوارثوں کا قافلہ، بیواؤں اور یتیموں کا آج شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ اُن کے آنے کی خوشی ہے۔ یہ اُن کے تباہ حال پر جشن منایا جا رہا ہے۔

سہل کہتے ہیں کہ میں پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ قافلہ کہاں ہے اور کن لوگوں کا ہے تو اتنے میں وہ قافلہ نمودار ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ میں نے جو اس قافلہ کو دیکھا تو عجب شان تھی۔ اس قافلہ کی آمد اس شان سے ہوئی کہ آگے آگے ایک بلند نیزہ ہے۔ اس پر کسی کا سر خاک و خون میں آلودہ ہے۔ دیکھتا ہوں مگر پہچان نہیں سکتا۔

اس مقام پر ایک عجیب لفظ ہے:

"يَقْطَعُ نُوْرٌ مِنْ فِيْهِ كَنُوْرِ رَسُوْلَ اللّٰهِ".

چہرہ دیکھ کر پہچان تو نہیں سکا مگر دیکھتا ہوں کہ کبھی کبھی اُن کے لبوں سے ایک شعاع نور نکل رہی ہے۔ وہ نور جو میں نے کبھی کبھی رسولؐ کے بھی لبوں سے نکلتا دیکھا تھا، وہ نیزہ آگے آگے ہے اور اُس کے پیچھے قیدی ہیں۔ ایک طوق میں جکڑا ہوا، بیڑیاں پہنے ہوئے، اُس کے ہاتھ گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے اور اُس کے

بندھے ہوئے ہاتھوں میں کچھ ناقوں کی مہار بندھی ہوئی تھی۔ اُن ناقوں کی جن پر کچھ بیبیاں تباہ حال بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ناقوں کی مہار بندھی ہوئی تھی۔

سہل کہتے ہیں کہ میں اس بیمار وزار قیدی کے پاس پہنچا اور پوچھا:

"مِنْ اَیِّ قَوْمٍ اَنْتُمْ"۔

اتنی زحمت دوں گا کہ آپ بتا دیں کہ آپ کس قوم سے ہیں؟

اُس سوال کا سننا تھا کہ بیمار نے سر اُٹھا کر سوال کرنے والے کو دیکھا اور دیکھ کر جواب میں فرمایا: "سہل! تم نے پہچانا نہیں؟"

یہ سننا تھا کہ سہل ساعدی کے حواس پریشان ہو گئے اور سوچا کہ میں نے انہیں پہچانا نہیں اور انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ شرمندہ ہونے لگے۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا: "سہل! شرمندہ ہونے کی وجہ نہیں ہے، تمہارا ہمیں نہ پہچاننا شکایت کے قابل نہیں، اس لئے کہ آج سے پہلے تم نے ہمیں طوق پہنے کہاں دیکھا تھا؟ آج سے پہلے یہ بیڑیاں گھسیٹے ہوئے کہاں دیکھا تھا؟ اس قید و بند میں آج سے پہلے کہاں دیکھا تھا کہ آج تم ہمیں پہچان لیتے؟ مگر سہل! ہم نے تمہیں پہچان لیا ہے"۔

سہل نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "جلد بتایئے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں کے ہیں؟ کس خاندان کے ہیں؟"

امامؑ فرماتے ہیں: "تابِ ضبط لا کر سننا۔ دل کو، جگر کو سنبھال کر سننا۔ میں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں"۔ پھر فرمایا:

"اَنَا ابْنُ مَكَّةَ وَمِنٰى، اَنَا ابْنُ زَمْزَمَةَ وَصَفَا، اَنَا ابْنُ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰى، اَنَا ابْنُ عَلِيِّ نِ الْمُرْتَضٰى، اَنَا ابْنُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَا، اَنَا ابْنُ الْحُسَيْنِ الشَّهِيْدِ بِكَرْبَلَا"۔

''ارے! میں مکہ اور منیٰ کا وارث ہوں، زمزم وصفا کے مالک کا بیٹا ہوں''۔

جب سہل نے سنا تو منہ پیٹ لیا۔ عرض کیا:

''یا سیدؑ! کاش آج میں نابینا ہوتا اور آپؑ کو ان آنکھوں سے نہ دیکھتا۔ بتایئے کہ میں کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

یہ جملہ ذرا توجہ کے لائق ہے!

امامؑ فرماتے ہیں: ''اگر خدمت کرنا چاہتے ہو تو کوئی پارچہ ہو تو دے دو''۔

سہل نے سر کا عمامہ اُتارا اور اس کا ایک ٹکڑا امامؑ کو پیش کیا۔ امامؑ نے کہا:

''سہل! کسے دے رہے ہو جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں؟''

سہل نے عرض کیا: ''پھر کیا کروں؟''

امامؑ نے فرمایا: ''اسے تہہ کرلو اور ذرا میرا طوق اُٹھا کر اس پارچہ کو طوق کے نیچے رکھ دو''۔

سہل کہتے ہیں کہ میں نے پارچہ کو تہہ کرلیا اور طوق کے نیچے رکھنے کیلئے ہلایا تو میں نے وہ کچھ دیکھا جو کبھی نہ بھول سکا۔ دیکھا تو کیا دیکھا کہ طوق کے آہنی حلقوں سے روئے اقدس ایسا زخمی ہے کہ خون کی چادر پشت پر رواں ہے۔ میں نے وہ پارچہ تو طوق کے نیچے رکھ دیا مگر چیخیں مار کر بیہوش ہو گیا۔

❁❁❁

پانچویں مجلس

پنجم

تسلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا. لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ. اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ".

"مومن مردوں میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کو سچ کر دکھایا اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو (ایفائے عہد) کے منتظر ہیں اور انہوں نے (جو عہد کیا تھا) اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی۔ اللہ ان صادقین کو اُن کی صداقت کی بہترین جزا دے گا اور وہ ضرور منافقین پر عذاب نازل کرے گا"۔

(احزاب:23)۔

یہ وہ آیت ہے جس میں خلاقِ عالم اپنے مخصوص اور ممدوح بندوں کی اپنے مخصوص لہجہ میں مدح فرما رہا ہے۔ مدح سے اونچا ہمارے پاس کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لئے ہم زیادہ سے زیادہ مدح ہی کہنے پر مجبور ہیں۔ مگر اب وہ مدح جو اس وقت مجھے پسند ہے، وہ ایسی معراجِ کمال کی مدح ہے کہ اس مدح میں جو لفظ ہے، ممدوح کی طرح سے چنا ہوا ہے اور منتخب ہے اور معراجِ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔

فرمایا جاتا ہے:

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ"۔

"ایمان والوں میں سے کچھ مرد ہیں"۔

کچھ ہیں مردانِ طلب، مردانِ وفا۔

"صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ".

"جو سچ کر دکھاتے ہیں اُس معاہدے کو جو وہ خدا سے کئے ہوئے ہیں"۔

"فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ".

"کوئی اپنے عہد کو پورا کر چکا ہے اور کوئی اپنے عہد کو پورا کرنے کے انتظار میں ہے"۔

اُس کی نظر اس پر ہے کہ کب وقت آئے اور کب وہ اپنے عہد کو پورا کر سکے،

"وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا".

دوبارہ پھر اسی داستان کو مختصر لفظوں میں دُہرایا جاتا ہے کہ یہ ایسے عہد کو پورا کرنے والے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے عہد میں، وفائے عہد میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی۔ جس شان سے عہد کیا، اُسی شان سے اپنے عہد کو پورا کر دکھایا۔

"لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ".

"اللہ اُن صادقین کو اُن کی صداقت کی بہترین جزا دے گا"۔

"وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ".

"اور ضرور وہ منافقین پر عذاب نازل کرے گا"۔

ہاں! ہمارے عذاب سے وہ بچ جائے گا جو اُس گروہ سے توبہ کرتا ہوا نکل آئے گا۔ دیکھنے میں یہ آیت ایک قول ہے مگر حقیقتاً یہ وہ آیت ہے جو دُنیا سے منوا رہی ہے کہ یہ کلام غیر خدا کا کلام نہیں ہے۔ یہ خود خدا کا کلام ہے۔

میں انشاء اللہ اُس طرف آؤں گا۔ سب سے پہلے یہ کہوں گا کہ خداوند عالم نے یہاں ایمان کو ایمان والوں کا قول نہیں قرار دیا بلکہ یہاں خلاقِ عالم اپنی ہی سرکار قبولیت سے کچھ عہد کرنے والوں کو موفیت کی سند دے رہا ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ اگر خداوند عالم یہ فرمائے "اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا" "وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں" تو مراد یہی ہے کہ وہ ایمان اپنی دانست میں لائے ہیں۔ ایمان لانا اُن کا دعویٰ ہے۔ اس دعوے پر ابھی ہماری مہر تصدیق ثبت نہیں ہوئی۔ ایک تو کسی گروہ کو "اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا" کے لفظوں سے پکارا جائے اور ایک اس کے مقابلے میں یہ طریقہ کہ خدا مومنین کہہ کر انہیں یاد کرے!

میرا آپ حضرات کو اور آپ کا مجھے مومن کہنا کتنا آسان ہے۔ جب پکاروں گا مومنین کہہ کر! جب خطاب کروں گا، مومنین کہہ کر! بہت آسان ہے میرا آپ کو مومن کہنا۔ اس لئے آسان ہے کہ میں ظاہر کو دیکھتا ہوں اور باطن میری نظر میں نہیں ہے۔ چونکہ میں ظاہر بین ہوں، اس لئے مجھے بڑی آسانی ہے۔

اس مقام پر ایک فقہی مسئلہ بیان کرتا چلوں۔ میرے لئے اور آپ کیلئے کسی ایک چیز کا پاک ہونا بہت آسان ہے۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک کسی چیز کے پاک ہونے کا معیار صرف یہ ہے کہ ہر وہ چیز ہمارے لئے پاک ہے جس کی نجاست کا ہمیں علم نہ ہو۔ ہمارے لئے زیادہ چیزیں پاک اس لئے ہیں کہ ہم لاعلم ہیں۔ ہماری یہ بڑھتی ہوئی لاعلمی، بڑھتی ہوئی پاکیزگی کے احکام فراہم کر رہی ہے۔

یہاں سے اندازہ لگائیے کہ جتنا کوئی لاعلم ہوگا، اتنی ہی وہ چیز اس کیلئے پاک ہوگی اور جتنا کوئی باعلم ہوتا چلا جائے گا، اتنی ہی چیزیں اس کیلئے زیادہ نجس قرار پاتی چلی جائیں گی۔

بہت سی چیزیں آج بھی ایسی ہیں جن کو صاحبان نظر نے بنتے دیکھ لیا ہے اور وہ چشم دید بتاتے ہیں کہ فلاں چیز اس طریقے سے بنائی جاتی ہے، فلاں فلاں چیزوں

سے بنائی جاتی ہے۔ وہ چیزیں میری نظر سے نہیں گزریں۔ اُن کے بیان کو قبول کرنے کیلئے شرعاً میں مجبور بھی نہیں۔ جن کے سامنے وہ سرگزشت آچکی، اُن کے سامنے وہ چیز نجس ہے، میں لاعلم ہوں، گھر بیٹھنے والا، نہ میں نے کارخانے دیکھے، نہ چیزیں بنتی ہوئی دیکھیں، نہ میرا اُدھر گزر۔ جتنی میری لاعلمی ہے، اُتنی ہی میرے لئے پاکیزگی ہے۔ لاعلمی کا فائدہ ہے پاکیزگی۔ جتنا کوئی اشیاء کے حقائق اور مراتب سے بے خبر ہو گا، اُتنا ہی وہ زیادہ سے زیادہ اُس کی پاکیزگی کا فائدہ اُٹھا سکے گا۔ لیکن جتنا علم بڑھتا چلا جائے گا، اُتنی ہی پاکیزگی کم ہوتی چلی جائے گی۔

اب یہاں سے اندازہ لگائیے کہ جو حقیقتاً علم والے اور حقائق کے جاننے والے ہیں اور واقعات اُن کی نظر سے نہ چھپنے والے ہوں، اب اُن کیلئے آسان نہیں ہے کہ ہر ایک کو مؤمن کہہ دیں۔ میں لاعلم تھا، میں نے آپ کو مؤمنین کہہ دیا۔ آپ لاعلم تھے، اپنی لاعلمی کی بناء پر آپ نے مجھے مؤمن سمجھ لیا۔

مگر آپ سے کہوں کہ حضرت عباسؑ کی قسم کھائیے کہ میں مؤمن ہوں۔ یہیں سے آپ ڈھیلے ہو جائیں گے کہ ظاہر سے ہمارا تعلق ہے، باطن کا علم اور حال تو ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ظاہر میں جسے چاہے مؤمن کہہ دیں اور کہنے کا شوق بڑھ جائیں تو جسے چاہیں امیرالمؤمنین کہہ لیں۔

لاعلمی نے یہ سہولتیں ہم پہنچا دی ہیں۔ اگر علم ہوتا تو مؤمن کہنے میں بھی تکلف ہوتا، تامل ہوتا، تہور ہوتا۔ یہاں سے اندازہ لگائیے کہ باعلم کا مؤمن کہنا کتنا مشکل اور بے علم کا مؤمن کہنا کتنا آسان ہے۔

پھر ہماری یہ آسانی اور بڑھ گئی کہ ہم نے ظاہر کو دیکھا، باطن کو نہ دیکھا۔

ہماری آسانی علم کے نہ ہونے سے بڑھی۔ علم ہٹا، آسانی بڑھی۔ ہم نے ظاہر کو دیکھا۔ باطن سے مجھے بحث نہیں۔ اگر ہمارا کہا ہوا کسی وقت مومن نہ نکلے، آپ ہم پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ اگر کریں گے تو ہم شوق سے جواب دیں گے کہ کیا ہم عالم الغیب تھے؟ نہیں، ہم تو صرف ظاہر بین تھے۔ ہم نے کب دعویٰ کیا کہ ہم باطن کو جاننے والے ہیں اور سینوں میں چھپے ہوئے راز کو سمجھنے والے ہیں؟ ہمارا تو یہ دعویٰ ہی نہیں ہے۔ ہم نے تو ظاہر کو دیکھ کر مومن کہا۔ پھر ظاہر بھی کتنا دیکھا؟

آپ اب مجھے دیکھ رہے ہیں مگر آپ کو کیا معلوم کہ کل میں کیا تھا؟ میرے ماضی پر آپ کی نظر کہاں ہے؟ میں کیا تھا؟ کس رنگ میں تھا؟ کس ڈھنگ میں تھا؟ کس شغل میں مَیں نے زندگی گزار دی؟ میں پہلے کیا تھا، اب کیا ہوں؟ آپ کو خبر نہیں۔ ایک وقتی صورت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ اس وقت میں اچھے لباس میں ہوں (ماحول کے اعتبار سے نقطہ نگاہ سے یہ لفظ استعمال کیا ہے)، میں اس وقت اچھی شکل وصورت میں ہوں، اچھے ماحول میں ہوں۔ آپ اچھا سمجھ رہے ہیں مگر اس وقت کیلئے بھی آپ ظاہر بین ہیں، باطن میں نہیں ہیں۔ اس سے پہلا نہ ظاہر آپ کے سامنے ہے، نہ باطن آپ کے سامنے ہے۔ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں کہ میں کیا ہوں مگر آپ کی نظر اس پر نہیں کہ میں کیا تھا۔

یہاں آپ رُک کر غور کر لیں کہ جب کیا تھا، اُس پر نظر نہیں ہے تو اس پر کیا نظر ہو سکتی ہے کہ میں کیا بنوں گا، کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا؟ میرا آئندہ کیسا ہے؟

حضرات! بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ انسان یوں بدل جاتا ہے کہ پل بھر میں ہزاروں برس ملائکہ کے جھرمٹ میں رہنے کے بعد ایسے نکلے۔ بدلنے والے یوں

بدل جاتے ہیں۔ اپنی جگہ سے نکل پڑے۔

وہاں تو نکالے جانے والوں کا ذکر تھا اور یہاں مجھے خود سے نکلنے والا یاد آیا۔

اپنے گروہ سے نکل بیٹھا اور بس اتنا کہا:

"هَلْ لِیْ مِنْ تَوْبَة".

فرزند رسولؐ! یہ پوچھنے آیا ہوں کہ جو جرم میں نے کیا تھا، کیا اُس جرم کی توبہ ہو سکتی ہے؟

صاحبانِ نظر میری تائید کریں گے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ جنابِ حر نے یہ عرض کیا ہو کہ سرکار! میں توبہ کرتا ہوں۔ وہ وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ ایک مسئلہ تھا: "هَلْ لِیْ مِنْ تَوْبَة" کسی صورت سے بھی میری توبہ ممکن ہے؟

یہ خیال تھا کہ امام توبہ کے معنی بتائیں گے۔ جواب میں یہ ارشاد فرمائیں گے کہ توبہ پذیر جرم ہے یا نہیں! اس جرم کی توبہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ جب یہ فرمائیں گے کہ توبہ ہو سکتی ہے تو میں عرض کروں گا کہ میں توبہ کرتا ہوں۔ مگر ابھی یہ عالم نہ تھا۔

اُدھر سے جواب مل گیا، بگڑا ہوا مقدر بن گیا۔ جواب مل گیا:

"اَنْتَ حُرٌّ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَة".

میں اپنے یقین سے یہ سمجھتا ہوں کہ امامؑ نے اس مقام پر امامت کے حق کو برتا ہے۔ اختیارِ امامت کو اس وقت کام میں لائے ہیں۔ جو بات خدا کے کہنے کی تھی، وہ امام حسینؑ نے کہی۔ یہ جواب نہیں دیا کہ توبہ ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہر مفتی جواب دے سکتا ہے، اگر وہ حقیقتِ مسئلہ کو جانتا ہو۔ یہ جواب تو مفتی کی حیثیت سے ہے۔ مگر امام مفتی بن کر جواب نہیں دیتے۔ وہ بات کہتے ہیں جو خدا کے کہنے کی ہے، اس لئے کہ حجتِ

خدا ہیں۔ حجتِ خدا بن کر جواب دیا:

''دُنیا میں تو تیرا نام حر ہے ہی، ہم نے آخرت کے اعتبار سے بھی تجھے حر قرار دے دیا''۔

واقعاً خدا کے دین کا کیا ذکر ہو سکتا ہے، ان حضرات کے کرم کا کیا ذکر ہو سکتا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ خاصِ آلِ عبا، ہماری جانیں اُن پر قربان ہو جائیں، اُنؑ کے نام پر، اُنؑ کے کام پر، اُنؑ کے وقتِ آخر کے سلام پر، خاصِ آلِ عبا کے متعلق، ہماری نگاہیں ان واقعات کو دیکھے ہوئے ہیں، سائل آپؑ کے پاس آتے تھے، اپنی حاجت زبانی عرض کرنے کی بجائے حاجت لکھ کر لاتے تھے اور اپنے مکتوب معروضہ کو امامؑ کی خدمتِ عالیہ میں پیش کرتے تھے۔ نوشتہ کو جب امامؑ لے لیتے تو فوراً فرما دیتے:

''حَاجَتُکَ مَقضِیَّۃٌ''

''تیری حاجت پوری کر دی جائے گی، ہم ذمہ دار ہیں''۔

فقرے کے صحیح معنی تو یہ ہیں کہ تیری حاجت پوری کر دی جائے گی۔ تیرا سوال تجھے عطا کر دیا گیا اور اُس کے بعد حاجت کو پڑھتے تھے۔ پوچھنے والے نے پوچھا ہے کہ سرکارؑ نے جواب دے کر، قبول فرما کر عرضی کو پڑھنا کہ یہ کیا ہے؟ ظاہر بظاہر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ پڑھنے کے بعد آپؑ جواب دیتے۔

اللہ، اللہ! ضمیر کی پاکیزگی کا یہ عالم ہے اور کیا لطافت ہے محامد کی! ارشاد فرماتے ہیں کہ میں گوارا نہیں کرتا کہ جب تک میں اس کے رقعہ کو پڑھوں، اُس وقت تک سائل اُمید و بیم کے عالم میں رہے اور یہ سوچتا رہے کہ نہ معلوم مجھے جواب یہ ملے گا یا وہ ملے گا۔ میرے سوال کے جواب میں ''لا'' کہا جائے گا یا ''نعم'' کہا جائے گا۔ نہ

جانے میری حاجت پوری ہوگی یا نہیں۔ میرا سوال قبول کرلیا جائے گا یا رد کردیا جائے گا۔ مجھے پورا ملے گا یا کچھ کم ملے گا۔ اس تذبذب میں، اس اُمید و بیم کے عالم میں میرے سامنے کھڑا رہنا مجھے گوارا نہیں ہوتا۔

حضرات! میرا دل کچھ کہنے کو تڑپ رہا ہے۔ شاید آپ بھی پہنچ گئے ہوں اس نقطہ تک۔ اتنی دیر جو سائل کو اُمید و بیم میں نہ رکھنا چاہے، ایک دن آیا اور اُس کو بھی سوال کرنا پڑا۔ اس مسئول عالم کو بھی سوال کرنا پڑا اور کس کیلئے؟ اپنے لئے نہیں، کسی دم توڑتے بچے کیلئے یعنی علی اصغرؑ، بے شیر کیلئے۔ کربلا کے علاوہ اپنے سوگواروں کو کہیں نام لے کر کسی وقت بھی یاد نہیں کیا۔

یہ جملہ توجہ سے سننے کے لائق ہوگا۔ کسی وقت اپنے آئندہ سوگواروں کو یاد نہیں کیا۔ بڑے بڑے مہم واقعات سامنے آئے اور کربلا کا تو ہر واقعہ عظیم ہے۔ کونسا واقعہ کربلا کا ایسا ہے جو آسانی سے گزر گیا ہو؟ پیاس ہی کو لیجئے، قربان ہو جائیں ہماری جانیں اُن سوکھے ہوئے ہونٹوں پر اور زبان پر سوجھے ہوئے کانٹوں پر! قربان ہو جائیں ہماری جانیں اُس قلب و جگر پر جس کے متعلق امامؑ کا ارشاد ہے:

''میرا جگر پیاس سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا''۔

اے فلک کج رفتار! کیا جگر کے ٹکڑے ہونا اُنہی دو بھائیوں کا حصہ تھا؟ کسی کا جگر اس طرح ٹکڑے ہوا کہ اُسے کچھ پلا دیا گیا۔ ایک کا جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوا کہ اُس پر پانی بند ہوا، ایک جگر پلانے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور ایک کا جگر پیاسا رہنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔

حضرات! کربلا کی جو مہم ہے، ہم چاہے اس کو مہم کے تصور سے، گہری نظر

سے نہ دیکھیں اور یہ سمجھیں کہ ابھی ہمیں اس سے زیادہ مہم کو بھی دیکھنا ہے مگر حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کربلا کی ہر مہم اپنے مقام پر انتہائی اہم ہے۔ زینبؑ کی چادر کا چھن جانا، خدا کی قسم! اگر چادر کے چھیننے کی نوبت نہ بھی آتی اور کربلا کے واقعات میں صرف یہی ایک فقرہ آجاتا کہ کسی بے ادب نے چادر زینبؑ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا، بس اسی پر داستانِ غم ختم ہو جاتی۔

لہٰذا قیامت تک ہمیں رُلانے کیلئے یہی جملہ کافی تھا۔ چھینی یا نہ چھینی تو دُوسری بات ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ کسی بے ادب نے ہاتھ بڑھایا، چادر چھیننے کا ارادہ کیا۔ مگر اب کیا کہا جائے، ہر چیز اپنی آخری منزل پر ہے۔

حضرات! مجھے اپنے چوتھے امامؑ کا ارشاد یاد آ رہا ہے۔ ذرا آپ بھی سوچیں۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ خداوند عالم نے ہماری محبت کا حکم دیا تھا اور ہماری محبت کو رسالت کا اجر قرار دیا تھا۔ محبت کا حکم آنے پر تو ہمارے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر محبت کے حکم کی بجائے، خدا ہمارے بارے میں دُشمنی اور عداوت کا حکم دیتا تو پھر جتنا ظلم محبت کے حکم کے باوجود ہم پر ہوا، عداوت کے حکم پر، کونسا ظلم رہ گیا تھا کہ اگر اہل بیتؑ کے بارے میں عداوت کا حکم آتا تو ظلم کا یہ گوشہ رہ گیا تھا، جو اہل بیتؑ پر روا رکھا جاتا؟ یہ جرم نہ کیا گیا تھا، اُس کو بھی مزید بڑھا دیتے۔

مگر یہ تصور تو اُس وقت ہوتا کہ جب کوئی ظلم کا گوشہ چھوٹ گیا ہوتا، مثلاً یہ کہ قتل کر دیا، لاشوں کو چھوڑ دیا، دفن نہ کیا۔ اگر بے دفن لاشوں کو چھوڑ کر چلے جاتے، دفن کیے بغیر اور اس کا خیال کیے بغیر چلے جاتے تو اب ہمیں یہ کہنے کا موقعہ تھا کہ لاشوں کو چھوڑ دیا گیا۔ مگر یہی غنیمت ہے کہ اُن کو پامال نہیں کیا گیا۔ ان لاشوں سے تعرض نہ کیا

گیا۔ اگر محبت کا حکم نہ ہوتا تو اُن سے کیا بعید تھا کہ وہ لاشوں کو پامال نہ کرتے۔ اب کیا کہیں؟ کونسی چیز ہے جو اُن کے مظالم کو یاد کریں اور نظر آئے کہ ظلم کا یہ گوشہ باقی رہ گیا تھا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کربلا میں ہر مہم اپنی جگہ عجیب وغریب ہے۔ اگر ہر مہم پر نگاہوں کو روک دیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس مہم سے زیادہ سخت مہم اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ایک پیاس پر اگر اطمینانِ قلب سے توجہ کر لی جائے، پیاسے اور کون پیاسے؟ کس عالم میں پیاسے اور کس مہم میں پیاسے اور کب سے پیاسے اور کب تک پیاسے؟

تو ایک داستان نظر آئے گی۔ تیروں کا مینہ برس رہا ہے اور ایک ہی مرتبہ کی تیراندازی میں بہت سے امام کے ساتھیوں کی شہادت واقع ہوگئی۔ کتنی زبردست مہم ہے۔ پھر اُس کے بعد انصار کا جاں نثاری کا ولولہ۔ وہ امام کی طرف سے عنوانِ آزمائش اور امتحان۔

اللہ، اللہ! کیسے جاں نثار تھے! یہ معصوم تو نہیں تھے۔ یہ اقربائے خاص تو نہیں تھے۔ یہ سب علیؑ کی اولاد تو نہیں تھے۔ غیر تھے، بیگانے تھے۔ کوئی کسی قبیلہ کا تھا، کوئی کسی خاندان کا تھا۔ اُن میں بعض تو وہ بھی تھے جو ملکِ عرب کے رہنے والے بھی نہ تھے۔ جون کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ ملکِ حبش کے رہنے والے تھے مگر عاشور کے دن تو یہ نظر آرہا ہے کہ جو سینہ ہے، اُس سینے میں حسینؑ کا دل پہنچ گیا ہے۔ دل بدل گئے، عزم بدل گئے، مقام بدل گئے اور یہی وجہ ہے کہ ان مصائب کی طرف بغیر ارادے کے پہنچ گیا کہ بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

بدلنا اگر دیکھیے، گھڑی کی گھڑی میں، بگاڑ کی صورت میں شیطان کی مثال

ہے اور بننے کی صورت میں حر کی مثال ہے۔ کیسے تھے اور کیسے بن گئے!

حضرات والا! اسی بناء پر میں نے کہا تھا کہ پھر ہم کسی کو آسانی سے مؤمن کہہ دیں، ہمارے لئے موقعہ ہے۔ ظاہر کو دیکھا، باطن کو نہیں دیکھا۔ حال کو دیکھا، مستقبل کو نہ دیکھا، ماضی کو نہ دیکھا۔ مگر جن کی نگاہیں ماضی، حال اور ہر زمانہ پر ہوتی ہیں، جن کی نگاہیں ظاہر پر بھی ہوں، باطن پر بھی ہوں اور حد یہ ہے کہ عواقب اُمور سے باخبر ہوں، اب کتنا مشکل ہے کہ وہ کسی کو مؤمن کہہ دیں۔ اگر وہ کسی کو مؤمن کہہ دے تو پھر تو اُس کا ایمان وہ ایمان ہے جس پر ہر ایمان والے کا ایمان ہے۔ اب اُسے مؤمن ماننا مؤمن بننا ہے اور اب اُس کی مؤمنیت میں قیل وقال کرنا، خدا کی خدائی میں بحث کرنا ہے۔ خدا مؤمن کہے اور پھر بھی ہم مؤمن نہ سمجھیں۔

میں ایک جملہ اس مقام پر کہوں گا اور پوری توجہ چاہتا ہوں۔ بعض اُمور ایسے ہوتے ہیں کہ ہم مان لیں تو بجا اور اگر نہ مانیں تو بھی آخرت کی خرابی لازم نہیں آتی۔ آپ حضرات میں سے کوئی ڈاکٹر صاحب ہوں گے اور کوئی کچھ اور صاحب ہوں گے مثلاً حکیم صاحب ہوں گے۔ مان رہا ہوں کہ یہ ڈاکٹر ہیں، وہ حکیم ہیں۔ مان رہا ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن اگر نہ مانوں؟

ڈاکٹر صاحب! آج سے میں آپ کو ڈاکٹر نہیں ماننا چاہتا، حکیم صاحب! میں آج سے آپ کو حکیم نہیں مانتا۔ بتایئے! اس میں میرے لئے کونسا عذاب آخرت ہے اور کس بناء پر ہے؟ ان کا ڈاکٹر ماننا، ان کا ڈاکٹر ماننا ہے۔ خدا کو نہ اس سے بحث ہے کہ مانوں اور نہ اس سے بحث ہے کہ نہ مانوں۔ مان لیا تو کیا ہوا اور نہ مانا تو کیا ہوا؟ کوئی عذاب آخرت نہیں ہے جو ماننے پر یا نہ ماننے پر آئے۔ اس چیز کو نہ مان لینے

سے عذاب آخرت ہے اور نہ انکار کر دینے پر عذاب آخرت ہے۔ اُس کا ماننا بھی بے عذاب ہے اور نہ ماننا بھی بے عذاب۔

یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان کے پاس جو بھی سند ہوگی، وہ یہیں کی ہوگی، وہاں کی نہیں ہے۔ اگر وہاں کی سند ہوتی اور انکار کرتے تو کہاں کے رہتے؟ مگر چونکہ سند یہاں کی ہے تو ہمارا مان لینا بھی یہیں ختم ہے اور نہ ماننا بھی یہیں ختم ہے۔ اب وہ کیوں دیکھے کہ تم نے مانا تو کیوں مانا اور نہ مانا تو کیوں نہ مانا؟

لیکن اگر اُس نے سند دے کر بھیجا ہے اور اُس کے سند یافتہ کو کسی نے نہ مانا تو یہ انکار سند یافتہ کا نہیں ہے بلکہ سند دینے والے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن حضرات کا ماننا اُن کا ماننا نہیں ہے بلکہ خدا اور رسول کا ماننا ہے۔ سند خدا نے دی اور اُس کی دی ہوئی سند رسولؐ نے اپنے ہاتھوں سے اُن کی طرف بڑھا دی۔ خدا اور رسولؐ کی سند اُنؑ تک پہنچی۔ یہ مستند وہاں کی سند کے ہیں۔ جب مستند وہاں کی سند کے ہیں تو اب اُنؑ سے انکار کرنا کیا اُنؑ سے انکار کرنا ہے؟

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ان کو سند دینے والے کو ہی ہم باسند نہیں سمجھتے اور مستند نہیں سمجھتے۔ یہاں کی سندیں چاہے نہ مانیں لیکن اگر کسی کو نہ ماننے کا حکم ہو جائے اور وہاں سے آ جائے تو اس کے معنی ہیں کہ اُدھر سے سند سلب ہے۔ یعنی خدا کہے کہ اُن کو نہ کہا جائے اور پھر کہا جائے تو اس صورت میں بھی اُسی کا انکار ہوا (یعنی خدا اور رسولؐ کا) اور جو خدا کی طرف سے مستند ہو، اُس کا ماننا خدا کا ماننا اور اُس کا نہ ماننا خدا کا نہ ماننا۔ خدا جس کو نہ منوائے، اُس کا نہ ماننا خدا کا ماننا اور اُس کا ماننا خدا کا نہ ماننا ہوگا۔

ویسے رہی دعوتِ عام صلح کے اعتبار سے، تو جی چاہتا ہے کہ سب کو مان لوں

اور سب کو ماننے اور ماننے میں اتنی فراخدلی اختیار کیجئے کہ زمین کو مانئے، آسمان کو مانئے، بہتے ہوئے دریا کو مانئے، کوہِ گراں پیکر کو مانئے، انسان کو مانئے، وحوش وطیور کو مانئے، انس وجن کو مانئے، انعام وبہائم کو مانئے، سب کو مانئے اور میں اپنے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ میں سب کا ماننے والا ہوں۔ مؤمن کا بھی، کافر کا بھی، حسن کا بھی اور قبح کا بھی۔ اچھے کا بھی، برے کا بھی۔

آپ کیوں حیران ہو رہے ہیں؟ جو جیسا ہے، ویسا مانتا ہوں۔ خدا کسی کو مؤمن کہہ دے۔ اگر وقت کے اعتبار سے آزاد ہوتا تو اس کے متعلق کچھ کہتا۔

خداوند عالم الفاظ کے خرچ کرنے میں اتنا محتاط ہے کہ حق کے مقام سے ایک بال برابر اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اتنا ہی کسی کیلئے کہتا ہے جتنا اُس کا حق دیکھتا ہے۔ کاش! دیکھنے والے دیکھیں اور سمجھنے والے سمجھیں۔ کوئی خوش نصیب قرآن کی نظر میں تھا جس کو اُس نے مؤمن کہہ دیا۔

"قَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ".

آل فرعون میں ایک شخص تھا، خدا اُسے مؤمن کہہ رہا ہے اور اس واقعہ کے بعد کہہ رہا ہے:

"وَيَكْتُمُ اِيْمَانَهُ".

"اور وہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا"۔

اپنے ایمان کو چھپا رہا تھا۔ اُسے اپنی جان کا ڈر تھا۔ تو ہمیں کس کا ڈر ہے کہ خدا کہہ رہا ہے کہ وہ مؤمن تھا اور ہم اُسے مؤمن نہ مانیں! وہ خوش نصیب تھا جس کو مؤمن کہہ دیا گیا ورنہ قرآن میں بیشتر مواقع پر "اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا" کے الفاظ استعمال

کیے گئے ہیں۔ تو خدا کا کسی کو مؤمن کہہ دینا آسان تو نہیں ہے اور پھر (اپنے بیان کو بہت جلد سمیٹ رہا ہوں) مؤمن ہونا، اور خدا کی نظر میں، مؤمن ہونا، خدا کے نزدیک مؤمن ہونا بڑا مشکل ہے اور کسی کیلئے بڑا بلند مقام ہے۔ اگر وہ اُدھر سے لفظ مؤمن حاصل کرلے اور پھر:

"مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ"۔

"ہم نے اُن مؤمنین میں سے منتخب کیا ہے کچھ لوگوں کو جو مرد ہیں"۔

حضرات! عربی میں مذکر کے صیغے الگ ہیں، مؤنث کے صیغے الگ ہیں۔ مردوں کو تو مؤمنین کہیں گے اور عورتوں کو مؤمنات کہیں گے، مؤمنین کا لفظ استعمال نہ ہوگا۔ لہٰذا جب لفظ بھی عورتوں کیلئے الگ ہے تو میری سمجھ میں "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ" کے الفاظ نہیں آرہے، "مؤمنین میں سے کچھ رجال ہیں"۔

یا اللہ! مؤمنین تو سبھی رجال ہیں۔ مؤمنین تو جتنے بھی ہیں، سب رجال ہیں۔ رجال ہی کو تو مؤمنین کہتے ہیں۔ یہاں "مِنْ تَبْعِيْض" لگا کر "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ"، "ان میں سے بعض جو رجال ہیں"۔

یہ کیا ہوا؟ خاکم بدہن! میری گستاخی تو ہے جو میں اپنی زبان پر یہ لفظ جاری کروں مگر مؤمنین جو مردوں پر (رجال پر) مشتمل ہیں، ان میں سے رجال کو مختص کرنا بے سبب تو نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ لفظ رجال (ہماری زبان میں "مرد" کا لفظ) کبھی تو عورتوں کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے جیسے ہم جنازہ کو دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ یہ میت مرد کی ہے؟ یہاں دریافت کرنے سے مطلب نہ اُس کی شجاعت ہے اور نہ اُس کی

بہادری ہے، نہ اُس کے عزائم کی پختگی ہے، "یہ میت مرد کی ہے؟" پوچھنے کی غرض یہ ہے کہ عورت کی میت تو نہیں ہے؟

مگر یہی لفظ کبھی مردوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور جب مردوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے تو "شاہِ مرداں" جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لفظ جو کسی مرد کیلئے مردوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، وہ حقیقتاً مردوں ہی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور وہ مرد اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، مثلاً:

"کل میں علَم دوں گا ایک مرد کو"۔ حالانکہ جب بھی علَم دیا جائے گا، مرد ہی کو دیا جائے گا۔ یہاں مستورات کا ذکر ہی نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں "رجل" کا لفظ "نساء" کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مردوں کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔

پہلے مؤمن کا ذکر ہوا، پھر اُن میں سے مردانِ وفا کا ذکر ہوا کہ:

"صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ"۔

"سچ کر دکھایا اُس وعدہ کو جو انہوں نے خدا سے کیا تھا"۔

اب یہ بڑا پُر لطف مقام ہے۔ خداوند عالم نے یہاں عہد نہیں کیا، معاہدہ کیا ہے۔ "صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" "سچ کر دکھایا اس معاہدہ کو جو انہوں نے خدا سے کیا تھا"۔ آپ کہیں گے کہ عہد اور معاہدہ میں کیا فرق ہے؟ جی بہت بڑا فرق ہے۔ عہد یک طرفہ ہو سکتا ہے مگر معاہدہ یک طرفہ نہیں ہو سکتا۔

میں تقریر کر رہا ہوں، آپ سننے والے ہیں۔ اسے کون عقل مند مکالمہ کہے گا؟ صاحب! مکالمہ وہاں ہو رہا ہے، یہ مکالمہ کہاں ہو رہا ہے؟ گفتگو تو میں کر رہا ہوں، آپ تو صرف سن رہے ہیں۔ تو جب عمل ایک جانب سے ہوگا تو باب مفاعلت کا

استعمال وہاں نہیں ہو سکتا۔ وکیل اگر عدالت میں بحث پیش کر رہا ہے تو بحث تو اُس کو کہہ سکتے ہیں مگر اُسے مباحثہ نہیں کہہ سکتے۔ وہی تو سنا رہا ہے، اُسے تو نہیں سنایا جا رہا۔

ایک شخص نے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ قتل کا لفظ تو استعمال ہو سکے گا، مقاتلہ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا کیونکہ جب جانبین سے قتل ہو تو اس وقت مقاتلہ کا لفظ استعمال ہوگا۔

مشاعرہ جب کہا جائے گا جب جانبین سے شعر پڑھے جائیں۔ مباحثہ اُس وقت کہا جائے گا جب دونوں جانب سے بحث ہو۔ لہٰذا معاہدہ کب کہا جائے گا؟ اُس وقت جب یہ عہد کرے اِس سے اور وہ عہد کرے اُس سے۔

تو خداوند عالم لفظ ''معاہدہ'' استعمال کر رہا ہے۔ اس لئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے خدا سے عہد کیا اور خدا نے بھی اُن سے عہد کیا۔ خدا کا عہد ان کے حق میں، اُن کا عہد خدا کے حق میں۔ یہ اپنے عہد کے ذمہ دار ہیں، وہ اپنے عہد کا ذمہ دار ہے۔ عہد جانبین سے ہوا ہے۔ خدا کا عہد ان کے حق میں اور ان کا عہد خدا کے حق میں۔ یہ اپنے عہد سے ہٹنے والے نہیں۔ پھر خدا تو خدا ہی ہے۔ وہ اپنے عہد سے ہٹ جائے تو پھر اپنے عہد پر کون رہے؟

ان حضرات نے خدا سے جو معاہدہ کیا، اُس کو سچ کر دکھایا۔ چونکہ یہ عہد خدا سے ہے، لہٰذا یہ معاہدۂ اطاعت ہے۔ تو کیسا ہی مقام آ جائے مگر ہم تیرے سوا کسی کی اطاعت نہیں کریں گے۔ تیرے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ اب تیرے سوا کسی کی اطاعت نہ کریں گے۔

بکنے کیلئے عربی میں لفظ ''بیعت'' ہے۔ اُن کا عہد جو خدا سے ہے، وہ یہی کہ

جو کچھ ہم پر گزرے، ہم راہِ استقامت پر رہیں گے، راہِ وفا پر رہیں گے، راہِ اطاعت پر رہیں گے۔ ہماری نظر تیرے حکم پر رہے گی۔ ہم پر کچھ گزر جائے، اس کی پرواہ نہیں۔ تیری اطاعت کا راستہ ہم نہیں چھوڑ سکتے۔

جو عہد کیا گیا تھا، اُس کی تعریف کی جا رہی ہے، اُسے پورا کر دکھایا۔ مگر عہد تو ہوا ہی نہیں، یہاں تو معاہدہ ہوا ہے یعنی اُن کا عہد خدا کیلئے اور خدا کا عہد اُن کیلئے۔ تو اب ان کا عہد تو ہے عہدِ اطاعت، خدا کا عہد کیا ہے؟ میرا اپنی جانب سے کچھ کہنا قیاس آرائی سے کام لینا ہے اور کمزوری کی بات ہے۔ اس لئے اِدھر اُدھر کیوں جایا جائے، قرآن کی آیت نہ معلوم کتنی دفعہ سنی ہوگی!

"وَاِذِابْتَلٰی اِبْرَاهِيْمَ بِكَلِمَاتٍ".

"ربِ ابراہیمؑ نے ابراہیمؑ کا چند بار امتحان لیا"۔

دفعات میں امتحان لیا یا چند چیزوں میں امتحان لیا۔ بہرحال امتحان ہوا۔

"فَاَتَمَّهُنَّ".

ان امتحانات کو ابراہیمؑ نے تکمیل تک پہنچا دیا اور مکمل کامیابی حاصل کر لی۔

"قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا".

تو پروردگار نے فرمایا: اے ابراہیمؑ! اب میں نوعِ انسان کی ہدایت کیلئے تمہیں امام قرار دے رہا ہوں۔

"قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِیْ".

اس وقت حالانکہ حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ کچھ کہلانے والا کوئی نہیں تھا مگر یہ نبی کے دل کی بات ہے کہ فوراً آپؑ نے بارگاہِ خدا میں عرض کیا: "بارالٰہا! اور میری

اولاد میں سے!"

اور میری ذریت میں سے! اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کو صرف ذریت یاد آئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ذریت کیلئے کیا چاہتے ہیں؟ وہی چیز تو چاہتے ہیں جو خود پا چکے ہیں۔ اور خود کیا پا چکے؟ وعدہ پروردگار!

"اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا".

جو امامت خود پائی ہے، اُسی امامت کا تو سوال کیا ہے کہ بارالٰہا! اور میری اولاد میں سے"۔ جواب آتا ہے:

"لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ".

"میرا عہد ظالموں تک نہیں پہنچے گا"۔

تو خدا نے اپنا عہد کس چیز کو کہا؟ وہی چیز جو ابراہیمؑ نے اولاد کیلئے چاہی۔ اولاد کیلئے وہ چیز چاہی جو خود پائی۔ وہ کیا ہے؟ اُسی امامت کا سوال کیا۔ اُسی امامت کا جواب پایا۔ اُسی امامت کو اللہ نے اپنا عہد قرار دیا۔ "عہدی" کا لفظ استعمال کیا یعنی میرا عہد (امامت میرا عہد ہے)۔

لہٰذا واضح ہوا کہ اُن کا عہد جو خدا سے ہے، وہ عہد، عہدِ اطاعت ہے اور اُس کا عہد جو اِن سے ہے، وہ عہدِ امامت ہے۔ نہ اُن کی اطاعت خدا کے علاوہ کسی اور کیلئے اور نہ خدا کی امامت اُن کے سوا کسی اور کیلئے۔

میرے بندو! جب تم اپنے عہد سے ہٹنے والے نہیں تو میں خدا ہو کر اپنے عہد سے ہٹ جاؤں؟ بندوں کی کمزوریوں کے باوجود، سختیوں کے اُٹھانے کے باوجود، شدائد و آلام کو سہنے کے باوجود جب تم اپنے عہد سے نہ ہٹے تو مجھے تو کوئی اذیت پہنچا

سکتا ہے، نہ مجھے کوئی زخمی کر سکتا ہے۔ نہ مجھے کچھ کھانا ہے، نہ پینا ہے کہ کوئی مجھ پر پانی بند کر سکے۔ نہ میں مجسم ہوں کہ کوئی مجھے باندھ سکے اور اذیت دے سکے۔

جب تم اپنی بندگی کی کمزوریوں کے باوجود اپنے عہد سے ہٹنے والے نہیں تو میں اپنی قدرت کے کمال کے باوجود اپنے عہد سے کیسے ہٹ جاؤں گا؟ یہ تو میرے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہے۔ تم اپنے عہد پر قائم ہو، میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔

جب آپ نے اتنی زحمت کر ہی لی ہے تو مجھے ایک آیت یاد آ رہی ہے، فرمایا جاتا ہے:

"اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ"۔

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دینا چاہتے ہیں جبکہ اللہ اپنے عہد کو مضبوط کر چکا ہے"۔

"وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ"۔

"اور لوگ چاہتے ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے بلا فصل قرار دے کر وصل کر دیا ہے، فصل در معقولات کر کے اس سلسلہ کو منقطع کر دیا جائے"۔

اور اُس چیز کو قطع کرنا چاہتے ہیں جس کے متعلق خدا کا امر نافذ ہو چکا ہے کہ اُسے ملا جلا ہی رکھا جائے۔ اللہ اس کے بعد نہیں کہنا چاہتا ہے کہ ایسا ارادہ رکھنے والوں کیلئے کیا جزا ہے۔

بہر حال یہاں بھی پتہ چلتا ہے کہ عہد خدا کو توڑنا چاہتے ہیں، وہ عہد کیا ہے؟

"لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ"۔

"میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا"۔

ظاہراً یہی وہ عہد ہے کہ:

"اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا".

جس کے بارے میں ارشاد ہو چکا۔ یہی وہ عہد ہے جس کے متعلق قیامت میں سوال کیا جائے گا اور یہی وہ عہد ہے جس کے متعلق فرمایا جاتا ہے:

"اَوْفُوْا بِعَهْدِيْ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ".

"تم میرے عہد کو وفا کرو، میں تمہارے عہد کی وفا کروں گا"۔

بہرحال یہ اسی معنی میں ہے کہ جہاں امامت کا تعین ہو گیا اور امامت کا متعین ہونا ہی عہد خدا ہے۔ اُسے توڑا نہیں جا سکتا۔ توڑنے والا خود ہی ٹوٹ جائے گا مگر عہد شکستہ نہیں ہو سکتا۔

بہرحال میں اپنے بیان میں آگے بڑھتا ہوں اور ختم کرتا ہوں۔ اُنہوں نے سچ کر دکھایا اُس عہد کو جو خدا سے کیا تھا۔ یہ بیان کا عجیب عنوان ہے۔ ایک تو ہے عہد کو پورا کرنا اور ایک ہے اپنے عہد کو سچ کر دکھانا۔ یہ قول کہ "سچ کر دکھایا"، عجیب لہجہ ہے۔ یہ وہی لہجہ ہے جو جناب حضرت ابراہیمؑ کیلئے اختیار کیا گیا تھا۔

"صَدَّقْتَ الرُّؤْيَاءَ".

"تم نے خواب کو سچ کر دکھایا"۔

تو اب میں اپنے بیان کو بعینہٖ اپنے لفظوں میں بیان کروں تو آزادی سے کہہ سکتا ہوں کہ "سچ کر دکھایا" کے الفاظ اُسی جگہ استعمال ہوتے ہیں جہاں کوئی بات یا عہد یا اقرار اس انداز کا ہو کہ سننے والے جب سن رہے ہوں تو سننے والے کے دل میں سنتے ہوئے اور اس عہد کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو کہ باتیں تو ہو رہی

ہیں مگر یہ ہو تو نہیں سکتا۔ کہا تو جا رہا ہے مگر اسے پورا تو نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بس برائے گفتن ہی ہے۔ کہا جا رہا ہے، بھلا یہ باتیں کہیں پوری ہونے کے لائق ہیں؟

ایسی چیز جب مقامِ وفا میں آجائے، وہاں لہجہ تعجب میں کہا جائے گا کہ اُس نے تو سچ کر دکھایا۔ یعنی لب ولہجہ بتلا رہا ہے کہ یہ عہد اتنا سنگین ہے کہ اس کو پورا کر دکھانا بے حد دُشوار تھا مگر اس کو پورا کر دکھایا گیا۔ یعنی اگر تم لوگ جو باخبر نہیں ہو، اُس عہد کے وقت عہد کرنے والوں کے بیان کو سنتے تو یہی سمجھتے کہ عہد پورا ہونے والا نہیں ہے۔ یہ سچ ہو جانے والا نہیں ہے مگر عہد کے کرنے والے ایسے صادق اور اپنے وعدہ پر قائم نکلے کہ جو بات بظاہر ہونے والی نہ تھی، وہ ہونے والی قرار پا گئی اور اُسے سچ کر دکھایا گیا۔ اس کے بعد پھر دوبارہ تاکید کی جاتی ہے:

"وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً".

"اور اُنہوں نے کچھ بھی تبدیلی نہ کی"۔

میرے بیان کو طول ہو رہا ہے مگر یاد رکھئے کہ مفعولِ مطلق، فعل کا دوبارہ آنا، کبھی مثبت پر آتا ہے، کبھی منفی پر آتا ہے۔

"يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً".

مفعول مطلق ہے۔

"وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً".

یہ بھی مفعولِ مطلق ہے۔ مگر مثبت و منفی میں بڑا فرق ہے۔ جب مثبت پر مفعولِ مطلق آتا ہے تو وہ مثبت بدرجہ کمال ہوتا ہے۔ ایسا پاک رکھنا جیسا پاک رکھنے کا حق ہے یعنی پاک رکھنے کا عنوان ہٹا ہوا نہیں رہے گا۔ کوئی کسر باقی نہ رہے گی اور جب

نبی پر آئے گا:

"وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا".

"انہوں نے کچھ بھی تبدیلی نہیں کی"۔

یہاں مفعول مطلق ہو کر ایک ایک جزو پر محیط ہوگا۔ نفی کی صورت میں تو واقعاً یہ حصرِ نبی افراد کا ہے۔ مثبت میں مفعولِ مطلق ہو تو اُن کے بارے میں، منفی میں ہو تو اُن کے بارے میں۔ طہارت کا کوئی درجہ اُن سے بچا ہوا نہیں ہے۔ تبدیلی کی صورت اُن سے واقع ہونے والی نہیں۔

اب تعریف کرنے کے بعد خدا فرماتا ہے۔ پروردگار کی ذات کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو کسی کے کارنامہ کو محض اُن کی مدح وثنا پر ختم کردے۔ یہ کوئی جزا تو نہ ہوئی۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اس آیت میں "وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" کے فوراً بعد ارشادِ پروردگار ہوا:

"لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ".

"جن صادقین نے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو انہوں نے خدا سے کیا تھا، اللہ ان سچوں کو، ان صادقین کو ان کے صدق کی ضرور جزا دے گا"۔

اگر میں اپنے مزاج کے مطابق ترجمہ یوں کردوں کیونکہ یہاں لامِ قید ہے:

"لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ".

تو اس کا ترجمہ بڑا زوردار بنتا ہے کہ "خدا تو ہے ہی اس لئے کہ ان صادقین کو ان کی صداقت کی جزا دے"۔ اُن کو بہتر سے بہتر جزا دے تو خدا ہے، ورنہ نہیں۔

اور جہاں اُن کو صداقت کی جزا ضروری ہے، اللہ ان صادقین کو اُن کے صدق کی ضرور بالضرور جزا دے گا، اگر خدا ہے۔

مجالس سنتے سنتے ہماری قوم کہیں پہنچ گئی۔ آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کہاں صادقین کا ذکر (جن کے متعلق میں کچھ ذکر کر ہی نہیں سکا) اور فوراً اسی جزو میں منافقین کہاں سے یاد آ گئے۔ یہ منافقین کے بیان کا کیا ربط ہے؟

ارشاد ہے کہ صادقین کو اُن کی صداقت کی جزا دوں گا اور منافقین پر اپنا عذاب نازل کروں گا، منافقین کو معذب کروں گا۔

تجھے اختیار ہے، مگر اے پروردگار! منافقین سے مطلب کیا ہے؟ اچھوں کیلئے، صادقوں کیلئے، اچھے الفاظ آ رہے تھے۔ اُن کے کارنامے بیان کئے جا رہے تھے، اُن کی مہمات کا سر کرنا بیان کیا جا رہا تھا۔ اُن کا ذکر خیر کیا جا رہا تھا۔ اُن کے ایفائے عہد کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ منافقین کا ذکر کیسا؟ اگر تجھے کرنا ہی تھا تو کافرین کا ذکر کیوں چھوڑ دیا؟ یہاں ذکر مشرکین یا ذکر کافرین کرتا۔ نہ تجھے مشرک یاد آئے اور نہ کافر؟ ایک دم یاد آئے یعنی "بَدَّلُوْا تَبْدِيلاً" کہنے کے فوراً بعد منافقین کو معذب کرنے کا ذکر ہو گیا۔ مشرکین کا نام کیوں نہیں لیا گیا اور کافرین کا نام کیوں نہیں لیا گیا؟ یہ منافقین کے ذکر کی خصوصیت کیا ہے؟

لہٰذا حضرات! ماننا پڑے گا کہ جس ایفائے عہد کی ثناء میں آیت آ رہی ہے اور عہد کرنے والے حضرات نے جن مظالم کو برداشت کرنے کا عہد کیا ہے، یہ مظالم اگر کفار کے ہاتھوں ہونے والے ہوتے تو "يُعَذِّبُ الْمُشْرِكِيْنَ" کہا جاتا۔ مگر یہ مصائب و آلام کے پہاڑ نہ تو کافر ان پر ڈھائیں گے اور نہ مشرک ان پر ڈھائیں

گے۔ وہ ڈھائیں گے جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتے ہوں گے، محمد رسول اللہ کہتے ہوں گے۔ نمازیں پڑھتے ہوں گے، روزے رکھتے ہوں گے۔ مگر یہ سب اُن کا ظاہر ہوگا۔ باطن کی خبر خدا کو ہے۔ اب جس کو خبر ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ ادھر کے صادقین کو جزائے خیر دوں گا اور اُس طرف منافقین ہیں، اُن کو ضرور معذب کروں گا اور اس کے بعد خدا جانے کیا کہہ دیا اور کہاں کا نقشہ کھینچ دیا؟

"اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ"

جو اِن منافقین میں سے توبہ کرتا ہوا نکل آئے گا، وہ ہمارے عذاب سے محفوظ ہوگا۔

تو آیت عنوان ایک میدان پیش کر رہی ہے کہ جہاں صادقین ہوں، عہد کے پورا کرنے کی دھن میں ہوں، عہد کو سچ کر دکھانے کا تہیہ کئے ہوئے ہوں۔ حقیقتاً سب صادق نہ ہوں مگر ایک صادق نے سب کو صادق بنا دیا ہو۔ جو صادق کے ساتھ ہوں، اُن کو معیت کا شرف ملتا ہے۔ طہارت کی معیت موجب طہارت ہے اور نجاست کی معیت موجب نجاست ہے۔ اس لئے تو کہا کہ شراب سرکہ بننے پر پاک ہو جاتی ہے۔ اب اگر سرکہ بنانے کیلئے کچھ ڈال دیجئے مثلاً نمک کی ڈلی یا کسی پھل کا ٹکڑا تو اُس کے اثر سے وہ جلدی سرکہ بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ چیز سرکہ بن گئی جو اصل نجس تھی تو جو چیز اُس کے اندر تھی، وہ خود بخود پاک ہوگئی۔

یہ مسئلہ اتباع ہے اور اس مسئلہ اتباع کے مطابق کفار کی اولاد نجس ہے، حالانکہ وہ خود مختار نہیں ہے اور مسلمانوں کی اولاد پاک۔ اسی وجہ سے ہمیں پیغمبرؐ کے آباؤ اجداد کیلئے ماننا پڑتا ہے کہ وہ مومن تھے۔ غرضیکہ مسئلہ اتباع ہے۔ صادق حقیقت

میں ایک ہے، بمعنی کُل۔ اُسے صداقتِ مطلقہ کا حق حاصل ہے۔ صرف ایک ہے مگر جتنے اُس کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، سب پر رنگِ صداقت چھایا ہوا ہے۔ اب تو سب کے سب صادقین ہیں (بعد اس کے کہ امام نے اپنی بیعت اُٹھا کر اذنِ عام دے دیا کہ جسے جانا ہو، پردۂ شب میں چلا جائے اور بیعت اُن کی گردنوں سے اُتار دی گئی اور بیشتر حضرات چلے بھی گئے)۔

اِدھر یہ صادقین ہیں اور اُدھر منافقین ہیں۔ اگر وہاں مشرکین ہوتے تو آیت میں مذکور ہوتے۔ کافرین ہوتے صادقین کے مقابلہ میں تو قرآن میں اُن کا ذکر ہوتا۔

معلوم ہوا کہ اِدھر صادقین ہیں، اُدھر منافقین ہیں اور منافقین میں اگر کوئی راستہ چھوڑ کر اِدھر جانے والا ہوتا تو آیت اُسے نہ بھولتی اور ضرور کہتی۔ آیت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ صادقین کو بہتر سے بہتر جزا ملے گی۔ مگر جو اِن صادقین کو چھوڑ کر باہر نکلے گا، یہاں استثناء نہیں ہے۔ ہاں! آگے یہ آتا ہے کہ:

"یُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِیْنَ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ"۔

"منافقین پر عذاب نازل ہوگا اور توبہ کرنے والوں کو چھوڑ دیا جائے گا"۔

مگر جو استثناء ہے، وہ منافقین کے زمرے والے لوگوں کیلئے ہے، صادقین والے افراد میں کوئی استثناء نہیں کیا گیا۔ واقعاً یہ نقشہ اور اُس نقشہ کی تکمیل کسی توبہ کرنے کیلئے آنے والے کے اوپر منحصر ہے۔ اگر حُرِ جری نہ آتے، کھینچا ہوا نقشہ مکمل نہ ہوتا اور خدا اس قسم کا نقشہ ہی نہ کھینچتا کیونکہ نقشہ تو کسی عارف کا کھینچا ہوا ہے۔

بہرحال اُس کی نظر میں ہے کہ منافقین میں سے کون توبہ کر کے نکل آئے گا اور یاد رہے کہ اُس کی زبان پر لفظ توبہ ہی آیا ہے۔ عمل نے (کرنے والے کے عمل

نے) علم (صاحبِ علم) کا کہاں تک ساتھ دیا یا یہ کہوں کہ علم نے کہاں تک عمل کا احاطہ کیا؟ آنے والا آتا ہے اور کچھ نہیں کہتا سوائے:

"هَلْ لِيْ تَوْبَةٌ"

"میری توبہ بھی ہو سکتی ہے؟"

لفظ توبہ ہی اُس کی زبان پر آیا۔ جاننے والے نے وہی لفظ قرآن میں استعمال کیا "اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ"، اُن کی توبہ کو قبول کرے گا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ توبہ کیلئے قرآن میں جمع کا صیغہ بتا رہا ہے کہ آنے والا اکیلا نہیں آیا۔ کوئی بھائی بن کر آیا ہے، کوئی بیٹا بن کر آیا ہے، کوئی غلام بن کر آیا ہے۔ بہر حال یہ آنے والے تھے، آئے، صراط حق پر آئے، راہِ حق پر آئے۔ کہاں سے آئے تھے اور کہاں پہنچے!

مہمان نوازی دیکھئے اور کتنی دیر کی مہمان نوازی ہے؟ کیا کہنا ہے اے حُر جری تیرے آنے کا اور وقت کے وقت تیرے کامیاب و کامران ہو جانے کا! ارے تو جو پہلے سے آئے ہوئے تھے، اُن سے آگے بڑھا جا رہا ہے۔

حضرات! میں نے کبھی کبھی اپنی مجالس میں عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں مجالس حسینؑ کی ہوتی ہیں۔ کسی اور کے نام کی مجالس نہیں ہوتیں۔ مجلس جسے کہا جائے گا، امام حسینؑ ہی سے منسوب ہوگی۔ جب تبرک کے تقسیم کا وقت ہوتا ہے، کون دیکھتا ہے کہ کون پہلے سے آیا بیٹھا ہے یا اثنائے مجلس میں آیا یا مجلس کے ختم ہوتے ہوئے آیا؟ کوئی دیکھتا ہے اسے؟

لہٰذا جو مجلس سے دو گھنٹے پہلے آیا، تبرک کا اُتنا ہی وہ حقدار ہے جتنا کہ مجلس

کے ختم ہوتے ہوئے آنے والا۔ جو شروعِ مجلس میں آیا ہے، وہی حق اُس کا ہے جو اثنائے مجلس میں آیا، اُتنا ہی حق اُس کا ہے جو آخرِ مجلس میں آیا۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے عمل کی بنیاد اُسی دن کی ہے۔ اُس دن حصہ میں سب برابر ہو گئے۔ جو پہلے سے ساتھ تھے، وہ بھی اُسی درجہ میں، جو درمیان میں ساتھ ہو گئے، وہ بھی اُسی درجہ میں، جو کربلا میں پہنچ کر ساتھ ہوئے، وہ بھی اُسی درجہ میں ہو گئے۔ ساتویں محرم، آٹھویں محرم یا نویں محرم کو اور کوئی وقت کے وقت پر آیا، دن کے دن آیا، گھڑی کی گھڑی آیا:

"طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْاَرْضِ الَّتِیْ فِیْهَا دُفِنْتُمْ".

اب اُن کی شان یہ ہے کہ ہر ایک امام حسین علیہ السلام کے جاں نثاروں کا نام لے کر سلام کرتا ہے اور اپنا سلام کا تحفہ پیش کر رہا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ایک غیر عرب بھی یہاں ہے، جون، ملکِ حبش کے رہنے والے۔ بعض الفاظِ زیارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جون حضرت ابوذر کے غلام تھے۔ جب بازارِ جنگ گرم ہونے لگا اور شہدائے کربلا کا خون زمین کربلا کو رنگنے لگا تو جون بھی اُٹھے۔ امامؑ کے سامنے آئے، عرض کیا:

''میرے سید و آقا! مجھے جہاد کی اجازت دیتے ہیں؟''

کربلا کا میدان تھا۔ اصل میں میدانِ امتحان اور امامؑ تو ہر دل سے باخبر تھے۔ اصل میں یہ عنوانِ امتحان اس لئے تھا کہ رہتی دُنیا تک پتہ چلتا رہے کہ جاں نثار کیسے تھے! جب جون نے کہا کہ مولاؑ! مجھے اجازت دیجئے۔ امامؑ نے فرمایا: کیوں اپنی جان دے رہے ہو؟ جاؤ، ہم نے تمھیں آزاد کیا، جہاں تمہارا جی چاہے، چلے جاؤ۔

بات یہ ہے کہ جانے والوں پر دشمن کی طرف سے پابندی نہیں تھی۔ آنے

والوں کیلئے پابندی تھی۔ نصرتِ امامؑ چھوڑ کر جس کا جی چاہے، چلا جائے۔ دشمنوں کی تو عین تمنا یہی تھی۔

لہٰذا فرمایا کہ جاؤ، جہاں جانا چاہو، اپنی جان کیوں دے رہے ہو؟ اب یہ جوش کے رہنے والے تھے اور امامؑ کا ادب و احترام دل پر چھایا ہوا تھا۔ کچھ نہ کہہ سکے۔ کوئی لفظ ہی ان کو کہنے کیلئے نہ ملا۔ مگر جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ شہادت کا شوق تھا۔ کچھ کہہ نہ سکے، زندہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ امامؑ کے سامنے سے اُٹھ گئے اور خدا جانے کہ کربلا کے کس گوشے میں جا بیٹھے۔ بیٹھ گئے اور اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگے، سر جھکائے ہوئے ہیں اور زار زار رو رہے ہیں۔ آنسوؤں سے زمین تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا کہوں؟ کسے کہوں؟ خود کہوں یا کسی سے کہلواؤں؟

سوچتے سوچتے نہ معلوم کس الہام نے اُن کے دل میں ڈال دیا اور خدا کی قسم! ان کے دل میں ایسی بات آگئی کہ اس سے بہتر بات بن نہیں سکتی۔ وہ بات دل میں پیدا ہوئی تو یہ اپنی جگہ سے اُٹھے۔ خوش ہو کر امامؑ کے سامنے آگئے اور عرض کیا:

''مولاؑ! میں سمجھ گیا کہ آپ مجھے مرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ آپ مجھے جاں نثاری کا موقعہ کیوں نہیں دیتے؟ یہ میں سمجھ گیا''۔

جب اُس نے یہ کہا تو امامؑ کو پوچھنا پڑ گیا کہ جون! تم کیا سمجھے؟

عرض کرتے ہیں: ''مولاؑ! میرا چہرہ سیاہ ہے''۔

عجب تصور تھا۔ اب جون دیکھ رہے تھے کہ لاشیں اُٹھ اُٹھ کر آ رہی ہیں اور شہیدوں کا دائرہ بنایا جا رہا ہے۔ لاش کے پاس لاش رکھی جا رہی ہے۔ اسی طرح سے لاشوں کو جمع کیا جا رہا تھا۔ اس تصور پر جون یہ کہتے ہیں کہ میرا چہرہ سیاہ ہے، آپ گوارا

نہیں کرتے کہ نورانی لاشوں میں ایک سیاہ فام کی لاش پڑی ہو۔ پھر عرض کرتے ہیں:

''مولاؑ! میرے پسینہ میں بدبو آتی ہے۔ آپؑ گوارا نہیں کرتے کہ آپؑ کی معطر لاشوں میں ایک بدبودار پسینہ والی لاش پڑی ہو''۔

اس کے بعد خدا جانے کس دھن میں کہہ گئے:

''وَاللّٰهِ لَا اُفَارِقُكُمْ''۔

مولاؑ! خدا کی قسم! میں آپؑ کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ خدا کی قسم! میں آپؑ سے جدا نہیں ہوں گا''۔

''حَتّٰی شَرِکَ هٰذَا الدَّمُ الْاَسْوَدُ مَعَ دِمَاءِ کُمْ''۔

اے مولاؑ! میں اُس وقت تک آپؑ کا دامن نہیں چھوڑوں گا جب تک میں سیاہ خون آپ حضرات کے خون میں شامل نہ کردوں اور جب تک اپنا خون آپؑ پر نثار نہ کردوں۔

ظاہر ہے کہ جب اپنے آپ کو نثار کردے گا تو پھر چھوڑنے کا تو سوال ہی نہیں رہے گا۔

یہ جون کے وہ کلمات تھے کہ امامؑ تڑپ گئے اور آپؑ نے تڑپ کر فرمایا:

''جون! نہیں، نہیں۔ میں نے تمہیں اس لئے تو نہ روکا تھا۔ یہ تو میرے ذہن میں بھی نہ تھا، اچھا! اگر تمہارا دل ٹوٹ رہا ہے تو جاؤ، ہم نے تمہیں اجازت دی''

یہی جون کا مقصد تھا جس میں کامیاب ہو گئے۔ اِدھر جون کو اجازت دی اور جون نے قدم بڑھایا، اُدھر امامؑ نے اپنے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں بلند کئے اور اپنے معبود سے عرض کی:

"اَللّٰهُمَّ بَيِّضْ وَجْهَهٗ".

خداوندا! جون کے چہرے کو روشن کر دے اور جون کے خون کو معطر کر دے۔

ادھر سے جون چلے، اُدھر جون کے حق میں امام کی دُعا چلی۔ دُعا امام کی تھی، وہاں تو جو دُعا کرے، جا کر تحت ِقبہ دُعا قبول ہوتی ہے۔ یہ تو صاحب ِقبہ کی دُعا ہے: "خداوندا! جون کے چہرے کو روشن کر دے"۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ خود جون کو پتہ چلا یا نہ چلا۔ سمجھتا تو ہوں کہ امام کی دُعا کا اثر ہونا چاہیے کہ جون کو بھی پتہ چل جائے مگر بہر حال لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے قتل کے چھ روز بعد جون کی لاش دیکھی کہ آفتابِ درخشاں کی طرح چمک رہی تھی اور مشک و عنبر سے کہیں بہتر خوشبوئیں اُس کے بدن سے آ رہی تھیں۔

حسینؑ کے انصار جو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رہ کر صادقین کے رنگ میں رنگے گئے اور صادقین کے لفظ کے مستحق ہو گئے۔ یہ وہ انصار امام تھے جن کی قدر و منزلت میں آپ نے زیادہ سے زیادہ یہی سن رکھا ہے کہ ہر ایک فدائی اپنی لاش پر بلاتا تھا اور آپ پہنچتے تھے، یہ تو تھا ہی مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو امام کی طرف سے انتہائی قدر و منزلت ہوئی، اس کا منظر بالکل آخر میں سامنے آتا ہے، وہ کیا ہے؟

واقعۂ رُخصت آپ کی نظر میں ہوگا۔ جب وداعی سلام کیلئے امام خیمہ پر آئے اور بہنوں کو آخری سلام کیا۔ بہنوں نے بھائی کا دامن تھاما، کچھ شکایتیں کیں، کچھ سوال کیے اور کہا: "بھائی! آپ نے وداعی سلام کیا، یہ نہ سوچا کہ بہنوں کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ بھیا! کیا آپ نے کمر باندھ لی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمیں کس کے سپرد کیا؟"

جنابِ اُمِ کلثوم کا بیان ہے کہ "جایئے بھائی جان! اگر ہمیں نانا کے روضہ پر تو پہنچادیجئے"۔

بہرحال یہ مہم اور اس کے بعد بیمارِ کربلا سے امام کا رُخصت ہونا اور اسی رخصت کے وقت اپنے غمخواروں کے نام اپنے پیغام کا جاری کرنا:

"بیٹا! جب قید سے چھوٹ کر وطن جانا تو میرے غمخوار جب میرا حال پوچھنے آئیں تو کہنا:

'شِیْعَتِیْ مَااِنْ شَرِبْتُمْ مَاءِ عذبٍ فَاذْکُرُوْنِیْ'۔

'اے میرے شیعو! جب آپ خوشگوار پینا تو میری پیاس کو یاد کر لینا'۔

بیٹا! کہہ دینا میری طرف سے:

"لَیْتَ کُمْ یَوْمِ عَاشُوْرَا اَجْمِیْعًا تَنْظُرُوْنِیْ کَیْفَ اَسْتَسْقِیْ لِطِفْلِیْ فَاَبَوْا اَنْ یَّرْحَمُوْنِیْ"۔

میں جانتا ہوں کہ قیامت تک مجھ پر رویا کرو گے اور میری صفِ ماتم بچھایا کرو گے مگر کاش کہ میرے رونے والو تم سب کے سب روزِ عاشور کو موجود ہوتے اور کس وقت ہوتے؟ اُس وقت ہوتے جب میں اپنے ننھے علی اصغر کیلئے سوال آب کر رہا تھا اور تم دیکھتے کہ میں کس کس طرح سے اپنے طفل کیلئے پانی مانگتا رہ گیا اور اُنہوں نے بچے کیلئے میری رحم کی درخواست مسترد کر دی۔

آپ جانتے ہیں کہ امام نے یہ مہم سر کی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ خیمہ کے در سے امام کس طرح نکلے اور کس عالم میں اپنے بچوں، بچیوں اور بہنوں کو چھوڑ کر نکلے ہیں۔ اب امام حسینؑ رُخصت ہو چکے ہیں۔ بیمار امام سجادؑ سے اور بہنوں بیٹیوں سے

بھی رخصت ہو چکے ہیں مگر میدان میں اب بھی نہیں جانا چاہتے۔ کس قسم کا دریا ہے جو امام کے سینے میں موجزن ہے۔ اپنے خیمہ سے نکلنے کے بعد اب امام انصار کے خیموں کی طرف چلے۔ اُن خیموں کی طرف جن میں کوئی رہا ہی نہ تھا۔

عالم یہ ہے کہ کسی خیمے پر آتے ہیں، پردہ اُٹھاتے ہیں، خالی خیمہ کو دیکھتے ہیں، جس کا خیمہ ہے، اُس کا نام لے کر پکارتے ہیں: ''حبیب''، جواب کون دے؟ دُوسرے خیمہ پر جاتے ہیں: ''مسلم'' تیسرے خیمہ پر آتے ہیں، پکارتے ہیں ''زہیر''، جواب کوئی نہیں دیتا۔ حضرتؑ رو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

کجا رفتند آں پاکیزہ جاناں
کجا رفتند آں زیبا جواناں

ابھی ابھی خیمہ میں آباد تھے، کہاں چلے گئے؟ سارے خیمے خالی پڑے ہیں۔ یہ سب کہاں چلے گئے؟

انہیں یاد کر کے رو رہے ہیں۔ جب خیموں سے رُخصت ہو چکے، لاشوں کے پاس آئے اور ایک ایک لاش پر جھکتے ہیں۔ لاش والے کا نام لے کر پکارتے ہیں، جواب نہیں ملتا۔ دُوسری لاش پر جھکتے ہیں، کوئی جواب نہیں دیتا۔ تیسری لاش پر جھکتے ہیں، کوئی نہیں بولتا۔ جب چند مواقع آ چکے، بار بار پکارا اور کسی نے جواب نہ دیا تو شکایت کا موقعہ آ گیا اور آپؑ نے فرمایا:

''اے وفا کے پتلو، اے شہسوارو، بیشہ جنگ کے شیرو!''

امامؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے! ''مالکم'' کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"مَالِيَ اُنَادِيْكُمْ فَلَاتَسْتَجِيْبُوْنِيْ".

مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہیں پکار رہا ہوں اور تم سنتے نہیں ہو؟

یعنی مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تم کو یہاں پکار رہا ہوں اور تم جواب نہیں دیتے،

"وَاَدْعُوْكُمْ فَلَاتَسْمَعُوْنَ".

اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہیں پکار رہا ہوں اور تم سنتے نہیں ہو؟

یعنی کیا میں وہ نہیں رہا جو پہلے تھا؟ اب میں کچھ اور ہو گیا ہوں؟ کیا بات ہے کہ جب بلاتا ہوں، تم نہیں آتے اور میں پکارتا ہوں اور تم جواب نہیں دیتے؟

"اَءَ اَنْتُمْ نِيَامٌ".

کیا رات بھر جاگنے کی وجہ سے سو رہے ہو؟ میں اس انتظار میں کھڑا رہوں کہ تم جاگ اٹھو گے؟

"اَمْ حَالَتْ مَوَدَّتُكُمْ اِلٰى اِمَامِكُمْ فَلَاتَنْصُرُوْنِ".

اور یا تمہیں اطمینان ہو گیا ہے کہ تم نے نبی زادے کی نصرت کا حق ادا کر دیا ہے؟ نبی زادے کے تم بہت کام آئے ہو، اس اطمینان پر سو رہے ہو؟ اگر تمہارے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ تم نے نبی زادے کا پورا حق ادا کر دیا ہے تو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ جو میرا حق تھا، بے شک تم نے ادا کر دیا ہے مگر بے وقت سوئے ہو۔ میرا حق ادا کیا ہے، زینبؑ کا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ نبی زادے کا حق ادا کیا ہے مگر نبی زادیوں کا حق ادا نہیں کیا۔ مجھے تمہارے سونے کی کوئی شکایت نہیں مگر زینبؑ کو شکایت ہوگی اور نبی زادیاں شاکیانہ انداز میں کہیں گی کہ اصحابِ حسینؑ نبی زادے کے کام آئے۔ مگر جب نبی زادیوں کے لٹنے کا وقت آیا اور چادروں کے چھننے کا وقت آیا تو انصارِ امام سو گئے۔

چھٹی
مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا. قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِندَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" (رعد:43)۔

"وہ لوگ جو کافر ہوئے، کہتے ہیں اور کہتے رہیں گے کہ تو اللہ کا رسول نہیں ہے۔ اے رسولؐ! کہہ دو اور کہتے رہو کہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان گواہ اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے"۔

قرآن مجید کی یہ آیت ایک طرف رفعتِ شانِ رسولؐ کو ثابت کر رہی ہے اور ایک طرف شاہدِ امر رسالت کی بلندی پر روشنی ڈال رہی ہے۔ آیت ایک ہے اور کام دو کر رہی ہے۔ اسی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کی شان کیا ہے اور اسی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ شاہدِ امر نبوت کیا شان رکھتا ہے۔

میں پہلے بیان کے تقاضے درست کرنے کیلئے آپ کو اس آیت کے ترجمہ کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ خداوند عالم ارشاد فرما رہا ہے:

"اے رسولؐ! کفار کہہ رہے ہیں اور کہتے رہیں گے کہ آپؐ خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں۔ تم بھی کہہ دو کہ انکار کرنے والو، میری نبوت کے منکرو! تم انکار کیے جاؤ، میرے امر نبوت کی گواہی کیلئے اللہ کافی ہے (میرے اور تمہارے درمیان گواہ کی حیثیت سے اللہ کافی ہے) اور وہ جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔

اپنے بیان کو شروع کرنے سے پہلے قارئین کے سامنے ایک چیز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے توجہ کر لی تو شاید یہی بات مجلس کا حاصل ہو جائے۔ خداوند

عالم قول کفار لفظ "یقُولُ" کہہ کر بیان کر رہا ہے۔ یعنی یہ کفار آج بھی انکار کر رہے ہیں، کل بھی کریں گے اور ان کا انکار مستقل نوعیت کا ہے۔ اُن کا یہ انکار کرنا آج بھی ہے اور مستقبل میں بھی ہوگا۔ لہٰذا تم اُن کے انکار پر کہہ دو اور کہتے رہو۔ وہ اپنے قول پر قائم رہیں تو تم اپنے قول پر قائم رہو۔ اگر وہ بھی کہتے رہیں تو تم بھی کہتے رہو۔

یہیں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آیت قیامت تک زندہ رہنے کیلئے آئی ہے۔ یعنی ہر زمانہ میں، ہر صدی میں، ہر فصل میں، ہر موسم میں پیغمبر کو بہر حال یہی کہتے رہنا ہے کہ میری شہادت کیلئے اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے، کافی ہیں۔ بس فرق اتنا ہے پیغمبر کے ہمیشہ کہتے رہنے میں کہ ابتداء یوں ہے کہ پیغمبر قرآن کی زبان بن کر کہیں اور انتہا یہ ہے کہ قرآن پیغمبر کی زبان بن کر کہے۔

آپ نے شاید توجہ فرمائی ہو کہ میں نے کیا عرض کیا ہے۔ اے رسولؐ! کہہ دو (اور حکم رسولؐ کے نام آج بھی ہے) اور جب تک رسول ہیں، وہ قرآن کی زبان ہیں اور جب رسول نہیں تو قرآن رسول کی زبان ہے۔ بہر حال قول قائم ہے۔

ذرا ایک چیز نظر میں تو لائیے کہ آیت کو یہ نہیں کہنا ہے کہ نبی کے گواہ کون کون ہیں۔ حضرات! یہ بڑا پر لطف مقام ہے کہ آیت کو یہ نہیں کہنا ہے کہ نبی کے گواہ کتنے ہیں اور کون کون ہیں! سیدالانبیاء کے گواہ تو اتنے ہیں جن کو گنا نہیں جا سکتا۔ کونسا فرشتہ ہے جو گواہ نہیں اور کونسا مومن ہے جو گواہ نہیں۔

"اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه"۔

کتنی زبانوں پر آرہا ہے اور کتنی زبانوں پر آئے گا۔ اُمت جتنی بھی ہے اور جتنی ہوگی، ساری کی ساری شاہد رسالت ہے۔ پھر آپ سلسلہ انبیائے طاہرین

سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ کوئی نبی ایسا ہے جس نے شہادت نہ دی ہو؟ ہر نبی اُن کی نبوت کا گواہ ہے، ہر ولی اُن کی نبوت کا گواہ ہے، ہر فرشتہ اُن کی نبوت کا گواہ ہے، ہر مؤمن اُن کی نبوت کا گواہ ہے۔ گواہ اتنے کہ شمار سے باہر ہیں۔ کتابوں کی گواہی الگ، پھر معجزات کی شہادت الگ، پھر دلائل وبینات کی گواہی الگ، ہر نقل پر عقل کی شہادت الگ۔ یہ شہادتیں اتنی کثیر ہیں کہ گنا جاسکتا ہے نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ احاطہ کیا جاسکتا ہے۔

لہٰذا آیت کو یہ نہیں بتانا ہے کہ نبی کی گواہی کیلئے گواہ کون ہیں اور کتنے ہیں بلکہ آیت کو اتر کر صرف یہ بتانا ہے کہ اس نبی کی گواہی کیلئے کافی گواہ کون ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ بیانِ آیت کا رُخ فہرستِ گواہانِ رسالت پیش کرنے کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ بتانے کیلئے ہے کہ اُس کی رسالت کیلئے شہادت کتنی کافی ہے اور اُس کے گواہ کتنے ہیں کہ اُن کا گواہ ہونا مدعائے رسالت کیلئے کافی ہو۔

حضرات والا! کافی اُس مقدار کو کہتے ہیں جس سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو اور جس سے کم ہونا کفایت نہ کرے۔ لفظ کافی میں ایک ایسی حد بندی ہے کہ ایک مخصوص مقدار چاہتا ہے۔ آیت کو یہ بتانا ہے کہ اے رسولؐ! کہہ دو کہ میری گواہی کیلئے اللہ کافی ہے اور وہ جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔ یہ میری گواہی کیلئے کافی ہیں۔ اب ان کی گواہی کیلئے کافی کا لفظ آنا بتا رہا ہے کہ اگر اِن دو کے بعد کوئی بھی گواہی نہ دے اور کوئی بھی گواہ برآمد نہ ہو تو پیغمبرؐ ضرورت مند نہیں ہیں۔ بس یہ کافی ہیں یعنی ان دو کے سوا اور کوئی بطیب خاطر گواہی دے تو خبردار! نبی کی ضرورت کی بناء پر نہ دے، یہ

سمجھ کر نہ دے کہ نبی یا پیغمبر کو میری گواہی کی ضرورت ہے بلکہ یہ سمجھ کر دے کہ نبی کی ضرورت پوری ہوگئی، اب نبی کو تیسرے گواہ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اگر ضرورت رہے تو لفظ "کَفٰی" غلط ہو جاتا ہے اور خدا کا ارشاد بھی صحیح نہیں رہتا۔

آیت نے تو پورا زور اس امر پر دیا ہے کہ نبوت کی شہادت کیلئے کون اور کتنے گواہ ہیں کہ کافی ہوں۔ تو آیت بتا رہی ہے کہ وہ دو ہیں: ایک اللہ ہے۔ مقامِ شہادت میں سب سے پہلے خلاقِ عالم نے اپنی ذات کو پیش کیا، پہلے اپنا نام لیا ہے، یہ کہہ کر:

"کَفٰی بِاللّٰہِ".

"گواہ ہونے کی حیثیت سے اللہ کافی ہے"۔

ایک نام آ گیا یعنی ایک گواہ کا ذکر آ گیا۔ مگر نصابِ شہادت چاہتا ہے کہ دوسرا بھی ہو۔ اُسی کا بنایا ہوا قانون ہے۔

"وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ". (بقرہ:282)

"ہر امر پر تمہارے دو گواہ ہونے چاہئیں"۔

اُس نے قانون بنایا ہے اور قانون کو تمام قرار دیا ہے۔ وہی قانون کو خود کیسے توڑ سکتا ہے؟ تو جب اُس نے ہم بے بسوں پر کم از کم دو گواہوں کے پیش کرنے کی ذمہ داری رکھ دی ہے تو وہ خود قدیر ہو کر پیغمبرؐ کے دو گواہ بھی نہ رکھے؟ ایک اپنی ذات کو پیش کیا اور مقامِ شہادتِ نبوت میں پہلے اپنی ذات کو پیش کیا۔

اب ذرا سوچئے کہ دُوسرا کون آئے کہ شاہدِ اوّل کی شان میں کمی نہ ہو یعنی جس مقام پر خدا کا نام آ جائے اور خدا کا کام آ جائے، اُس مقام پر دُوسرا کون کھڑا ہو کہ جس کے قیام سے تنقیصِ شانِ خدا نہ ہو۔ ہر محل کا ایک اقتضا ہوتا ہے۔ کتنا بلند ہے

وہ مقام کہ جہاں شہادت کیلئے خدا اپنے آپ کو پیش کر دے۔ اب کون آئے کہ شہادت کی تکمیل ہو جائے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا دو ہوتے تو دونوں مل کر گواہی دیتے اور گواہی کے مقام پر خدا ہی خدا ہوتے۔ خدائی کا مقام نہ آتا۔ مگر وہاں تو صورت یہ ہے کہ وہ ایک ہے جس کا دُوسرا نہیں ہے۔ مگر نصاب چاہتا ہے کہ دُوسرا بھی ہو۔ خدا دُوسرا ہے نہیں، لامحالہ دُوسرا خدائی میں سے ہوگا۔ مگر کیسا ہوگا؟ اگر دُوسرا خدا ہوتا تو اُسے رکھا جاتا، کہیے کہ خدائی میں سے ہوگا۔ مگر خدائی بھر کا انتخاب ہوگا۔ یعنی جو خدا کے بعد بہتر سے بہتر ہوگا، اُسی کو چنا جائے گا۔ خدا کے بعد جو بہتر سے بہتر ہے اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ تو خدا کی خدائی میں سب سے بہتر سیدٌ الانبیاء ہیں۔ مگر سیدٌ الانبیاء تو مدعی ہیں اور صورت یہ قائم ہوگی کہ دُوسرے گواہ کے مقام پر آئے تو وہ آئے جو خدا اور رسولؐ کے بعد باقی خدائی میں سب سے بہتر ہو۔

لہٰذا خدا نے پہلے اپنا نام لیا اور پھر رسولؐ کے بعد جس کو بہتر سے بہتر پایا، اُس کا نام لیا۔ اور وہ ایسا صاحب کمال تھا کہ لوگوں کو اس پر خدا ہونے کا دھوکہ ہو گیا۔ بہک کر کہنے لگے کہ نہیں! یہ خدا ہے۔ کاش! نبی کا کہنا سن لیتے کہ خدا نہیں، نا خدا ہے۔ خدا رس ہے، خدا رسا ہے، خدا بین ہے، خدا نما ہے، اس کا نام خدا کا نام ہے اور اس کا کام خدا کا کام ہے۔

حضرات! اس سلسلہ میں ایک بات کہہ رہا ہوں، میری عجیب سی باتیں ہیں۔ اگر آپ حضرات یعنی میری قوم مل کر فیصلہ کر کے مجھ سے کہہ دے کہ دیکھئے مولانا! جب آپ پر کوئی حملہ آور ہو، خبردار! آپ اُس کے حملے کا جواب خود نہ دیں۔

میری قوم نے مجھے روک دیا۔ حملہ آوروں کو نہیں روکا، مجھے روک دیا کہ جب کوئی حملہ آور ہو آپ پر تو مولانا! یہ آپ کی شان نہیں ہے کہ آپ اُس کے حملے کا جواب دیں۔ اگر آپ مجھے حملہ آوروں کے مقابلہ میں حملہ سے روکیں تو پھر آپ کا فرض ہوگا کہ آپ صورتِ دفاع کو معین کریں یعنی یہ آپ کا فرض ہوگا کہ حملہ آوروں کے حملہ کو روکنے کا انتظام کر کے مجھے روکا جائے۔ اگر انتظام نہیں ہوا اور مجھے روک دیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میری دُشمنی ہو رہی ہے، مجھے تباہ کرنا ہے۔

حضرات! میرے جملے کو یاد رکھیے گا۔ آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے اپنے ہاتھ میں تلوار لے کر کسی کا مقابلہ کیا ہو اور آپ نے پیغمبرؐ کے مقابلہ میں ہزاروں کفار کو نہیں دیکھا؟ کبھی سوچا ہے کہ آخر یہ راز کیا ہے؟ پیغمبرؐ پر تو حملہ آور بار بار حملہ آور ہو رہے ہیں اور جب کفار حملہ آور ہوں تو رسالت مآبؐ بار بار فرمائیں: ''کوئی ہے اس حملہ آور کا جواب دینے والا؟ مثال کے طور پر جنگِ خندق میں عمرا ابن عبدود کا مبارز طلب ہونا اور سرکارؐ کا حاضرین سے کہنا: ''ہے کوئی اس کے مقابلہ کیلئے؟''

کیوں جناب! شجاعت کے اعتبار سے اور مقابلہ کیلئے کافی ہونے کے اعتبار سے کوئی پیغمبرؐ سے بہتر ہو سکتا ہے؟ اگر اشارہ بھی کر دیں تو وہی دُشمن کو شکست دینے کیلئے کافی ہے۔ حضرت علیؑ کی شجاعت کے متعلق جو کچھ آپ سنتے رہتے ہیں، اُسی سے آپ شجاعتِ پیغمبرؐ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یعنی جب پیکرِ علیؑ میں قوتِ ربانیہ کا یہ عالم ہے تو پیکرِ نبیؐ میں قوتِ ربانیہ کا کیا عالم ہوگا! یہ کبھی آپ نے مقابلہ کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو پھر اُس کا ذکر ہے جس نے خدا کے کہے بغیر کبھی کہا نہیں اور اُس کے حکم کے بغیر کچھ کیا نہیں۔ اُن کا دُشمن کے مدِمقابل نہ جانا ذاتی فیصلہ نہ تھا۔ محبّ اور محبوب کے

درمیان قرارداد تھی:

''اے رسولؐ! ہم نے تمہیں عالمین کیلئے رحمت قرار دیا ہے۔ ہمیں نہیں اچھا معلوم ہوتا کہ تم حملہ آور کے حملے کا جواب خود دو، تمہاری شان اس کی متقضی نہیں ہے''۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس نے پیغمبر کو حملہ کے جواب میں حملہ کرنے سے روک دیا ہے، ذرا سوچئے کہ اُس نے کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ یا یونہی روک دیا اور انتظام کچھ نہیں؟ نہیں! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محض روک دیا ہو؟ جس نے روکا، اُس نے اپنی بارگاہ سے حملے کے جواب کا انتظام کیا۔

پیغمبرؐ خدا کی مدد کرنے والے کم نہ تھے۔ لیکن حضرات! ایک لفظ کہوں گا، انتہائے احتیاط کے ساتھ، پیغمبرؐ کے مددگار مدد کرنے والے ہیں مگر سب اپنی مرضی سے اور اپنے اختیار سے۔ جب مرضی سے کام ہوگا تو جب چاہیں گے، مدد کریں گے۔

یہ مجلس ہے اور مجالس ہوتی رہتی ہیں۔ انصار ہوتے ہیں جو شریک ہوتے ہیں، ملنے والے شریک ہوتے ہیں۔ مگر ہر ایک کی شرکت اپنی مرضی پر ہے۔ مگر بھائی نے چونکہ شرکت کرنے کا پکا وعدہ کرلیا ہے، اُس کی شرکت مرضی پر نہیں رہی۔ اُسے آنا پڑے گا ورنہ نکتہ چینی ہوگی کہ وعدہ کیا تھا، پورا نہ کیا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ آنے کے معیار دو ہوگئے ہیں۔ ایک وہ آتا ہے جو اپنی مرضی پر ہو اور ایک وہ آتا ہے جو اپنی ذمہ داری کے احساس کی بناء پر ہو۔

خدا نے روکا ہے: ''ہم اس حالت میں تمہیں نہیں دیکھنا چاہتے کہ تم حملہ آوروں کے حملوں کا خود جواب دو''۔ یہ بندش تبھی ہوسکتی ہے جب قدرت نے اپنی جانب سے انتظام کیا ہو اور وہ انتظام اتنا مستحکم انتظام ہو کہ دُنیا بدل جائے تو بدل

جائے مگر اُس انتظام میں خلل نہ آئے۔

"وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا"۔

اے رسولؐ! تمہاری زبان پر یہ کلمات جاری رہنے چاہئیں: بارالٰہا! مجھے اپنی بارگاہ سے، اپنی جانب سے ایک قوی مددگار عطا کردے۔ وہ قوی مددگار سایہ بن کر رسولؐ کے ساتھ رہے اور جب حملہ آور رسولؐ پر حملہ آور ہوں تو وہ قوتِ بازوئے نبیؐ بن کر، وہ دستِ خدا اور دستِ رسولؐ بن کر ہر حملہ کا جواب دے اور ہر مقام پر پیغمبرؐ خدا کی حفاظت کرے۔

بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ مقامِ شہادت کیلئے قدرت نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے۔ مگر دُوسرا شاہد نہ ہو تو نصاب پورا نہ ہوگا اور نامکمل رہے گا۔ خلاقِ عالم خود بتا رہا ہے کہ وہ اپنے نبی کا دُوسرا شاہد بہتر سے بہتر قرار دینا چاہتا ہے اور جسے بہتر سے بہتر پایا، اُسے مقامِ شہادت میں پیش کر دیا۔

لطف کی بات یہ ضرور آرہی ہے کہ اُس نے اپنا نام لیا۔ دو گواہوں میں سے ایک گواہ خود ہے۔ اپنا نام تو اُس نے "كَفٰى بِاللّٰهِ" کہہ کر لے لیا۔ دُوسرے شاہد کا آیت میں نام نہیں لیا۔ نشان بتایا اور نشان علم کو قرار دیا۔

امیر المومنینؑ کی دو صفات ہیں جن میں کوئی تامل نہیں کرسکتا۔ ایک علم اور دُوسری شجاعت۔ یہ دو صفات وہ گرانقدر صفات ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ غرضیکہ مقامِ شہادت پر دُوسرے شاہد کا نام نہیں پیش کیا اور علم کو کتاب سے نسبت دی۔ وہ گواہ ہے جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔

اس آیت میں اس بناء پر بڑا لطف پیدا ہوگیا کہ اللہ نے کتاب کے حوالہ

سے اس گواہ کو پیش کیا اور چونکہ کتاب کے حوالہ سے پیش کیا ہے تو کتاب میں خود بخود لفظِ کتاب آ گیا ہے۔ لفظ کتاب کا عبارت میں آ جانا یہ بتلا رہا ہے کہ خلاقِ عالم کتاب کو بھولے ہوئے نہیں ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کتاب کو بھولے ہوئے نہیں ہے کیونکہ نامِ کتاب آ رہا ہے اور کفیٰ کے تحت آ رہا ہے، کتاب پر اس کی نظر ہے اور اگر کفایت پر بھی نظر ہوتی تو طولانی کیوں بنایا جاتا۔ پھر تو آسان لفظ تھے:

"كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَالْكِتَابَ".

اے رسولؐ! کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کیلئے اللہ اور کتاب کافی ہے۔

کتاب کا تو ذکر نہیں ہے، مقامِ شہادت میں کتاب کو تو پیش نہیں کیا۔ یاد ہے وہ کتاب مگر خود کتاب کو نہیں پیش کیا جا رہا۔ یہ نہیں کہا جا رہا کہ دوسرا گواہ کتاب ہے۔ یہ بیان موجود نہیں ہے کہ دوسرا گواہ وہ ہے جس کے پاس کتاب ہے۔ یہ آیت میں نہیں ہے۔ یوں نہیں کہا۔ کہا یوں جا رہا ہے کہ دوسرا گواہ وہ ہے جس کے پاس علم الکتب ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی کے پاس کتاب ہو اور علم الکتاب نہ ہو تو وہ گواہ نہیں ہو سکتا۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ "وہ جس کے پاس علم الکتاب موجود ہے"، وہ دوسرا گواہ ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے صدرِ کلام میں عرض کیا تھا کہ آیت قیامت تک زندہ رہنے کیلئے آئی ہے، اس لئے کہ نبوت ہے نبوت باقی۔ اب یہ نبوت قیامت تک باقی رہے گی اور منکر بھی بہرحال رہیں گے۔ اب جب نبوت بھی رہتی ہے اور انکار بھی رہتا ہے تو انکار ہی گواہوں کے پیش کرنے کی بناء ہے۔ اگر انکار نہ ہوتا تو گواہوں کو پیش کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ واقعتاً یہ بات زیادہ محتاجِ بیان نہیں ہے کہ گواہوں کی

ضرورت تو انکار ہی کی بناء پر ہے۔ آج انکار ہے یا نہیں، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں گواہ ہیں یا نہیں؟

نبوت بھی رہے اور انکار بھی رہے، گواہ نہ رہیں۔ آپ کہیں گے کہ ایک تو ہے۔ اگر ایک ہے اور اگر یہ کافی تھا تو شروع سے ہی کافی تھا۔ پھر دُوسرے کا ذکر ہی کیوں کیا؟ جب دُوسرے گواہ کی ضرورت عہدِ رسالت میں تھی، جب دُوسرے گواہ کی ضرورت نبیؐ کے ہوتے ہوئے تھی تو نبیؐ کے بعد تو یہ ضرورت اور بڑھے گی۔

حضرات! انشاء اللہ، آپ کے ذہن میں ایک چیز آنے والی ہے۔ دُوسرے گواہ کا نام نہیں لیا، نشان بتایا ہے۔ یہ دُوسرا گواہ کون ہے؟ وہ، جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔ اگر نام لے دیتا تو جس کا نام لے دیتا، اُس نام والے تک آیت زندہ رہتی، اُس نام والے کی زندگی تک آیت کی زندگی رہتی اور جب وہ نام والا نہ رہتا، نصاب نامکمل ہو جاتا۔ حیاتِ آیت میں فرق آ جاتا۔

ہماری جانیں قربان ہوں اس طرزِ ادا پر کہ خداوند عالم نے نام نہ لے کر اس آیت کو اس طرح زندہ کر دیا کہ زندۂ جاوید بنا دیا اور پائیدار بنا دیا۔ ممکن نہیں کہ زمانہ رہے اور آیت کے بیان کئے ہوئے دونوں گواہ نہ رہیں۔ واقعتاً اکثر ہمارا جی چاہتا ہے کہ حضرت علیؑ کا نام آ جاتا، قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ بات مکمل ہو جاتی۔ مگر سچ بتایئے گا کہ اگر اس آیت میں اللہ کی طرح سے علیؑ کا نام آ جاتا اور آیت یہ کہتی ہوئی آ جاتی:

"رسولؐ کی گواہی کیلئے کافی ہے اللہ اور علیؑ"۔

اللہ تو بے شک وہ ہے جس نے ہمیشہ رہنا ہے اور جس میں کوئی تغیر نہیں مگر حضرت علیؑ کیلئے یقیناً تغیر ہے۔ اس لئے کہ خدا نہیں ہے، بندۂ خدا ہے۔ تو اگر آیت

میں حضرت علیؑ کا نام آجاتا تو حضرت علیؑ تک آیت زندہ رہتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ علیؑ کے بعد اب کون ہے وہ دُوسرا گواہ؟ خداوند عالم جانتا تھا کہ حضرت علیؑ تو ہمیشہ نہ رہیں گے۔ مگر "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" ہر وقت زندہ رہے گا۔ وہ جس کے پاس الکتاب کا علم ہے۔ غالباً آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ حضرت علیؑ تو ہمیشہ نہ رہیں گے، دُنیا علیؑ سے خالی ہو سکتی ہے مگر "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" سے دُنیا خالی نہیں ہو سکتی۔

نام نہ لیا، اس لئے کہ نام بدلیں گے۔ علیؑ کے بعد کوئی اور آئے گا۔ اُس کے بعد کوئی اور آئے گا۔ اِس وقت یہ زمانہ کے امامؑ، اُس وقت وہ زمانہ کے امامؑ، قائم مقام ہوتے رہیں گے۔ جو آئے گا، اُس کا نام کچھ ہی ہو، وہ "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" ہوگا۔ آیت حضرت علیؑ کے عہد میں آئی۔ اُنؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آئی، "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ"۔

حضرت علیؑ کے بعد آیت زندہ رہی۔ امام حسنؑ کی طرف اشارہ کرتی ہوئی نظر آئی، "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" خامس آلِ عبا کا زمانہ آیا۔ آیت کا رُخ اُنؑ کی طرف ہوا۔ "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ"، یہاں تک کہ آیت آج بھی ہے، نبوت آج بھی ہے۔ انکار شہادت آج بھی، نصاب شہادت آج بھی ہے۔

وہی خدا ہے (پہلا مقام) اور وہی "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" آج بھی ہے اور اُس کا نام بحمد للہ قائمؑ ہے، مہدیؑ ہے۔ آج اُس کی بقا سے نصابِ شہادت کی بقا ہے، "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابْ" سے زمانہ خالی نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

حضرات! گواہ کیلئے بیان ضروری ہے۔ جو وہ بولتا ہے، اُسے بیان ہی کہا

جاتا ہے اور یہیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب بیان ضروری ہے تو خداوند عالم نے خاموش کو گواہی میں نہیں پیش کیا۔ قرآن نے صامت کو گواہی میں نہیں پیش کیا۔ وہ تو خود اپنی پہچان کروانے کیلئے پہچان کروانے والوں کا محتاج ہے۔ کوئی پہچان کروائے تو کلام پہچانا جائے اور وہ شاہد ہے جو بول سکے، بیان دے سکے۔ اپنے اطمینان اور ثبات قلب کو پیش کر سکے۔ زمانہ یقیناً اُس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

کسی عہد میں اُس کا نام کچھ ہے اور کسی دُوسرے عہد میں اُس کا نام کچھ ہے۔ بدلتے رہیں گے مگر کام نہیں بدلے گا۔ نصاب شہادت اپنی جگہ رہے گا۔

اللہ، اللہ! چھٹے پارے میں یہ آیت ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے، چاہے وہ چھٹے پارے کی آیت ہو یا ساتویں پارے کی ہو یا آٹھویں پارے کی، یہ بات بڑی توجہ کے لائق ہے۔

طے یہ ہے کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی:

"وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا. قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ".

یہ آیت مکہ میں اُتری ہے اور یہ کہتی ہوئی اُتری ہے کہ رسولؐ! تمہاری گواہی کیلئے کافی ہے خدا اور وہ جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے۔ مکہ میں یہ آیت کہتی ہوئی آ رہی ہے اور وہ ہے تمہارا گواہ جس کے پاس ہے پوری کتاب کا علم۔

کتاب تو پوری ہوئی نہیں مگر گواہ وہ ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے۔ یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب جو پوری نہیں ہوئی، وہ ہمارے اور آپ کیلئے پوری نہیں ہوئی۔ مگر اللہ کیلئے پوری نہ ہو اور رسول اللہؐ کے دُوسرے گواہ کیلئے پوری نہ

ہو، یہ غلط ہے۔ ہم کچھ اور ہیں اور وہ کچھ اور ہیں۔ ہم آ کے پڑھتے ہیں، وہ پڑھ کر آتے ہیں۔ ہم آ کر بنتے ہیں، وہ بن کر آتے ہیں۔ ہماری ترقی آنے کے بعد ہے، چاہے بجا ہو یا بے جا لیکن وہ بلند ہو کر آتے ہیں اور علیؑ کہلاتے ہیں۔ جبھی تو آتے ہی قرآن سنتے ہیں: "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ"، ("وہ ہے دوسرا گواہ جس کے پاس الکتاب کا علم ہے)۔

میں یہاں کہے بغیر نہ رہوں گا کہ خدا کی الکتاب سے مراد کونسی کتاب ہے؟ کیونکہ یہی لفظ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر آیا ہے اور یہ اس عہد سے صدہا برس پہلے کے زمانہ کے بارے میں آیا ہے۔

جنابِ سلیمانؑ کا زمانہ ہے۔ آپؑ کو یہ اطلاع ملی کہ ایک ملک ہے ملکِ سبا۔ ایک ملکہ اُس ملک پر حکمران ہے۔ وہ لوگ آفتاب پرست ہیں۔ آپؑ نے فوراً نامہ انور ارسال کیا اور اُس میں اپنی نبوت کا اظہار کیا اور حکم دیا:

"وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ".

"فرمانبردار ہو کر میرے پاس پہنچو"۔

میرے پاس اسلام قبول کر کے پہنچو۔ اُدھر آپؑ نے دربار میں ارشاد فرمایا:

"کون تختِ بلقیس لے آئے گا جلد سے جلد"۔

ایک جن بولا کہ میں اُس کو لے آؤں گا (تختِ بلقیس کو)۔ قبل اس کے کہ آپؑ اپنے مقام پر کھڑے ہوں، قبل اس کے کہ آپؑ دربار ختم کریں۔

مہینوں کے راستے کو کتنی جلد یہ جن طے کرے گا۔ "آپؑ کا دربار ختم ہوگا کہ میں لے آؤں گا"۔

جناب سلیمانؑ چاہتے ہیں کہ اس سے بھی جلد آئے۔ یہ خواہش بے سبب تو نہیں ہے۔ بھروسا ہے کسی پر، اعتماد ہے کسی پر۔ کوئی لانے والا نظر میں ہے۔ نہ ہوتا تو چاہتے ہی کیوں؟ یعنی جناب سلیمانؑ دکھانا چاہتے ہیں کہ بشر کے مقابلہ میں اگرچہ قوتِ جن زیادہ ہے مگر علم کے مقابلہ میں طاقت کوئی چیز نہیں۔

فرمایا کہ نہیں، میں اس سے جلد چاہتا ہوں۔ اب قرآن یہ کہہ رہا ہے:

"قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ اَنَا اٰتِیْکَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ". (نمل: 40)

بول اُٹھا وہ جس کے پاس علم تھا کتاب کے حصہ کا، کتاب کے ایک جزو کا۔

وہ بولا، کیا عالم کے محاورے کو ختم کر دیا؟ حالانکہ زیادتی کا جلد سے جلد ہونے کا محاورہ چشم زدن ہے یعنی "آنکھ جھپکنے تک"، مگر اس محاورہ کو ختم کرتے ہوئے کہا: "میں لے آؤں گا تختِ بلقیس، قبل اس کے کہ آپ کی پلک جھپکے"۔ اور یہ وہ بول اُٹھا جس کے پاس کتاب کے ایک جزو کا علم تھا۔

اللہ، اللہ! وہ اتنا توانا اور اتنا قوی اور اتنی دسترس کہ ملکِ سبا سے ملکِ شام میں تختِ بلقیس کو پلک جھپکنے سے پیشتر پہنچا دے، اس بناء پر کہ وہ ایک جزوِ کتاب کا علم رکھتا ہے۔

مگر رسول کا گواہ "مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْکِتٰبِ"، اُس کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ جس کے پاس ہے الکتاب کا علم۔

تو حضرات! کیا وہ لفظ "مِنْ" جو وہاں آیا، وہ یہاں خدا کہنا بھول گیا؟ وہاں اُس نے کہا تھا:

"اَلَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتَابِ".

اگر وہ چاہتا تو لفظ "مِـنْ" یہاں بھی کہتا۔ مگر اُس نے جزو کو جزو کہا اور کُل کو کُل کہا۔

سرورِ کائنات سے جب استفسار کیا گیا کہ وہ کون تھا جس کے پاس جزو کتاب کا علم تھا اور یہ کون ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے تو آپؐ نے فرمایا:

"یہ دونوں وزیر ہیں۔ وہ ذکر ہے سلیمانؑ کے وزیر کا اور یہ ذکر ہے خود میرے وزیر کا یعنی سلطان المرسلینؐ کے وزیر کا"۔

حضرات! یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک کا وزیر اُس کی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ جبھی تو کہتے ہیں: "وزیرے چنیں شہریارے چناں"۔ وہ وزیر بقدرِ سلطنتِ حضرت سلیمانؑ اور یہ وزیر بقدرِ شانِ سید الانبیاء۔

سرکار فرماتے ہیں کہ یہ میرا وزیر ہے جس کے پاس الکتاب کا علم ہے اور وہ سلیمانؑ کے وزیر تھے جن کے پاس کتاب کے ایک جزو کا علم تھا۔ اُن کا نام تھا آصف بن برخیا۔ اِن کا نام ہے علی ابن ابی طالبؑ۔

اب حضرات! مجھے کہنے دیجیے کہ کسے علم ہو سکتا ہے اس بات کا کہ اُس وزیر کا علم کتنا تھا؟ دُنیا نہ جان سکی اور کیا جان سکتی؟ خدا جانے کہ پیغمبرؐ کیا کیا جانتے تھے اور آپؐ کے علم کے شہر کا در کیا کیا جاننے والا تھا؟

حضرات! میں نے اشارہ کیا تھا کہ یہی لفظ وہاں بھی آیا ہے، جناب سلیمانؑ کو اُس نے کہا جس کے پاس کتاب کے ایک جزو کا علم تھا۔ یہاں بھی لفظ کتاب آیا ہے۔ وہاں کونسی کتاب تھی کہ جس کے جزو کے علم کے اعتماد پر کہنے والے نے کہا؟ اس

لئے میں نے اشارہ کیا ہے کہ یہاں الکتاب سے مراد رموز سربستہ ہیں، اسرار الٰہیہ ہیں، علوم الٰہیہ ہیں جس کے تعبیر ہمارے پیغمبرؐ نے یہ کہہ کر فرمائی ہے کہ آصف بن برخیا ایک اسم جانتے تھے جس کی بناء پر یہ زور تھا اور میرا وزیر بہتر (72) اسماء کا عالم ہے۔ ایک اور بہتر (72) کا کیا موازنہ ومقابلہ ہو سکتا ہے؟

لفظ ''اسم'' کی تعبیر میں فرماتے ہیں کہ اسم علمِ باطنی ہے اور اس علم باطنی کا ایک جزو ہے قرآن! کون سمجھ سکتا ہے کہ علم باطنی کیا ہے اور وہ صاحب علم کیا ہے؟ معمولی معمولی بات اگر کبھی ظاہر ہوگئی ہے تو دُنیا حیران رہ گئی ہے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آیا کہ امیر علیہ السلام کسی سفر میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ سواری کیلئے راہوار آ گیا ہے، ایک رکاب میں پیر رکھ لیا ہے اور سوار ہونے کا ارادہ کر رہے ہیں کہ ایک عورت فریاد کرتی ہوئی آئی کہ مولاؑ! میں تو آپ کو تب جانے دوں گی جب آپ میرا فیصلہ کر دیں۔ میرے قضیے کا فیصلہ کر کے جائیں۔

آپ پیروں کو رکاب میں رکھتے ہوئے فرما رہے ہیں: تمہارا قضیہ کیا ہے؟

اُس نے کہا کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا ہے۔ چھ سو اشرفیاں اُس نے چھوڑی تھیں۔ آج جب وہ اشرفیاں تقسیم ہوئیں تو مجھے صرف ایک دی گئی ہے۔ میں انصاف چاہتی ہوں۔

آپ نے اسی طرح رکاب میں پیر رکھے رکھے فرمایا: ''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تیرے متوفی بھائی نے دو بیٹیاں چھوڑی ہوں، ایک ماں چھوڑی ہو، ایک زوجہ چھوڑی ہو اور تیرے بارہ بھائی ہوں؟''

اُس نے کہا کہ ایسا ہی ہے۔

فرمایا: "تیرا حق تجھے مل گیا ہے"۔

اُس نے کہا: "مولا! میری سمجھ میں تو نہیں آتا"۔

آپؑ نے فرمایا: "دو بیٹیوں کا حصہ دو ثلث یعنی چار سو اشرفیاں ہوا۔ ایک ماں چھوڑ گیا، ماں کا چھٹا حصہ سو اشرفیاں ہوئیں جو اُس کو مل گئیں۔ ایک اُس کی زوجہ تھی جس کا حق آٹھواں حصہ تھا۔ اُس کو پچھتر (75) اشرفیاں مل گئیں۔ باقی پچیس اشرفیاں بچیں، جس میں سے چوبیس اشرفیاں بارہ بھائیوں میں تقسیم ہوئیں، باقی ایک اُس کو ملی کیونکہ مرد کا حق عورت سے دُگنا ہوتا ہے، ہر بھائی کو دو دو اشرفیاں ملیں۔

تاریخ کے الفاظ ہیں کہ جس وقت امیرالمومنینؑ نے حساب بتایا ہے، مجمع آپؑ کو رُخصت کیلئے کھڑا تھا، سب نے بلند آواز سے کہا: "اللہ اکبر" اور لوگوں کی زبان پر یہ جملہ آیا:

"اِنَّهٗ مُعْجِزَةٌ مِنْ مُعْجِزَاتِ نَبِیٍّ"۔

یعنی اِدھر اس ضعیفہ نے سوال کیا کہ چھ سو اشرفیوں میں سے مجھے ایک ملی ہے اور آپؑ نے وہ پورا نقشہ پیش کر دیا ہے کہ جس میں صرف ایک اشرفی مل سکتی ہے اور "کہیں یہ صورت تو نہیں" کہہ کر۔ یہ علم لدنی کا حال نہیں ہے، یہ جودتِ طبع کا حال ہے۔ خدا جانے کہ جو اصلِ علم ہے، اُس کی شان کیا ہوگی؟ اُسی علم کے بھروسے پر تو اللہ نے رسولؐ کا گواہ بنایا ہے۔

حضرات! یہ جملہ پرلطف ہے، اب نہ کہوں تو کب کہوں گا؟ گواہ مدعی کے حسبِ حال ہوتا ہے۔ اچھا! اگر میں آپ سے پوچھوں کہ گواہ سچا اچھا ہوتا ہے یا جھوٹا؟ آپ کیا کہیں گے؟ یہ سوال غلط ہے۔ مدعی اگر جھوٹا ہو اور گواہ کہے کہ میں تو سچ کہوں

گا۔ اگر سچ کہے گا تو مدعی کا دعوی چوپٹ ہو جائے گا۔ جھوٹے مدعی کو جھوٹے گواہ کی ضرورت ہوتی ہے اور سچے مدعی کو سچے گواہ کی ضرورت ہے۔ اگر مدعی سچے سے سچا ہو تو گواہ بھی اتنا سچا ہو اور اگر مدعی صادقین کا صدر ہو تو جتنے بھی گواہ ہوں، وہ سب صادقین ہونے چاہئیں اور اُن صادقین کو اللہ کبھی نبی کی گواہی میں پیش کرے اور کبھی ہمیں حکم دے کر کہے:

"كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ".

صادقین کی پیروی ہم پر فرض کر دے۔ ایسے سچے ہوں تو اُن کا گواہ کیسا سچا ہوگا؟ گواہ ہمیشہ مدعی کے حسب حال ہوتا ہے۔ جیسا مدعی ہو، اُس کی شان کا گواہ ہونا ضروری ہے۔ دعویٰ اگر مال کا ہو تو بہتر ہے کہ گواہ مالدار ہو۔ دعویٰ اگر علم کا ہو تو ضروری ہے کہ صاحب علم گواہ ہو۔

حضرات! ایک بات سنی سنائی کہہ دوں یعنی عربی میں شاہد گواہ کو بھی کہتے ہیں اور دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ دو معنی ہو گئے۔ مگر میں یہ سمجھا کرتا ہوں اور کہا کرتا ہوں اور سمجھایا کرتا ہوں کہ معنی دو نہیں ہوئے۔ جو دیکھنے والا ہوتا ہے، وہی گواہ ہوتا ہے۔ معنی دو نہیں ہوئے۔ بڑے طمطراق سے گواہی دے دینے کے بعد ایک گواہ نے کہہ دیا کہ میں نے سنا۔ تو اُس بیان سے مدعی کے دعوے کو ختم کر دیا۔

لہذا ضروری ہے کہ وہ کہے کہ آنکھوں سے دیکھی بات کہہ رہا ہوں۔ چاہے دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو مگر اقرار تو اسی کا ہوگا۔ یہ گواہی کیسی ہے؟ نبی کی نہیں، نبوت کی ہے۔ یہ گواہی صرف نبوت کی نہیں بلکہ رسالت کی بھی ہے۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ نبی کے دیکھنے والے ہزاروں مگر اُن میں سے

کسی نے نبوت کو دیکھا ہے؟ اگر کوئی کہے کہ ہاں جی، دیکھا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نبوت آج کی ہے۔ آپ نے نبوت ملتے ہوئے دیکھا ہے:

"کُنْتُ نَبِیًّا وَ آدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ".

آدم نہ تھے مگر میں نبی تھا۔ اتنی قدیم نبوت اور اُس کا گواہ جدید ہو؟ ضروری ہے کہ وہ بھی ویسا ہی قدیم ہو۔ اس لئے خدائے قدیم نے گواہی میں اپنے آپ کو پیش کیا اور اپنے بعد اُس قدیم کو پیش کیا کہ جب نبوت مل رہی تھی، وہ موجود تھا۔ دُور نہ تھا، قریب تھا۔ جدا نہ تھا، ملا ہوا تھا، نبوت کا دیکھنے والا!

کیا کہنا اُس دیکھنے والے کا! حضرات! یہ بات تو سامنے کی ہے۔ مدعی تو معصوم ہے (نبوت کا دعویٰ کرنے والا معصوم ہے) گواہ کون ہو؟ کیا جائز الخطا معصوم کی گواہی میں پیش کیا جائے؟ اور پیش بھی کرے تو اُسے خدا پیش کرے؟ فوراً سوال ہوگا کہ بارالہا! تجھے کوئی معصوم نہیں ملا؟ اگر نہیں مل سکتا تھا تو تو پیدا کر سکتا تھا۔

حضرات! یہی وجہ ہے کہ جب کسی معصوم کو گواہی کی ضرورت پیش ہوتی تو خدا نے گوارا نہیں کیا کہ کسی غیر معصوم کو گواہ بنا دے۔ جناب مریم معصومہ ہیں، اُن کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہونے لگے۔ ضرورت پیش آئی کہ شاہد بن کر کوئی بولے۔ کون گواہ قرار پائے؟ وہ معصومہ ہیں تو کوئی معصوم گواہ ہو۔ اب معصوم گواہ وہ ہے جو سن کے اعتبار سے بھی معصوم اور منصب کے اعتبار سے بھی معصوم۔ جناب عیسیٰؑ ابن مریم گہوارے میں ہیں۔ نبوت اور عصمت کی گواہی دے رہے ہیں۔

غور فرمایئے کہ جب مریم کا گواہ غیر معصوم نہ ہو تو سیدُ الانبیاء کا گواہ کیسے غیر معصوم ہو سکتا ہے۔ جناب یوسفؑ کے متعلق مسئلہ پیش ہوا۔ اُلٹی شکایت جناب یوسفؑ

کی ہو رہی ہے۔ ضرورت پیش آئی تو پاکدامن کیلئے مناسب تھا کہ پاک دامن کی گواہی ہو۔ اب یوسف معصوم ہیں اور قدرت کا قانون ہے کہ معصوم کی گواہی معصوم ہی دے۔ لہٰذا:

"شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا".

ایک دودھ پیتا بچہ جو سن اور سال کے اعتبار سے یقیناً بے خطا ہے، وہ گواہ ہے اور اس معنی میں معصوم کہا جاتا ہے۔ قدرت نے اُسے گوہر افشاں کیا۔ اُس کے لبوں میں حرکت پیدا ہوگئی اور اُس نے کہا، جو کچھ کہا۔

تو جب یوسفؑ کا گواہ معصوم، مریم کا گواہ معصوم تو وہ نبیؐ جو مرکزِ عصمتِ کل ہے، اُس کا گواہ غیر معصوم ہو؟ یقیناً وہ گواہ ہے جس کی شان ہے:

"يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً".

حضرات! یہ وہی گواہ ہے جس کا ذکر دُوسری آیت میں یوں کیا جاتا ہے:

"اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ".

اس نبی کی شان میں کیا شک ہو سکتا ہے جو قرآن جیسا معجزہ لے کر آئے۔ یہاں بھی قرآن کا ذکر آیا ہے مگر اُس کو معجزہ قرار دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس نبی کی نبوت میں بھی کوئی شک ہے کہ جس کے پیچھے آ رہا ہو "يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ" (ایک گواہ اُسی میں سے) جو اللہ کی جانب سے ہو، جو اللہ کا بھیجا ہوا ہو۔ یہ ساتھ آتا نہیں ہے، گواہ کا پیچھے پیچھے آنا مذکور ہے۔ جب شاہد پیچھے پیچھے آ رہا ہو تو مدعی بار بار پیچھے مڑ کر دیکھے گا یعنی انتظار کرے گا۔ ابھی دعویٰ پیش نہ کروں، گواہ نہیں آیا۔ رُخ گواہ کی طرف ہو گا۔ جب پتہ چلے کہ آ رہا ہے تو مدعی چین سے نہ بیٹھے گا، بیقرار ہو کر نکلے گا۔

اطلاع مل گئی کہ گواہ آ گیا ہے، خدا کے گھر سے آیا، خدا کے گھر میں آیا۔ پیغمبرؐ بڑھے چلے جا رہے ہیں اور گواہ کی نظر بھی پر کیف! آ گئے ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں۔ نظر میں کوئی ہے، چاہتے ہیں کہ جب آنکھ کھلے، مدِ نظر نبوت رہے۔ آنے والے کا نقطۂ نظر نبوت ہے۔ آنکھیں بند ہیں، ساتھ ہی لب بھی بند ہیں۔ ماں کا دودھ نہیں پیا۔ بہترین غذا کی تلاش ہے۔ آتے آتے جن کا معیارِ فکر اتنا اونچا ہے کہ غذا کے معاملہ میں بھی رسولؐ کے سوا کسی سے لینے پر راضی نہیں۔

حضرات! ماں کا دودھ کچھ کم ہے؟ جس معظمہ کو اللہ نے یہ شرف دیا ہو کہ اُسے علیؑ کی ماں قرار دیا ہو، اُم الآئمہ ہیں جناب فاطمہ بنت اسد۔ یہ وہ معظمہ ہیں جو جدارِ کعبہ کے اشارے کو سمجھ گئیں۔ نہ گھبرائیں، نہ قدم پیچھے ہٹا۔ آگے بڑھا اور ایسی صاحبِ شرف و نجابت ہیں کہ شیر کی بیٹی ہیں اور شیر کی والدہ بھی ہیں۔ یعنی جہاں معظمہ بنت اسد ہیں، وہاں اُمِ اسد بھی ہیں (یعنی اسد کی بیٹی بھی ہیں اور اسد کی ماں بھی)۔ جو اِن سے پیدا ہو، وہ بھی شیر اور جس سے یہ پیدا ہوئیں، وہ بھی شیر۔ کیا کہنا اُن کے مرتبہ کا اور حضرات! میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ یہ آئمہ کی ماں ہیں۔

اس معظمہ کا مدینہ میں جب انتقال ہوا ہے تو حضرت علیؑ نے جناب رسولؐ خدا کی خدمت میں جا کر کہا:

"مَاتَتْ اُمِّیْ".

''میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے''۔ تو رسولؐ نے فرمایا:

"بَلْ مَاتَتْ اُمِّیْ".

''علیؑ! تمہاری ماں نہیں، میری ماں کا انتقال ہوا ہے''۔

اس معظمہ کو رسولؐ نے اپنی ماں کہا، اگر کوئی کہے کہ کہہ ہی تو دیا، عرض کروں گا

کہ کس نے کہہ دیا؟ آپ کہنے والے کو نہیں دیکھتے کہ کس نے کہا؟ ارے کہہ ہی تو دیا:

"وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ".

"رسولؐ کی ازواج اُمت میں شامل لوگوں کی مائیں ہیں"۔

اُمت کے لوگ ان کے پیٹ سے تو نہیں پیدا ہوئے۔ کہہ ہی تو دیا ہے کہ ازواج رسولؐ اُمتی مسلمانوں کی اُمہات ہیں، تو اُمہات المومنین کوئی کم شرف تو نہیں ہے۔ اگر کوئی اور معظمہ ہو جسے رسولؐ نے اپنی ماں کہا ہو، ایک اُمت کی ماں اور ایک رسول کی ماں!

مگر یہ علیؑ آپ کی ماں اور آپؑ کی نظر ایسی بلند کہ کسی بہتر غذا کی تلاش میں ہیں مگر آپؑ آنکھ نہیں کھولتے۔ اگر آپؑ آنکھ کھولتے تو دیکھتے کہ بہترین ماں ہیں۔ مگر کسی بہتر سے بہتر چہرے کی اور آپؑ کو بہتر سے بہتر غذا کی تلاش ہے۔

بڑھا دیئے گئے، رسولؐ خدا کی گود میں آ گئے۔ کون تھا بتانے والا کہ تم رسولؐ کی گود میں آ گئے؟ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ دیکھ کر پہچان لیا، آنکھیں تو بند تھیں۔ اس حالت میں دیکھنے کا لفظ منطبق نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ دیکھ کر پہچان لیا بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ پہچان کر دیکھا اور دیکھ کر نہیں گئے بلکہ جان لینے کے بعد دیکھا۔ اسی بناء پر ایک عالم اہل سنت کا شعر مجھے یاد آ رہا ہے:

نخست آں شاہِ دیں شیر خدا شیرے کہ نوشیدہ

چکیدہ از زبانِ پاکِ احمد سرورِ عقبیٰ

"سب سے پہلے اس شاہِ دین، شیر خدا نے جو دودھ پیا، وہ زبانِ پاک حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ٹپکا ہے"۔

پیغمبرؐ نے اپنی زبان علیؑ کے دہن میں دے دی۔ بظاہر تو اس زبان کو چوسا اور امیرالمومنینؑ نے غذا حاصل کی۔ مگر محاورہ ہے کہ زبان دے دی گئی۔ خدا جانے کیا کیا وعدے ہو گئے، کیا کیا قول ہو گئے، کیا کیا معاہدے ہو گئے!!! حضرت علیؑ اس غذا کی آرزو میں تین دن بغیر غذا کے رہے۔ آتے آتے برداشت کا عالم دکھایا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ ھل اتیٰ میں ایک لفظ آتا ہے:

"وَجَزٰاھُمْ بِمَاصَبَرُوْاجَنَّۃً وَّحَرِیْرًا"۔

بارالٰہا! کیوں دی تو نے جنت ان حضرات کو؟

جواب ہوگا: اس لئے کہ صابر تھے۔ قرآن سے پوچھئے کہ کیوں اُن کو امامت دی تو قرآن کہتا ہوا نظر آئے گا:

"وَجَعَلْنَامِنْھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَالَمَّاصَبَرُوْا"۔

وہ امام قرار دیئے گئے جو ہمارے امر سے ہدایت کرتے ہیں اور اگر ہم پوچھیں کہ اُن کو امامت کیوں دی تو جواب ہے: "لَمَّاصَبَرُوْا"۔

لہٰذا ظاہر ہوا کہ امامت صبر کی بناء پر ملی، جنت بھی صبر کی بناء پر ملی۔ آج ہم مل کر اُن پر درود بھیج رہے ہیں، یہ شرف کہاں سے ملا؟ تو فرمایا جاتا ہے:

"وَبَشِّرِالصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآاَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓااِنَّالِلّٰہِ وَ اِنَّآاِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ"۔

"رسولؐ! بشارت دو اُن صابرین کو کہ جب ان پر وقوع مصیبت ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"۔

"اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ"۔

"یہی میرے بندے ہیں جن پر میرا درود و سلام ہے"۔

اب حضرات! آپ کو راہِ حقیقت دیکھنے کیلئے کتنی مشعلیں مل گئیں؟ صلوٰت ان حضرات پر ہیں جو صابر ہیں، امام کون ہیں؟ جو صابر ہیں۔ جنت کا مالک کوئی اور ہو، درود کا مستحق کوئی اور ہو، امامت کے پانے والے کوئی اور ہوں! جب ہر جگہ ہر چیز کا معیار صبر ہے تو صابرین ہیں جنہیں جنت دی جاتی ہے، امامت دی جاتی ہے۔ ہمارا درود و سلام کیا ہے؟ اُن کیلئے صلوات و درود اُن کے رب کی جانب سے ہے۔ ربانی صلوات کا نزول ہوتا ہے، کن پر؟ جو کہتے ہیں:

"اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ".

حضرات! کیا کہوں؟ آپ ان صابرین کے دامن تک پہنچ گئے۔ آیت امیر المومنین علیہ السلام کی شان میں آئی تھی۔ جب برادرِ حقیقی حضرت جعفر طیارؑ کی شہادت کی خبر سنی تو پہلی بار یہ جملہ حضرت علیؑ کی زبان پر آیا۔ اس وقت تک یہ آیت قرآن نہیں بنا تھا۔ حضرت علیؑ کا یہ قول کلامِ خدا بن کر اُترا اور حضرت علی علیہ السلام کی شان میں آیت بشارت دیتی ہوئی اور قولِ علیؑ کو درج کرتی ہوئی اُتری۔ مگر امام حسین علیہ السلام نے اس آیت کو اپنا لیا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے کتنی مرتبہ روزِ عاشور کہا ہوگا:

"اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ".

اگر میں کہوں کہ ایک ایک فدائی کی شہادت پر ایک ایک دفعہ کہا، تب بھی کتنی بار کہا! ایک ایک فدائی کی شہادت پر ایک ایک بار کیوں کہا ہوگا؟ جب شہادت کی خبر آتی ہوگی، تب کہتے ہوں گے:

"اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ".

نہ معلوم کتنی بار کہا اور کب کب کہا۔

حضرات! مجھے اس وقت ایک لفظ یاد آ رہا ہے۔ ذرا توجہ فرمایئے گا۔ حضرت علی اکبرؑ کے شہید ہونے کا واقعہ جانکاہ تھا۔ یہ وہ شہید ہیں کہ جب علی اکبرؑ کی سواری چلی ہے تو باپؑ نے بیٹے کو سجا کر بھیجا۔ لباس اور سلاح جنگ کو درست کر کے بھیجا۔ باپؑ نے بیٹے کی رکاب تھام کر سوار کیا۔ یاد تو آیا ہوگا کہ بیٹے کی رکاب میں تھام رہا ہوں مگر میری رکاب کو تھامنے والا کوئی نہ ہوگا۔ باپؑ نے بیٹے کو سوار کروایا اور جب سواری چلی، راہوار علی اکبرؑ جا رہا ہے اور باپؑ باقلب مضطرب پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔

چلتے چلتے حضرت علی اکبرؑ نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور دیکھا کہ پدر بزرگوار آ رہے ہیں۔ رُک گئے اور پوچھا: بابا! کچھ فرماتا ہے؟ فرمایا: نہیں بیٹا، تم بڑھو۔

وہ چند قدم اور بڑھے، پھر منہ پھیر کر دیکھا کہ بابا پیچھے آ رہے ہیں۔ پوچھا: بابا جانؑ! کچھ فرماتا ہے؟ فرما دیجئے۔ فرمایا: نہیں بیٹا، مجھے تم کو کچھ نہیں کہنا ہے، تم آگے بڑھو۔

امامؑ کا مقصد یہ تھا کہ جب تک علی اکبرؑ کو دیکھ سکوں، دیکھتا رہوں۔ نگاہ حسرت آلود سے دیکھ رہے ہیں۔ مایوس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ نقشہ ہستی ہم شکل پیغمبرؐ مٹا جاتا ہے، اس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ سواری اوجھل ہوگئی اور حسینؑ یکہ و تنہا رہ گئے۔ جناب علیؑ اکبر مصروف کارزار ہیں۔ لڑتے لڑتے پیاس کی شدت محسوس فرمائی۔ تنہائی کا عالم تھا، علیؑ کے پوتے ہیں، علیؑ کی شان دکھا رہے ہیں۔ حرب وضرب آپؑ کا وہ کارنامہ تھا جو قیامت تک یاد رہے گا۔

لڑتے لڑتے یہ خیال آیا کہ باپؑ کو اکیلا چھوڑ کر آیا ہوں، اب تک یہ مسلوم

نہیں آیا تھا۔ جو آتا تھا، کسی کو امام کے پاس چھوڑ کر آتا تھا۔ مگر علی اکبر جب آئے تو کسی کو چھوڑ کر نہیں آئے۔ جناب علی اکبر کو خیال آیا کہ اگر خاک پر پڑے ہوں گے تو کوئی اُٹھانے والا نہیں ہے اور اگر بیقرار ہوں گے تو کلام کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ذرا اس بیکس و تنہا باپ کو دیکھ تو آؤں۔

یہ سوچ کر آپ نے راہوار کو موڑا، بابا کی خدمت میں حاضر ہوئے، باپ نے بیٹے کو دیکھا اور فرمایا: بیٹا! مزاج کیسا ہے؟ فرمایا: بابا! پیاس نے مجھے ہلاک کر دیا ہے۔ جسم پر لوہے کے جو ہتھیار ہیں، آگ بن کر جلا رہے ہیں۔ اگر ایک گھونٹ پانی بہم پہنچ سکتا تو میری گئی ہوئی طاقت واپس آجاتی اور میں دشمن کیلئے قوی سے قوی تر ہو جاتا۔ امام نے سنا اور بیٹے کو فرمایا:

"پارۂ جگر! تمہاری پیاس کا زمانہ رہ کتنا گیا ہے؟ وہ وقت بہت قریب آرہا ہے کہ تم ساقیِ کوثر کے ہاتھوں سیراب ہوگے"۔

یہ بات سن کر علی اکبرؑ نے کہا: بابا! جب میں بڑھ بڑھ کر میدان میں حملے کرتا ہوں تو میرے کان میں یہ آواز آتی ہے:

"مَرْحَبًا بِکَ یَاوَلَدِیْ وَقُرَّۃَ عَیْنِیْ"۔

"مرحبا میرے بیٹے، شاباش میرے پارۂ جگر اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک"

چاروں طرف دیکھتا ہوں کہ کس کی آواز آرہی ہے مگر میدان میں کوئی کہنے والا نظر نہیں آتا۔ مگر ہوتا یہی ہے کہ جب بڑھ کر حملہ کرتا ہوں، کہنے والا کہتا ہے: شاباش میرے بچے، میری آنکھوں کی ٹھنڈک"۔ بابا! فرمایئے کہ یہ آواز کس کی ہے؟ فرمایا: "بیٹا! تم نے نہ پہچانا؟ یہ تمہارے جدِ امجد حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ

ہیں۔ یہ علی مرتضیٰ کی آواز ہے۔ وہ اپنے فرزند کی جنگ دیکھ رہے ہیں اور اُس کی شجاعت کی داد دے رہے ہیں۔ شاباش کہتے ہیں اور مرحبا کے لفظوں سے داد دے رہے ہیں۔ امیر المومنینؑ اس نظر سے بھی مرحبا کہتے ہیں اور فرماتے ہیں: علی اکبرؑ! میں بھی بہت جنگوں میں لڑ چکا ہوں مگر تین دن کی بھوک پیاس میں یک و تنہا نہیں لڑا۔

بس اس بیان کو جب جناب علی اکبرؑ نے سنا تو اپنے راہوار کو موڑا، میدانِ جنگ میں واپس تشریف لے گئے اور حملہ پر حملہ کرنے لگے اور زخم پر زخم کھانے لگے۔ خون جسم سے بہنے لگا اور نوبت یہ آگئی کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکے مگر غیرت گرنے نہ دیتی تھی۔ گھوڑا آپؑ کو کبھی اِدھر لے جاتا اور کبھی اُدھر لے جاتا۔ جس طرف آپؑ کا گھوڑا جاتا، حملے ہوتے رہتے تھے اور تلواریں ٹوٹ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ جناب علی اکبرؑ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

بالآخر جب گرنے لگے اور ہاتھ چھوٹنے لگے تو آپؑ نے آواز دی:

"یَا اَبَتِ عَلَیْکَ مِنِّی السَّلَامُ".

❁❁❁

ساتویں

مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ".

میں نے اس آیت کو عنوانِ کلام قرار دیا ہے، خصوصاً اس بناء پر کہ یہ مقدس مجلس، جس کی نسبت امامین علیہما السلام سے ہے، اُن حضرات کے فضائل کو اور اُن کے عمل کو اس آیہ مبارکہ سے مخصوص نسبت ہے۔ یوں تو آیت کے دامن میں معدنِ رسالت کے وہ موتی ہیں جن کی آب و تاب کا مقابلہ کون ہے جو کر سکے۔ ہر گوشہ آیت میں وہ ملتا ہے جسے عصمت مآب کہا جائے تو بجا ہے۔ انتہائے عصمت مخصوص انداز کی ترکیب ہے۔ اس آیت میں تین گوشے رکھے: "اَبْنَآءَنَا" پہلے، "نِسَآءَنَا" اس کے بعد، "اَنْفُسَنَا" سب کے بعد۔

اس کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ خداوند عالم اس آیہ مباہلہ میں اور اس آیہ مبارکہ میں سب سے پہلے ابنائے رسول کی تجلی پیش کرنا چاہتا ہے۔ آیت کی ترتیب یقیناً بدلی ہوئی ہے۔ جو سب سے چھوٹے ہیں، وہ سب سے پہلے مذکور ہیں، جو ذات اُن سے بڑی ہے، وہ اُن کے بعد ہے اور جو ذات سب سے بڑی ہے، وہ سب کے بعد ہے۔ بظاہر ہونا یہ چاہئے تھا کہ تقدیم میں سب سے بڑے رکھے جاتے، پھر اُن سے چھوٹے اور بالآخر سب سے چھوٹے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے جو صورت نزولِ قرآن کی پسند کی، وہی صورت اس قرآنِ ناطق کے اظہار کیلئے

پسند کی۔

غالباً آپ سمجھے نہیں۔ حضرات! قرآن مجید وہ کتاب محکم ہے جس کا نزول دفعۃً اور کلیۃً ایک مرتبہ نہیں ہوا، یہ تھوڑا تھوڑا آیا۔ جتنا آیا، وہ کتاب ہی کہلایا۔

نزولِ قرآن کی صورت بین الفرق یہ ہے کہ سب سے پہلے جو سورتیں آئیں، وہ چھوٹی سورتیں ہیں، اگرچہ وہ چھوٹی چھوٹی سورتیں موجودہ ترتیبِ قرآن کے لحاظ سے بالکل آخر میں ہیں۔ خداوند عالم نے جن سورتوں کو اوّلیت عطا کی تھی، اس عالم کے بگڑے ہوئے نظام نے اوّل کو آخر بنا دیا۔ اُتری وہ پہلے تھیں مگر آخر میں رکھ دی گئیں۔

میرے خیال میں قرآن اپنی زبانِ بے زبانی سے قیامت تک یہ آیت پڑھتا رہے گا جس کو عام طور پر اتنا ناز رہا ہے کہ ہمارے لئے وہی بس ہے یعنی:

"حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ".

تم نے اپنا بس مجھ پر بھی تو چلایا۔ تم نے میری ترتیب کو بھی تو تنزیل کے مطابق نہ رہنے دیا۔ میرے اوّل کو آخر کر دیا۔ کوئی اور تم سے کیا اُمید رکھے کہ جو جس کی جگہ ہوگی، وہ نہ بدلی جائے گی۔

چھوٹی سورتوں کا نزول پہلے ہوا تو آج وہ ابتدائی سورتیں بالکل آخرِ قرآن میں ہیں جن کے بعد کوئی سورت ہی نہیں۔ اوّل کو آخر کر دیا اور کیسے کہہ دوں کہ نہ جان کر کر دیا۔ اگر نہ جاننے کی بناء پر کیا ہوتا تو سورتوں کی ابتدائی آیت سے قبل کیوں لکھا جاتا کہ یہ سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔

حضرات! تمام سورتوں کی ابتداء میں ایک سرخی ہوتی ہے کہ یہ سورت کہاں

اُتری! مدینہ میں اُتری تھی یا مکہ میں اُتری۔ قرآن کی وہ سورتیں جو آج ابتدائی سورتیں ہیں، اُن پر برابر لکھا ہوا ہے کہ اُن کا نزول مدینہ میں ہوا ہے۔ جب ان آیات کا نزول مدینہ میں ہوا ہے تو یہ اوّلِ قرآن کیسے بنا؟ آخری سورتوں کیلئے جابجا مرقوم ہے کہ یہ آیتیں مکہ میں نازل ہوئیں، تو یہ حقیقت ذہن میں محفوظ تو ہوگی کہ رسالت مآبؐ مدینہ سے تو مکہ میں منتقل نہیں ہوئے بلکہ مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تھی۔ اس لئے اوّلِ قرآن مکی اور آخر قرآن مدنی ہے مگر موجودہ ترتیب کے مطابق مدنی حصہ قرآن پہلے ہے، مکی اُس کے بعد میں ہے۔

لہٰذا قرآن زبانِ بے زبانی سے کہہ رہا ہے، وہ کہتا رہے گا کہ تمہارے خلاف فریاد کیلئے میں اپنی جگہ کافی ہوں۔ اوّل کو آخر کیا لیکن الٰہی ارادوں کی جان دیکھئے کہ جب بچے کو پڑھانے بیٹھے تو فوراً محسوس کرنا پڑا کہ بڑی سے بڑی سورتیں پہلے کیسے پڑھائی جائیں؟ بچے کی ابھی ابتداء ہے۔ ابتداء میں انتہا کیسے سامنے رکھ دی جائے؟ آخر اُس آخر کی طرف آنا پڑا جسے قدرت نے اوّل قرار دیا تھا۔

اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ ترتیب بدل تو دی جاتی ہے مگر جب مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے تو وہی اوّل یاد آتا ہے۔ مشکل کشائی اُسی سے ہوتی ہے۔ دُنیا لاکھ اُسے آخر بنا دے، مگر دُنیا مجبور ہو کر اُس کی اوّلیت کیلئے آمادہ ہوتی ہے۔

جو صورت قدرت نے ظہورِ قرآن کی پسند کی تھی کہ پہلے چھوٹی سورتیں ظاہر کی جائیں، وہی صورت قدرت نے مباہلہ کے میدان میں قرآنِ ناطق کے ظہور کیلئے پسند کی۔ ظہورِ قرآن اُس کا نزول ہے۔ پہلے چھوٹی سورتیں نازل ہوئیں اور پروردگار نے مناسب خیال کیا کہ پہلے وہ ظاہر کی جائیں۔ اسی طرح میدانِ مباہلہ میں خداوند

عالم نے صحیفہ ناطق کا لفظ استعمال کیا۔ اُس کے بعد "نِسَآءَ نَا" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اُن کی والدہ کا ذکر فرمایا اور آخر آیت میں بچوں کے والد کی طرف متوجہ کرنے کیلئے "اَنْفُسَنَا" کا لفظ استعمال کیا۔ یعنی چھوٹوں سے بڑوں کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔ کیوں نہ میں اس مقام پر کہہ دوں کہ خداوند عالم نے ترتیب کلام میں چھوٹوں کو مقدم قرار دے کر یہ ظاہر کردیا کہ امتیاز کبر وسن اس گھرانہ میں ہے ہی نہیں۔

جیسا کہ ختمی مرتبتؐ نے اپنی ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

"صغیرنا وکبیرنا سواءٌ".

"ہمارے گھرانے کے چھوٹے بڑے سب برابر ہیں"۔

اُسی انداز میں پروردگار نے ابتداء اُن سے کی جو صغیر تھے۔ اُنہی کو پہلے دکھایا۔ اشارہ یہ تھا کہ حقانیت کا نقش اُنہی کے چہروں پر پہلے دیکھو۔

لہٰذا حضرات والا! جب آیت میں "اَبْنَآءَ نَا" سب سے پہلے ہیں تو ان کے کچھ نام بھی ہیں۔ جب نام لئے جائیں گے کہ کون ہیں یہ ابنائے رسولؐ؟ کیا نام ہیں ان "اَبْنَآءَ نَا" کے؟ تو لامحالہ کہا جائے گا: حسنؑ، حسینؑ۔ اور جب یہی کہا جائے گا تو میرا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ آیت مباہلہ میں سب سے پہلے حسنؑ ہیں۔ اس لئے میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ اس آیت کا ربط ہر معصوم سے ہے مگر آیت کی ابتداء رسولؐ کے سبط اکبر سے ہورہی ہے جو مباہلہ میں نبیؐ کے ساتھ بھیجے جارہے ہیں۔ فہرست کے کنارہ پر سرفہرست حضرت امام حسنؑ کا نام آئے گا۔

میں یہ جانتا ہوں کہ قلب عالم نے کبھی تن تنہا اپنی ذات کو "ہم" نہیں کہا۔ آپ کا قول آخر "اِنِّیْ تَارِکٌ" ہے۔ اس کا ترجمہ کیا ہے؟ "یقیناً میں چھوڑ رہا ہوں"

قرآن میں بھی جا بجا جب نبیؐ سے کچھ کہلایا گیا ہے تو "قُلْ لَا نَسْئَلُكُمْ" کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ "قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ"؛ "اے رسولؐ! کہہ دو کہ میں اپنی تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا"۔ "میں نہیں چاہتا"، واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ غرض کلام یہ نہیں ہے کہ ہم نہیں چاہتے۔ جا بجا آیات قرآنی کا مطالعہ اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے اور احادیث نبویؐ سے بھی یہی امر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

"اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا".

"میں علم کا شہر ہوں"۔ یہ تو نہیں فرمایا کہ ہم علم کے شہر ہیں۔

"اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ".

"میں حکمت کا گھر ہوں"۔

جب نبیؐ مرسل کی زبان پر کبھی لفظ "ہم" نہیں آیا، جبکہ تنہا اپنی ذات کا ذکر فرمایا، ہمیشہ "میں" کہہ کر خطاب کیا مگر آج قدرت جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ ایک نیا لہجہ ہے:

"تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ كُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ".

بلاتے ہیں ہم اپنے بیٹوں کو (اُن کو جو ہمارے بیٹے ہیں) اپنی عورتوں کو اور اپنے نفسوں کو۔

ظاہر ہے کہ اس "ہم" میں نصاریٰ کے لوگ شریک نہیں ہیں کیونکہ اُن کیلئے ہر جگہ لفظ الگ آ رہا ہے۔

"اَبْنَآءَ نَا وَاَبْنَآءَ كُمْ وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ كُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ".

ہمارے بیٹے اور تمہارے بیٹے (تو اَبْنَآءَ کُمْ میں ابنائے رسول نہیں ہیں)
اور" اَبْنَآءَ نَا" میں ابنائے نصاریٰ نہیں ہیں۔ اسی طرح" نِسَآءَ نَا" میں نصاریٰ کی عورتیں شامل نہیں ہیں اور" نِسَآءَ کُمْ" میں رسول کی کسی نساء کا ذکر نہیں ہے بلکہ نصاریٰ کی عورتوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

جہاں" اَنْفُسَنَا" میں نصاریٰ کی کسی شخصیت کا ذکر نہیں،" اَنْفُسَکُمْ" میں نصاریٰ کے نفوس کا ذکر ہے مگر رسولؐ کے نفوس کا ذکر" اَنْفُسَنَا" میں ہو چکا ہے۔

مباہلہ کے دن خدا حکما لہجہ پیغمبر کو بدل رہا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے کہ کہو تو اس طرح سے کہو۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر تو اس لئے ہیں کہ جس طرح اُن سے کہلوایا جائے، اُسی طرح کہہ دیں۔ مقامِ امر میں عہد ہے کہ جس عنوان سے کہلایا گیا ہے، اُسی عنوان سے پیغمبرؐ نے فرمایا۔" ہمارے بیٹے، ہماری عورتیں، ہماری جانیں"۔

میں استدلال قرآنی کی روشنی میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ خداوندِ عالم نے سورۂ مزمل میں اپنے اس پیغمبر کو تمام انبیاء میں سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تشبیہ دی ہے:

"اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا"۔

نبوت کے اعتبار سے ہر نبی سے تشبیہ دی جا سکتی تھی مگر خداوندِ عالم نے مقامِ تشبیہ میں صرف حضرت موسیٰؑ کو منتخب کیا اور کہا کہ تمہاری طرف جو رسول بھیجا گیا ہے، ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی ہدایت کیلئے ایک رسول بھیجا تھا۔

اب حضرات! کیا کہوں؟ ایک سیدھی سی بات آ رہی ہے اور اُس سے آپ

بھر پور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیتِ مذکورہ میں صرف نبی کو نبی سے تشبیہ نہیں دی گئی بلکہ پورے جملہ کو مشبہ اور دوسرے پورے جملہ کو مشبہ بہ قرار دیا گیا ہے۔

"اِنَّا اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلاً شَاهِداً عَلَيْكُمْ"

کو پورا جملہ مشبہ قرار دینے کے بعد فرمایا جاتا ہے:

"كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً"

جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم تین حجتیں پیش کر رہا ہے۔ یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو بھیجنے والا وہاں تھا، وہی بھیجنے والا اس رسول کا ہے۔ جیسا وہ رسول تھا، ویسا ہی یہ بھی رسول ہے اور جیسے کی طرف اُس کو بھیجا گیا تھا، ویسے ہی کی طرف اِس رسول کو بھیجا گیا ہے۔ "اِلَيْكُمْ" کی تشبیہ آلِ فرعون کی طرف ہے، "رَسُوْلاً" کی تشبیہ رسول کی طرف ہے۔ وہی مرسل جو وہاں تھا، وہی مرسل یہاں ہے، ویسے ہی مُرْسَلْ اِلَيْهِمْ یہاں ہیں جیسے وہ تھے جن کی طرف حضرت موسیٰؑ کو بھیجا گیا تھا۔

کہنے والا بے شک یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں تو کوئی نام کا فرعون موجود نہیں ہے مگر حضرات! فرعون کی بدنامی اُس کے نام کی بناء پر نہیں ہے بلکہ اُس کے کام کی بناء پر ہے۔ فرعون نام کا کوئی اور یہاں نہ ہو مگر فرعونیت موجود ہے اور فرعونیت کیا ہے؟ مختصراً یہ ہے کہ بہتر سے بہتر نہ ہونا عیب نہیں ہے، کسی کا عالم نہ ہونا اس کیلئے عیب نہیں ہے، کسی کا کسی مخصوص خاندان سے نہ ہونا اس کیلئے کوئی عیب نہیں ہے، عیب جب ہوگا کہ جو نہ ہو، اُس کا دعویٰ کرتا ہو۔

اگر میں عالم نہیں ہوں، کوئی عیب نہیں ہے۔ مگر کب تک نہیں ہے؟ جب تک اپنے آپ کو عالم نہ کہوں۔ حضرات! اگر کوئی امام نہیں ہے تو اُس کا امام نہ ہونا کوئی

عیب نہیں ہے۔ عیب تب ہوگا کہ جب یہ کہہ دے کہ میں امام ہوں۔ نبی نہ ہوتا کوئی عیب نہیں ہے۔ مگر جب عیب ہو جائے گا جب یہ کہہ دے کہ نبی ہوں۔

بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ جب تک نہ کہا تھا، اُس وقت تک کچھ تو تھا مگر جب کہہ دیا تو کچھ نہ رہا۔ میں اپنے آپ کو امام نہیں کہتا، مسلمان تو ہوں، دیندار تو ہوں مگر جب یہ کہہ دیا کہ میں امام ہوں تو جو تھا، وہ بھی نہ رہا۔ وہ بھی غصب ہو گیا۔ قناعت ضروری ہے۔ جو ہو، وہی رہے۔ آگے بڑھ کر کہے گا، یہی فرعونیت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ فرعونیتیں یہاں چھپی ہوئی ہیں اور دعوے ہونے والے ہیں جو حد سے بڑھ کر ہوں گے۔ دعویٰ کرنے والے جو کچھ دعووں کے بغیر تھے، وہ بھی نہ رہیں گے۔

حضرات! بات ذرا سی توجہ کے لائق ہے۔ اگر مدعی نہ بنے تو عیب چھپ جاتے ہیں۔ معاذ اللہ! میں اگر ایک دن قحبہ خانے چلا جاؤں، چھپائے نہ چھپے، طشت ازبام ہو جائے۔ کیوں ہو جائے؟ اس لئے کہ میں اتقی اور پرہیزگاری کا، زبان سے نہ سہی، اپنے لباس سے اور اپنے مقام سے تقویٰ اور پرہیزگاری کا مدعی ہوں۔ ادعا عیب کو ظاہر کر دیتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔ بہرحال یہ بات مسلّم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ثابت قدم حضرات کی اقلیت تھی اور غیر ثابت قدم حضرات کی اکثریت تھی۔ وہ کون کون تھے؟ اُن کے نام کیا کیا تھے؟ اُن کے نشان کیا کیا تھے؟ سب چھپ گیا اور کیوں چھپ گیا؟ اگر چلے گئے تھے تو بڑھ کر کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ چونکہ کوئی دعویٰ نہیں کیا، جو کچھ عیب تھے، چھپ گئے، مخفی رہ گئے۔ لوگ اُن کے نام تک نہیں جانتے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ایسا آدمی ایسے ہنر کا دعویٰ

کرے جو اُس میں نہ ہو۔

یاد رکھئے حضرات! جب حد سے بڑھ کر دعویٰ ہوگا تو پھر تنقید ہوگی اور دیکھ بھال ہوگی، جستجو ہوگی۔ تو پھر کیوں انسان حد سے بڑھ کر دعویٰ کرے؟ ابھی چند محدود نام یاد ہیں کہ میدانِ جنگ سے اُنہوں نے فرار اختیار کیا۔ ورنہ میں ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اُن کے علاوہ کوئی میدانِ جنگ سے فرار کر کے گیا ہی نہ تھا۔ خدا جانے جانے والے کتنے ہوں گے مگر اُن جانے والوں نے آگے بڑھ کر چونکہ کوئی دعویٰ نہ کیا۔ لہٰذا ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اُن کی فہرست مرتب کریں؟ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب کھرا کہے اپنے آپ کو وہ.......جو کھوٹا ہے۔ پیغمبر کو پیغمبر سے ملایا، اُمت کو اُمت سے ملایا اور بھیجنے والے کو بھیجنے والے سے ملایا اور حقیقت پر سے پردہ اُٹھا دیا کہ فرعونِ معروف کے علاوہ اور بھی فرعون ہمارے رسول کے زمانہ میں تھے۔

یہ درمیان کی ایک بات تھی۔ اب آپ اس امر پر بھی غور فرمائیں کہ سرکارِ دو عالم نے حضرت علیؑ کو تشبیہ یہ کہہ کر دی:

"اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی".

اپنے آپ کو موسیٰؑ قرار دے کر حضرت علیؑ کو اپنا وصی بنا کر ہارون نبی سے تشبیہ دی اور خدا جانے جنابِ ابو طالبؑ کی کتنی دُور رس نگاہ تھی! کمال معرفت تھی اُن کی کہ اپنے قصیدہ میں فرماتے ہیں:

"اَلَمْ تَعْلَمُ اَنَّ وَجَدْنَا مُحَمَّداً نَبِيًّا كَمُوْسٰى".

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہم نے محمدؐ کو ایسا ہی نبی پایا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے؟"

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہوں نے فرمایا:

"رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ، وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ، یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ، وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ، هٰرُوْنَ اَخِی، اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ، وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ، كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا، وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا. اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا"۔

"اے میرے رب! میرے سینے کو منشرح فرما دے اور میرے امر کو میرے لئے سہل و آسان بنا دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو سمجھ سکیں اور میرے لئے ایک وزیر بنا دے،

(حضرت موسیٰ وزراء نہیں چاہتے، صرف ایک وزیر چاہتے ہیں)۔ عربی قواعد میں اس تنوین پر بہت زور دیا گیا ہے (جو وحدت کی دلیل ہے)۔

"میرے لئے ایک وزیر قرار دے دے (اور حقیقتاً وزیر ہو تو ایک ہی کافی ہے، اس لئے وزراء نہیں چاہتے)۔ ایک وزیر جو میرے اہل میں سے ہو (یعنی) میرا بھائی ہارون اور اُس کی وجہ سے میری پشت مضبوط کر دے اور اسے میرے امر میں شریک فرما دے تاکہ ہم تیری تسبیح کثیر کر سکیں اور تیرا ذکر کثیر کر سکیں (بے شک تو ہم سے بخوبی آگاہ ہے)"۔

خدا جانے یہ حکم کیوں نہ ہوا کہ بنا لو جسے چاہو؟ حضرت موسیٰ کا دُعا کرنا اور خداوند عالم کا نہ ٹوکنا بلکہ دُعا کو قبول کرتے ہوئے موسیٰ پر بار احسان کا رکھنا یہ بتا رہا ہے کہ جو کچھ اُنہوں نے خدا سے چاہا، وہ اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُس کے جواب میں

پروردگارِ عالم نے یہ نہیں فرمایا کہ ہارون اس امر کا اہل نہیں ہے۔ ہم تیرا وزیر خود بناتے ہیں۔ مگر اُن (موسیٰ) کا نام لے کر دُعا کرنا اور خداوند عالم کا قبول کرنا بتارہا ہے کہ نگاہیں ملی ہوئی ہیں۔ جس پر نبی کی نظرِ انتخاب ہے، اُسی پر قدرت کی نظرِ انتخاب ہے۔

حضرات! اب ذرا ذوق کو اور آگے بڑھائیے۔ بیانِ ماسبق سے واضح ہوا کہ نگاہِ موسیٰ نگاہِ قدرت سے ملی ہوئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ حقیقی نظرِ انتخاب رکھتے ہیں مگر نظرِ انتخاب رکھتے ہوئے بھی انتخاب کا حق نہیں رکھتے اور فرما رہے ہیں کہ پروردگار! اس کو میرے کام میں شریک کردے۔

کتنے صیغے آپ کی دُعا میں آگئے؟ ہر جگہ میں، میرا سینہ، میری زبان، میرا وزیر، "ہم" کا لفظ اب تک نہیں کہا۔ میرے سینے کو کشادہ کردے، "ہمارے کام کو آسان کردے، ہمارا ایک وزیر بنادے، اس کو ہمارا شریک بنادے، نہیں"، یہ کچھ نہیں فرمایا بلکہ صیغہ مفرد استعمال کرتے رہے۔ "وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ" تک یہی صیغہ استعمال فرماتے رہے۔ پھر صیغہ بدلتا ہے اور فرماتے ہیں: "تاکہ ہم تیری تسبیح کثیر کریں اور ہم تیرا ذکر کثیر کریں اور تو ہم کو خوب جاننے والا ہے اور ہمارے دلوں کو اچھی طرح جاننے والا ہے"۔

لہٰذا "ہم" جب بھی کہا، ہارون کو شریک کر کے کہا۔ اگر موسیٰ نے "ہم" کہیں استعمال کیا تو وہ بشرکتِ ہارون کہا۔ اب رسول کا وہ قول بھی یاد کریں کہ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ اے علیؑ! تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو حضرت موسیٰ سے تھی۔ اب اندازہ لگائیے کہ "لائیں ہم اپنے بیٹے، لائیں ہم اپنی عورتیں، لائیں ہم اُن کو جو ہمارے نفس ہیں"۔ اس "ہم" میں پیغمبرؐ کے ساتھ کوئی تو ضرور ہے۔ وہ کوئی کون

ہے؟ بندشیں اتنی سخت ہیں کہ اور کوئی آ نہیں سکتا، اس لئے کہ جانے والے گنے چنے ہیں۔ اب "اَبْنَاءَ" کے مقام پر حسنینؑ ہمارے بیٹے بتلائے گئے ہیں۔ تو اس لفظ کے ہوتے ہوئے کون ہو کہ جس طرح یہ بیٹے رسولؐ کے ہوں، اُسی طرح وہ بیٹے اُس کے ہوں؟ نساء کے حکم کے ذیل میں جانے والی صرف سیدہؑ ہیں۔ اب نبیؐ کے ساتھ اور کون ہو کہ جو معظمہ جائیں، وہ رسولؐ کی بھی ہوں اور اُس ذات کی بھی ہوں اور یہ اشارہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے قول سے ملتا ہے۔

اُن کا تاریخ عبقری میں بیان ہے کہ "اَنْفُسَنَا" سے مراد نبیؐ اور علیؑ ہیں، نبیؐ نفسِ علیؑ ہو کر گئے اور علیؑ گئے نفسِ رسولؐ ہو کر۔ نساء کا لفظ کبھی زوجہ کے معنوں میں آیا ہے جیسے "یَا نِسَاءَ النَّبِیِّ" یا یہ لفظ بیٹی کے معنوں میں آیا ہے جیسے قرآن میں:

"یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَ کُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَ کُمْ".

آلِ فرعون تمہارے بیٹوں کو ذبح کر دیتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو چھوڑ دیتے تھے۔

یہاں یہ لفظ بیٹیوں کیلئے آیا۔ وہاں لفظ نساء ازواج کیلئے آیا۔ یہ قرآن کی رُو سے دو معنی ہیں اور "نِسَاءَ نَا" کے لفظ میں نبیؐ کے ساتھ اور کون ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر وہ نبی کی بیٹی بن کر جائیں تو علیؑ کی زوجہ بن کر جائیں۔

مباہلہ کے ذیل میں نجران سے آنے والے وفد کو ایک عجیب اُلجھن پیدا ہوئی کیونکہ جب وہ رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسالت مآبؐ نے اُن کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا اور بات نہ کی۔ وہ پریشان ہو گئے کہ نبیؐ کے بلائے ہوئے آئے تھے اور اُنؐ کے پاس پہنچ کر سلام کیا تو نبیؐ نے جواب تک نہیں دیا اور منہ پھیر لیا۔

اُن کا کہنا تو یہ تھا کہ اتنی دُور سے آئے تھے، بار بار سلام کرتے ہیں مگر سرکارؐ سے جواب نہیں ملتا۔ اس بے رُخی کو کون بتائے کہ کیوں ہے؟ لہٰذا گھبرا کر مسجد سے نکل گئے۔ اب جو ملتا ہے، اُس کو کہتے ہیں کہ بلایا تھا، آئے ہیں، سلام کرتے ہیں، جواب نہیں ملتا۔

جواب میں لوگ کہتے ہیں کہ ہم نہیں بتا سکتے۔ پوچھتے پھرتے ہیں، ارے کوئی تو بتا دے۔ بالآخر انہوں نے بھی پتہ کی بات پوچھی ہے کہ بھلے آدمیو! اگر تم نہیں بتا سکتے تو اتنا ہی بتا دو کہ کون بتا سکتا ہے؟ جواب ملا کہ علیؑ بتا سکتے ہیں۔

جہاں اور کوئی مشکل کشائی نہ کر سکے، وہاں علیؑ مشکل کشائی کرتے ہیں۔ علیؑ کے پاس آئے:

"بلایا تھا، طلب فرمایا تھا، آئے ہیں، بات کرنا ہے، سلام سے ابتداء کرنا ہے۔ رُخ نہیں فرماتے، جواب تک نہیں دیتے"۔

آپؑ نے فرمایا: "یہ متکبرانہ لباس جو پہنے ہوئے ہو، اس کو اُتارو اور یہ سونے کے زیوروں کی جو آرائش کر رکھی ہے، اسے خیر باد کہو اور پھر سلام کرو"۔

جب اس پر عمل کیا تو رسالت مآبؐ نے کمالِ خُلق سے جوابِ سلام دیا اور فرمایا: "اس سے پہلے جو تم آئے تھے تو شیطان تم پر مسلط تھا"۔

یہ نفسِ رسولؐ کی شان ہے۔ رسولؐ کے دل میں جو بات ہے، اُس کو یہ بتا سکتے تھے۔ دُوسرا کیا جانے؟

آیتِ مباہلہ قرآن کے آخری تنزیلی حصہ کی آیت ہے۔ فتحِ مکہ کے بعد کا یہ واقعہ ہے۔ اسے نظر میں رکھیے گا۔ یوں تو قرآن سارا آ چکا تھا اور ہر آئی ہوئی آیت کی نبیؐ مکمل تفسیر فرما چکے تھے مگر تبلیغ و تفسیر کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک قولاً اور ایک عملاً۔ کچھ

نگاہ میری اُن آیتوں پر پڑ رہی ہے جو اہمیت کے اعتبار سے بہت بلند ہیں اور نبیؐ قولاً اُن کی تبلیغ بھی فرما چکے تھے مگر ضرورت تھی کہ اُن منزلہ آیات کی تفسیر مقامِ عمل سے ہو، مثال کے طور پر میں چار چیزیں پیش کرنا چاہتا ہوں:

1۔ آیہ تطہیر:

"اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْراً".

یہ آیت جس شان کی ہے، مجھے کچھ بیان نہیں کرنا ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ اس آیت کی اہمیت اور اس کے بیان کی عظمت سے یقیناً واقف ہیں۔ اس واسطے کہ اللہ اس آیت میں اپنے اس ارادے کا ذکر فرما رہا ہے جو ارادہ اُس نے روزِ ایجادِ عالم سے لے کر آج تک کسی کے بارے میں کیا ہی نہ تھا۔ "یُطَهِّرَکُمْ" ہی کو تنہا نہ دیکھئے گا، "یُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْراً"، پاکیزگی کی انتہا سے بحث ہے۔ اب تک ابتداء میں پاکیزگیاں دی جاتی رہی تھیں۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اُس پاکیزگی کا اعلان کر دے جس پر پاکیزگیوں کی انتہا ہے۔ اب یہ ارادہ، بے مثل ارادہ نہ کسی کیلئے ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا۔ جن کے بارے میں یہ ارادہ ہوا، اُن کے بارے میں قدرت نے اہل البیت کا لفظ استعمال کیا۔

حضرات! میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ آیت کے ارشاد ہی کا اثر ہے کہ مقامِ بحث میں انسان کچھ ہی کہہ لے مگر جب بھی لفظ اہل بیت آئے گا، خیال اِدھر اُدھر جائے گا ہی نہیں! انہی ہستیوں میں منحصر رہے گا جن کو اللہ نے

اپنے ارادے سے اہل البیت کہا ہے۔ یہ آیت اُن کا نام ہی اہل البیت بتلا رہی ہے ورنہ ہر شخص کے پاس گھر ہے، چھوٹا ہو، بڑا ہو، کیسا ہی ہو، ہر شخص کے پاس ایک گھر ہے اور ہر گھر میں کچھ رہنے والے ہیں۔

لہٰذا اس اعتبار سے ہر گھر کے رہنے والے اہل البیت ہوئے۔ وہ کونسا گھر ہے جس گھر والے اہل البیت کہلانے کے مستحق نہ ہوں؟ مگر جب قدرت نے اس آیت کو نازل کیا اور جس لفظ سے آیت کے موصوفین کو یاد کیا، وہ لفظ اُن کی ذات سے اتنا مخصوص ہو گیا کہ جب بھی تنہا لفظ اہل البیت کہا جائے لفظ اہل البیت میں نہ اللہ کا نام آتا ہے، نہ عرب کا ذکر ہوتا ہے، نہ مکہ کا ذکر، خالی اہل البیت کا لفظ مگر خالی کہاں ہے؟ نگاہ کسی کی کسی اور گھر کی طرف جاتی ہی نہیں، یہ اللہ کے ارادے کی طاقت ہے۔ میں منتظر ہوں کہ آپ دیکھیں کہ اس گھر سے کون کون نکلتا ہے اور کون کون میدان تک پہنچتا ہے؟ اب جو اس گھر سے نکلیں اور بحکم خدا میدان کو روانہ ہوں اور میدان میں پہنچیں، پتہ رسولؐ کے عمل اور ارشادِ خدا سے چلے گا کہ اہل البیت یہی ہیں۔

2۔ ایک آیت ہے:

"قُلْ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى".

میں سوائے محبتِ اہل بیتؑ کے تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔

اقرباء کے نام پیغمبرؐ نے بتائے، صورتیں دکھائیں، پہچان کروائی مگر آیت قیامت تک باقی رہنے کیلئے ہے۔ جب تک وہ کامل تبلیغ کے میدان میں نہ آجائیں، بہت سی باتیں جھٹلا دی جاتی ہیں۔ مگر میرا یہ نقطہ یاد رکھیے گا کہ

میدان کی بات وہ بات ہوتی ہے جس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ بات جب میدان میں آجاتی ہے تو پھر اس پر چاہے کوئی ہزار پردہ ڈالے، پردہ ڈالا نہیں جاسکتا۔ آج بھی اگر کوئی دُنیا سے پوچھے کہ فاتح خیبر کون ہے؟ تو بات جھٹلائی نہیں جاسکتی کیونکہ بات میدان کی ہے۔ قاتل مرحب و عنتر کون ہے؟ میدان کی بات ہے، جھٹلائی نہیں جاسکتی۔ جھٹلانا تو جھٹلانا، بات بڑھائی نہیں جاسکتی، گھٹائی نہیں جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ "نِسَاءَ نَا" کا لفظ آیتِ مباہلہ میں صیغہ جمع میں ہو مگر مقامِ عمل میں صرف ایک معظمہ تھیں۔ "اَبْنَاءَ نَا" کا لفظ جمع میں مستعمل ہوا مگر مقامِ عمل میں دو ہی بیٹے تھے، "اَنْفُسَنَا" آیت نے مقامِ جمع میں ضرور کہا ہے مگر تعمیل میں ایک ہی ذات ہے۔

3۔ کسی نقطہ رس نے آیتِ مباہلہ کے بارے میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ایسی بات، سننے کے بعد یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ خداوند عالم کیا جانتا نہ تھا کہ تیسرا کوئی بیٹا نہیں ہے اور کیا وہ نہ جانتا تھا کہ صنفِ نساء میں اس منزلت کو رکھنے والی ایک ہی معظمہ ہے؟ دو بھی نہیں، نفسِ رسولؐ ایک ہے، دو بیٹے ہیں، ایک معظمہ ہیں اور ایک نفس ہے۔ کل چار ہی تو ہیں جنہیں نبیؐ کے ساتھ بھیجا جاسکے اور جنہیں نبیؐ کے ساتھ بھیجنا منظور ہے۔

حضرات! عربی میں مشکل یہ ہے کہ جمع کا اطلاق تین سے کم پر نہیں ہوتا۔ دو کیلئے جمع کا صیغہ نہیں، تثنیہ کا ہے، جیسے مغربین، ظہرین، حسنین۔ دو ہی کیلئے تثنیہ کا صیغہ مستعمل ہے۔ مگر آیت کے کسی گوشہ میں نہ کوئی تثنیہ آیا، نہ

کوئی واحد آیا۔ جتنے لفظ بھی آئے، جمع ہو کر آئے۔ ابن کی جمع ابناء ہے، نساء بھی جمع ہے اور انفس بھی جمع ہے۔ پیغمبرؐ کا عمل کسی جگہ پر بھی جمع کی صورت میں سامنے نہیں آیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکم دیا جاتا ہے کہ جمع کو لے کر جاؤ اور عمل ہر جگہ یہ ہو رہا ہے کہ جمع ایک جگہ بھی نہیں۔ دو جگہ یعنی ''نِسَاءَ نَا'' اور ''اَنْفُسَنَا'' کے مقامات پر صرف ایک ایک فرد لے گئے اور ''اَبْنَاءَ نَا'' کے حکم کی تعمیل میں صرف دو بیٹے لے جائے گئے۔

تو جمع کے حکم پر پیغمبرؐ نے عمل کہیں بھی نہیں کیا۔ پیغمبرؐ تو کیا کرتے کیونکہ بچوں میں دو سے زیادہ کوئی تھا ہی نہیں اور مستورات میں ایک سے زائد تھی ہی نہیں اور ''اَنْفُسَنَا'' میں ایک سے زائد کوئی تھا ہی نہیں۔ پیغمبرؐ تو بہر حال معصوم ہیں اور بے خطا ہیں مگر سوال یہ ہوتا ہے کہ بارالٰہا! تو نے کیا دیکھ کر جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا؟ ارے دیکھ کر اگر کہتا تو یہ کہتا کہ رسولؐ! دو بیٹوں کو لے جاؤ، ایک بیٹی کو لے جاؤ اور ایک اپنے جانِ جگر کو لے جاؤ۔ مگر حضرات! بڑی مشکل ہو جاتی، کہنے والوں کو موقع مل جاتا کہ دو بیٹوں کو لے جانے کا حکم ہوا تھا، ان کو لے گئے ورنہ اور بھی تھے۔ دو کے متعلق حکم تھا، اس پر عمل کیا گیا۔ اگر قرآن ایک بیٹی کو لے جانے کا حکم دیتا تو کہتے کہ حکم ایک کو لے جانے کا تھا، اس لئے ایک کو لے گئے۔ مزید بھی تھیں۔ رسولؐ کے جان و جگر کئی تھے، ایک کو لے جانے کیلئے کہا گیا تھا، اس لئے ایک کو لے گئے۔ لامحال ایک کو جانا پڑا۔

موجودہ آیت میں خدا نے سب بیٹوں کو لے جانے کی گنجائش رکھی تھی۔ جتنی

نساء ہیں، سب کو لے جاؤ اور جتنے جان وجگر ہوں، سب جائیں۔ جمع کا مطلب کُل سے ہے۔ دو بیٹوں کو اگر لے گئے تو کُل یہی ہیں۔ ایک بیٹی کو لے گئے تو کُل یہی ہے۔ ایک جان کو لے کر گئے تو کُل یہی ہے جن کو خدا پاک وپاکیزہ رکھنا چاہتا ہے کہ جیسا پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔

تو اہل بیت کون ہیں؟ وہ چادر والی بات تو گھر کے اندر کی بات ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ گھر کی بات نہ رہے، میدان کی بات بن جائے۔ اُن کے اُوپر چادر تو ہے ہی، پردہ ڈال دیں گے۔ مگر میدان کی بات ہے تو چھپائے نہ چھپے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ پردہ نشین کو بھی باہر لایا جائے، اس لئے آیت نازل ہوگئی۔

حضرات! غالباً مباہلہ کی آیت مباہلہ سے ایک دن پہلے آئی تھی۔ پہلے آ گئی تھی تو قرارداد ہوئی کہ مباہلہ کل ہوگا۔ ایک رات درمیان میں تھی۔ خدا جانے نبی کس کو لے کر جائیں بلکہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کل میں علم دوں گا رجُل کو، غیر فرار کو۔ خدا جانے کسے دیں؟ یہ تو بھول پن ہے۔ دل جانتے تھے کہ وہ کون ہے! پہچانتے تھے کہ وہ کون ہے، پہچانتے تھے کہ کس کا ذکر ہے! خدا شاہد ہے کہ اُن سے زیادہ اس علمبردار کو جاننے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ لاکھ کہیں کہ آپ حضرت علیؑ کے بڑے عارف ہیں۔ آپ نے اُن کا کیا دیکھا ہے؟ بڑے بڑے جاننے والے تھے جو دیکھتے تھے، جن کے سامنے کی باتیں تھیں، اس لئے جانتے تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ رجُل پیغمبرؐ نے کس کو کہا ہے! کرار کون ہے، غیر فرار کون ہے! صرف اُن کے دل

نہیں، اُن کے ظاہر بھی جانتے تھے کہ آج ہی کی بات ہے۔ ہم تو وہ نہیں ہیں جو علی ہیں۔ اپنا نہ ہونا جانتے تھے، ہونے والے کا ہونا جانتے تھے۔ رات بیچ میں ہے۔ تجاہل عارفانہ اور بات ہے، تمنا پیدا ہوئی اور آرزو پیدا ہوئی اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ آرزو پیدا ہوئی اور اُمید بندھی تو بڑا اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو نبی نہیں مانتا ہے، وہ اس لئے کہ اعلان جو ہے، کرار غیر فرار کا ہے۔ تو اگر اُمید ہے کہ شاید اب بھی مجھے علَم مل جائے تو اُس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کہے کچھ اور نبی کچھ اور کرے۔

قرآن میں آیت ہے کہ میں اجرِ رسالت کچھ نہیں چاہتا، سوائے مودتِ اہل بیتؑ کے۔ رسولؐ نے اُن کے نام ضرور بتا دیئے مگر یہ قول سے تصدیق ہوئی۔ آیت جتنی مہتم بالشان ہے، اُس کا اقتضا یہ ہے کہ عمل سے تبلیغ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آیہ مباہلہ میں ہر گوشہ قرابت پر رکھا گیا، صفات پر نہیں ہے، کمالات پر نہیں ہے۔ "اَبۡنَآءَنَا، نِسَآءَنَا، اَنۡفُسَنَا"۔ اب آیت نازل ہونے کے بعد نبیؐ جن کو ساتھ لے کر جائیں، وہی قربیٰ ہیں اور جن کی محبت خدا واجب کر رہا ہے، تو پتہ چلا کہ آیت کے مصداق کون ہیں!

اب چھوٹی سی آیت لیجیے۔ مہتم بالشان آیت ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہنے کیلئے ہے۔

"یَآاَیُّهَا الَّذِیۡنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ"۔

"اے ایمان والو! متقی رہو اور ایماندار رہو اور قیامت تک صادقین کی پیروی کرو اور صادقین کا اتباع کرو"۔

آیت نے نام نہیں لئے اور کیا شک ہے کہ نبیؐ نے جب آیت پہنچائی ہوگی، صادقین کی پہچان کروائی ہوگی۔ مگر حضرات! گھر کی بات چھپائی جاسکتی ہے میدان میں انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تاکہ کوئی انکار نہ کرسکے۔ آیت نے ایک پہچان مقرر کردی ہے کہ رسولؐ! اپنے بیٹوں کو لے کر جاؤ، اپنی عورتوں کو لے کر جاؤ اور اپنے نفسوں کو لے کر جاؤ اور اس غرض سے لے کر جاؤ کہ مباہلہ ہو۔ مباہلہ میں کیا ہو؟ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت مانگی جائے۔

اللہ تعالیٰ لعنت کرنے کیلئے جن کو چن چن کر بھیجے، اُن کی نورانیت اس بناء پر بھی پہچان نہ سکو تو کم از کم بے شعوروں کا ذہین کے مقابلہ میں تو دیکھ لو کہ کون جمع ہوگئے ہیں!

خداوند عالم نے دو طرح کے انسان دکھائے ہیں اور بتائے ہیں۔ یوں تو ہزاروں نوعیت کے انسان اس دُنیا میں ہیں۔ ہم سب لوگ محبانِ اہل بیتؑ ہیں، مؤمن ہیں مگر حضرات! ایمان میں، عرفان میں، ہم سب کا درجہ بھی تو ایک نہیں ہوسکتا۔ خدا جانے کہ ہمارے درجات اگر جانچنے والا جانچے تو اُن میں کتنا تفاوت پائے گا۔ یہ ایک محفل کا ذکر ہے تو پھر عالم میں کتنا تفاوت ہے! خداوند عالم ہم سے کس وقت ناراض ہے، کس وقت رضامند ہے! نیک کام کریں اور اُس وقت خدا ناراض ہو، یہ ممکن نہیں۔ ہم گناہ کریں اور خدا ہم سے راضی ہو، ناممکن ہے۔ کبھی ہمارے لئے رضا ہے اور کبھی ہمارے لئے عدم رضا۔ کسی وقت ہم پسند کے لائق ہیں اور کسی وقت ہم ناپسندیدگی کے لائق ہیں۔ نہ ہم کلیۃً اللہ کے پسندیدہ ہیں اور نہ ہم پورے

طور پر ناپسندیدہ ہیں۔ اختلاف چل رہا ہے۔ کبھی اللہ کی نگاہ رحمت ہے اور کبھی بدلی ہوئی نظر بھی ہے۔

اب تفاوت کا یہ سلسلہ خدا جانے کہاں سے ہے اور کہاں تک ہے۔ ذرا ایک نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں۔ اب پسندیدگی کیلئے کوئی حد بھی ہوگی۔ ماننا پڑے گا کہ کچھ انسان اس دُنیا کے ایسے بھی ہوں گے جن کا کوئی عمل بھی پسند نہیں، جن کی طرف نگاہ رحمت نہیں بلکہ وہ مستقل "مَغضُوبِ عَلَیہِم" ہیں۔ اُن کیلئے خدا کا غضب ہی غضب ہے۔ ایسے آدمی نظر میں تو ہوں گے اور خوشنودی اور پسندیدگی کے سلسلہ میں کوئی حد ایسی بھی آئے گی کہ وہ اشخاص ہوں گے جو ہر لحظہ پسندیدہ ٹھہریں گے۔

وہاں عدمِ رضا کی انتہا اور یہاں ہر وقت رضا کی انتہا۔ ایک وہ ہیں جن پر خدا کی لعنت ہے، لعنت کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ اب اس لعنت کے بالکل مقابلہ پر وہ حضرات ہیں جن پر رحمت کے سوا کوئی دُوسری نظر موجود ہی نہیں۔ اس لعنت کے مقابلہ میں دُوسری چیز کیا ہے؟ لعنت کے مقابلہ میں صلوات ہے اور صلوات کے مقابلہ میں لعنت و پھٹکار ہے۔ صلوات کے معنی اللہ کی انتہائی قربت اور انتہائی رحمت ہیں۔

اب یہ بعد المشرقین ہے اور جہاں صلوات کے مقابلہ پر لعنت ہے، لعنت کے مقابلہ میں صلوات ہے اور لطف کی بات ہے کہ ان دونوں چیزوں کو محض اپنی ذات کیلئے مختص نہیں رکھا بلکہ فرمایا جاتا ہے:

"اُولٰئِکَ عَلَیہِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ"

"لعنت ہے اُن پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی"۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ جہاں ملائکہ کا ذکر کیا، وہاں اَجْمَعِیْن کا ذکر نہیں کیا۔ خود ہی لوگ سمجھ جائیں گے کہ ملائکہ معصوم ہیں۔ یک رنگ ہیں، دورنگی تو اُن میں ہے ہی نہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کوئی فرشتہ لعنت بھیجنے میں ڈرے، پیچھے ہٹے اور کہے کہ میں لعنت بھیجتے ہوئے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ تو جس رنگ میں ہوں گے، کُل کے کُل ہی ہوں گے۔ جہاں لوگوں کا ذکر آیا، وہاں فرمایا: "وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْن"۔ اگر کوئی بزدل ہیں تو تامل بھی کرتے ہیں۔ تو پھر تمام انسانوں کی لعنت کیسے ہوئی؟ جواب ملے گا کہ تو لاکھ اُن کو انسان کہتا رہے، میری نظر میں انسان وہی ہے جو ایسے مواقع پر "مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ" پر لعنت بھیجتے رہیں اور یہی بات صلوات کی ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ. يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا"۔

یہاں ایمان والوں سے کہہ رہا ہے، کافروں سے نہیں۔ اب مومنوں سے خطاب ہو رہا ہے، کافروں یا منافقوں سے نہیں۔ معلوم ہوا کہ مومن ہی وہ شخص ہے جو لعنت کے حقدار پر لعنت بھیجنے سے نہ ڈرے اور پھر جو بھیجے جا رہے ہیں، وہ ایمان کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں، صادقین ہیں۔ اُن کو کاذبین پر لعنت کرنے کیلئے ہی میدانِ مباہلہ میں خدا کے حکم سے آنا پڑا ہے کیونکہ جو فریق بالمقابل ہے، وہ نہ صرف کاذب ہیں بلکہ لعنت کے مستوجب بھی ہیں۔

ظاہر ہے کہ جن کو خدا لعنت کرنے کیلئے متعین فرمائے، وہ، وہ ہوں گے جن پر صلواتِ خدا ہے ورنہ ہر ایک آدمی کہہ سکتا ہے:

"لَعۡنَتُ اللّٰهِ عَلَى الۡكَاذِبِيۡنَ"،
"لَعۡنَتُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِيۡنَ"،
"لَعۡنَتُ اللّٰهِ عَلَى الۡغَاصِبِيۡنَ".

لیکن حضرات! لعنت کا رُخ کسی وقت بدل جاتا ہے۔ بہ سبب اپنے ماضی کے کردار کے میں نے بھی کسی پر ظلم کیا ہے، میں نے بھی کبھی جھوٹ بولا ہے اور میرا شمار بھی کسی وقت غاصبین میں ہوسکتا ہے۔ لیکن جس خلوص سے لعنت وہ کرسکتا ہے، جس نے جھوٹ نہ بولا ہو، کسی پر ظلم نہ کیا ہو اور کسی کا حق غصب نہ کیا ہو، ایک عام آدمی اس طرح سے جھوٹوں پر، ظالموں پر اور غاصبوں پر لعنت نہیں کرسکتا کیونکہ لعنت کرتے وقت میرے جیسا آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ لعنت کا رُخ کسی حد تک اُس کی طرف بھی ہے۔ لہٰذا ایسے فرد کو لعنت کرنے کیلئے نہیں بھیجا جاسکتا۔

ہماری گنتی وشمار اُس گروہ میں، جو لعنت کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں، سب سے پہلے "اَبۡنَآءَ نَا" سے شروع ہوتی ہے اور "اَبۡنَآءَ نَا" میں پہلے حضرت امام حسنؑ کا نام آتا تھا اور حسنؑ وحسینؑ میں انتہائی مماثلت ہے۔ ان دونوں بھائیوںؑ کے نام تک میں فرق نہیں۔ جو نام ایک کا ہے، وہی دُوسرے کا ہے۔ ان کا نام بھی حسنؑ ہے اور اُن کا نام بھی حقیقتاً حسنؑ ہے۔ عربی میں ایک یائے تصغیر کہلاتی ہے۔ یائے تصغیر کسی کے چھوٹے ہونے کو بتانے کیلئے ہے اور یہ یائے تصغیر دوحرفوں کے بعد اور آخری حرف سے پہلے ہوتی ہے۔ پہلے حرف پر زبر تھا مگر یائے تصغیر کے بعد اُس پر پیش آجائے گا ورنہ حقیقتاً امام حسینؑ کا نام حسنؑ ہی ہے۔ حسینؑ میں جو یائے بڑھائی ہے، یہ یائے تصغیر ہے اور یہ ظاہر کرنے کیلئے ہے کہ یہ چھوٹے حسنؑ ہیں۔

اگر کوئی ہر دو بچوں کا ایک ہی نام رکھنا چاہتا ہو مثلاً فضل نام رکھنا چاہتا ہو، اگر ایک دوسرے سے چھوٹا ہو اور اس حقیقت کو بتلانا منظور ہے تو فضل کے اندر یائے تصغیر آجانے سے چھوٹے کا نام فضیل ہو جائے گا۔ اس قسم کے بہت سے نام آتے ہیں مگر یائے تصغیر صرف سن بتانے کیلئے ہوتا ہے ورنہ دونوں کا ایک ہی نام ہے۔

دونوں ایک چادر میں ہیں، دونوں ایک مباہلہ میں موجود ہیں۔ اگر ایک رسولؐ کے ایک زانو پر ہے تو دوسرا دوسرے زانو پر۔ جو لفظ امام ایک کیلئے ہے، وہی لفظ امام دوسرے کیلئے ہے۔ نام میں بھی فرق نہیں اور ایک چیز اور ملتی ہے کہ جتنی مدت امامت ایک کی ہے، اتنی ہی مدت امامت دوسرے کی ہے۔ اگر دس سال امامت حسنؑ ہے تو دس سال ہی دور امامت حسین علیہ السلام ہے۔

عصمت ایک، طہارت ایک، دودھ ایک، گھر ایک، در ایک، مبتداء ایک، منتہا ایک، مسلک ایک۔ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ حسنؑ نے صلح کی اور حسینؑ نے جنگ کی۔ میں کہتا ہوں ایسا کہنا نادانی کی انتہا ہے اور اس میں، عالم ہو، زاہد ہو، واعظ ہو، کوئی بھی ہو، میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ اُس نے حالات اور واقعات کا تجزیہ نہیں کیا۔ اُس نے یہ نہ دیکھا کہ وہاں کیا تھا اور یہاں کیا ہے؟ یہ نہیں دیکھا کہ حسینؑ نے جنگ کی ہے یا حسینؑ سے جنگ کی گئی ہے۔ اگر آپ کا کہنا یہ ہے کہ حسینؑ نے جنگ کی تو سوال یہ اُبھرتا ہے کہ کہاں کی؟ کب کی؟ انہوںؑ نے جنگ کی یا اُن سے جنگ کی گئی؟

حضرات! امام حسین علیہ السلام نے مستقل طور پر اس ہونے والی جنگ کو ٹالنے کیلئے طرح طرح کے راستے ڈھونڈے اور تلاش کئے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ

حسینؑ کے پاس دشمن کیلئے کوئی دلکش چیز ہی ایسی نہ تھی جو حسینؑ سے جنگ کے باز رکھنے کیلئے پیش کی جاسکتی اور قبول کی جاسکتی اور جو اُن کی مخالف جماعت سے پیشکش ہوسکتی تھی، اُسے حسینؑ قبول نہیں کرسکتے تھے۔

دونوں بھائیوں کا معاملہ دشمنوں کے اعتبار سے مختلف ہے۔ حسنؑ سے حکومت طلب کی ہے، حسین علیہ السلام سے بیعت طلب کی ہے۔ حسنؑ سے کہا گیا کہ آپ حکومت چھوڑ دیں اور حسینؑ سے کہا گیا کہ امامت چھوڑ دیں۔

حضراتِ والا! کیا امام حسنؑ کا شدید ترین دشمن بھی کہہ سکتا ہے کہ آپ نے صلح میں دشمن کیلئے امامت کا حق مان لیا تھا؟ کیا وہ امامت سے دستبردار ہوگئے تھے؟ اگرچہ یہ بات طولانی ہے اور میں اُس کی تفصیل اس وقت نہیں کرسکتا۔

حضرات! حکومت نہ لازمہ نبوت ہے اور نہ لازمہ امامت ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ آیا پیغمبرؐ اسلام کے پاس حکومت شروع سے تھی؟ نبوت کے تیرہ برس کے بعد جب سرکارؐ مکہ چھوڑ رہے تھے، کس عالم میں تھے؟ کوئی آمرانہ شان تھی؟ کوئی ایک بالشت زمین کا ٹکڑا آپ کی خدمت میں تھا؟ اگر حکومت لازمہ نبوت تھی تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ختمی مرتبتؐ بھی برحق نہ تھے؟

اس مقام پر ایک لفظ کہوں گا کہ مکہ سے نکلتے نکلتے اس عالم میں اگر اُن کی وفات ہوجاتی تو کیا اُس وقت بھی کوئی نبی کی جانشینی کیلئے بڑھتا؟ کیا اُس وقت بھی یہ کشمکش ہوسکتی تھی کہ نبی میں ہوجاؤں یا نبی کا جانشین بن جاؤں؟

خدا کی قسم! اُس وقت یہ عالم ہوتا کہ حضرت علیؑ سے اصرار ہوتا کہ آپ رسولؐ کی جگہ آجائیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں کیونکہ جو آتا، وہ نبی کی انتہائی

مظلومیت کی جگہ آتا اور مظلومیت کی جگہ کون آنا پسند کر سکتا ہے؟

لہٰذا حضرات والا! امام حسنؑ کی طرف نگاہ اس لئے تھی کہ حکومت مل جائے اور اس سے قطع نظر کہ وہ کس طریقہ سے مل جائے اور کس عنوان سے مل جائے۔ امام حسنؑ کچھ ہی کہہ کر دے دیں۔ یہ تاریخی مناظر ہیں کہ صلح سے پہلے امام حسنؑ نے جو تقریر فرمائی ہے، مجھے ایک فقرہ ملتا ہے کہ ایسی تقریر کی ہے کہ اپنے مناقب اور مخالف کے عیوب اس حد تک بیان کئے ہیں کہ مخالف کا ایک فقرہ آپ کو تاریخوں میں ملے گا:

"میری نگاہ میں دُنیا سیاہ ہوگئی اور وقت تھا کہ میں اُسی وقت مقابلہ کیلئے کھڑا ہو جاتا مگر میں نے سوچا کہ اگر مقابلہ کئے بغیر کوئی چیز مل جائے تو پھر کیوں مدمقابل بن کر شر کھڑا کیا جائے"۔

بالآخر اس تمام تقریر کا جواب امیر معاویہ نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ اگر دل چاہے تو کہہ لیں، میرا مقصد حاصل ہوگیا۔

امام حسنؑ سے حکومت کو چھیننے کی خواہش تھی، امام حسنؑ نے حکومت چھوڑ دی۔ امام حسینؑ کے پاس کونسی حکومت تھی کہ حکومت دے کر صلح کرتے؟ آپؑ کے ہاتھ میں تو کوئی حکومت نہ تھی۔ آپؑ سے تو بیعت طلب کی تھی ورنہ میں مثال میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ ایک مسافر راہ میں چلا جارہا ہے، اُس کے پاس کچھ مال و دولت ہے۔ لٹیرے چھپے چھپائے اِدھر اُدھر سے نکل آئے۔ وہ کیا چاہتے ہیں؟ جو نکلے، وہ مال چاہتے ہیں۔ لے لیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہوگا کہ لٹیرے چھینتے ہوں گے یا کبھی ایسا ہوتا ہوگا کہ مسافر نے سمجھ لیا کہ میں جب تک اپنی گلوخلاصی کیلئے یہ مال اُن کو نہ دے دوں، اُن کے حملہ سے بچ نہیں سکتا۔

مگر حضرات! ہم نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا کہ جو مال چھیننے والے ہیں، وہ مال چھینتے وقت یہ کہیں کہ یہ مال میرا ہے۔ یہ بات اُس وقت اُن کے ذہن وگمان میں بھی نہیں آتی کہ ہم یہ کہہ کرلے لیں کہ یہ مال ہمارا ہے۔ یہ بات اُن کے خیال میں نہیں آتی کہ مسافر یہ بھی مان لے کہ مال ہمارا ہے کیونکہ اُس وقت اُن کی تمام تر نظر اس بات پر ہوتی ہے کہ کسی طرح مال مل جائے۔

چنانچہ لٹیرے نے کبھی نہیں کہا کہ یہ مال تمہارا نہیں، میرا ہے۔ اُن کے خیال تک میں یہ بات نہیں آتی لیکن جب مالدار ہو جانے کے بعد اطمینان ہو گیا کہ مل گیا ہے، اپنا گھر ہے، اپنا ڈر ہے، دوست ہیں، احباب ہیں مگر اُن کی سمجھ میں یہ بات آرہی ہے کہ یہ مال آپ کا نہیں ہے۔ اب یہ احساس کہ لوگ تنگ کر رہے ہیں کہ قبضہ غیر کے مال پر ہوا ہے، اس اطمینان کے وقت میں یہ چاہے گا کہ استحقاق ثابت کرے اور پہلی کوشش یہی ہوگی کہ جس سے چھینا ہے، وہی اقرار کرے کہ یہ مال اُس کا نہیں بلکہ موجودہ قابض کا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ امام حسنؑ کے وقت تو خواہش یہ تھی کہ حکومت کسی طرح مل جائے اور جب اُس کا قبضہ ہو چکا تو اَب یہ خیال رہنے لگا کہ سادات سے کہلوایا جائے کہ حکومت کا جائز حق بھی بنی اُمیہ کا ہے۔

امام حسنؑ سے تو حکومت چاہی گئی اور امام حسینؑ سے استحقاقِ حکومت منوانے کی کوشش کی گئی ورنہ بیعت کے معنی کیا ہیں؟ بیعت جب کرے گا جب ہمارا حق مان لے۔ لہٰذا جو حق پر ہو، وہ تو نہیں مان سکتا۔ بالفاظ دیگر حکومت چھوڑی جا سکتی ہے مگر امامت نہیں دی جا سکتی۔

ایک بات پر اور غور فرمالیں کہ امام کی امامت جائے گی تو اکیلی امامت نہیں جائے گی، سرکارِ ختمی مرتبت نے فرمایا کہ علیؑ کا ذکر میرا ذکر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس نے علیؑ کا ذکر نہیں کیا، اُس نے میرا ذکر نہیں کیا۔ اُس نے نہ صرف میرا ذکر نہیں کیا بلکہ خدا کا ذکر بھی نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ علیؑ کا ماننا میرا ماننا ہے اور میرا ماننا خدا کا ماننا ہے اور علیؑ کا نہ ماننا میرا نہ ماننا بھی ہے اور میرا نہ ماننا صرف میرا نہ ماننا ہی نہیں ہے، خدا کا نہ ماننا بھی ہے۔

اس انداز پر دیکھیے کہ اگر امامت جاتی ہے تو اکیلی امامت نہیں جا سکتی۔ اگر امامت جائے گی تو نبوت بھی جائے گی اور اگر نبوت جائے گی تو خدائی بھی جائے گی۔ امامت برحق ہے تو نبوت بھی برحق ہے اور اگر نبوت برحق ہے تو خدا کی خدائی برحق ہے۔ اگر امامت ناحق ہے تو نبوت بھی ناحق ہے اور اگر نبوت ناحق ہے تو خدائی بھی باطل ہے۔

ظاہر ہوا کہ امامت وحدانیت تک لے کر جائے گی اور رہے گی تو ہر چیز رہے گی۔ امام حسینؑ نے سچ پوچھیے تو اپنا سر دے کر نبی کی نبوت بچائی اور خدا کے وقار کو مجروح ہونے سے بچایا۔ اللہ کے انتخاب کو درست ثابت کر کے محفوظ کر دیا۔ اللہ کے انتخاب کی شان کو ثابت کر دیا۔ اگر یہی مسئلہ امام حسنؑ کو پیش آتا تو خدا کی قسم! وہی کرتے جو حسینؑ نے کیا۔

یہ جو لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ ایک بھائی کا طرزِ عمل کچھ ہے اور دوسرے بھائی کا طرزِ عمل اور ہے، یہ غلط فہمی ہے۔ اس میں حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ دونوں اماموں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُن دونوں کا طرزِ عمل ایک ہے۔

دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو حالات امام حسنؑ کے زمانہ میں جمع ہوئے تھے اور جن حالات میں آپؑ نے حکومت چھوڑ دی تھی، اگر امام حسینؑ کے پاس حکومت ہوتی تو وہ امام حسنؑ کے طرزِ عمل سے ذرہ بھر مختلف نہ کرتے۔

خدا کی قسم! امام حسنؑ کی صلح نے امامت کی آبرو رکھ لی۔ اسی طرح شہادتِ حسینؑ نے امامت کی آبرو رکھ لی۔ امام حسن علیہ السلام اگر صلح نہ کرتے تو کربلا کا وہ واقعہ جو بعد میں ہونے والا تھا، کھنچ کر پہلے آجاتا اور لوگوں کو کہنے کا موقعہ مل جاتا کہ حکومت کو بچانے کیلئے جانیں دے دیں۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ حکومت کو بچانے کیلئے امام حسینؑ نے قربانیاں دیں؟ جی نہیں! انہوں نے یہ اقدام خدا کے دین کو بچانے کیلئے، رسولؐ خدا کی رسالت کو بچانے کیلئے اور اپنی امامت کو بچانے کیلئے کیا۔

حضرات! وقتِ ضرورت کم کو بیش قیمت چیز کا فدیہ بنادیا جاتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ امامت کی قدر و قیمت نبی کی نبوت اور خدا کی توقیر کی قدر و قیمت حسینؑ کی نظروں میں جس قدر تھی، اتنی قدر و قیمت اکبرؑ کی نہیں تھی۔ اتنی قیمت عباسؑ کی نہ تھی۔ ان کو قربان کیا جاسکتا ہے مگر دین کو بھینٹ نہیں چڑھایا جاسکتا۔ دونوں بھائی متحد الخیال تھے۔ حکومت چھوڑی جاسکتی تھی، چھوڑ دی گئی مگر بیعت نہیں ہو سکتی تھی۔

میں بڑی آزادی سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر علیؑ نے بیعت کی ہوتی تو نہ صرف حسنؑ بلکہ حسینؑ نے بھی بیعت کر لی ہوتی مگر ان کا راہِ استقامت پر چلنا یہ بتا رہا ہے کہ مخالف فریق نے دھوکہ دیا ہے اور کچھ کا کچھ بیان کر دیا ہے۔

حضرات والا! میں کیا کہوں؟ اگر کسی امام نے بیعت کی ہوتی تو کسی جنگ کے سپہ سالار ہوتے، کسی جاگیر کے جاگیردار ہوتے اور پھر کیوں کسی کے لائحہ عمل پر

چلنے سے انکار کرتے اور کرتے تو کیوں نہ کہہ دیا جاتا کہ آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟ آپ نے تو بیعت کر لی ہوئی ہے۔ بیعت کے بعد تو یہ طرزِ عمل درست شمار نہیں ہو سکتا۔ مگر آئمہ کا طرزِ عمل شروع سے ایک ہی رہا۔ اُن میں کسی نے بیعت نہیں کی۔ جو ایک کی زبان ہے، وہ ہر ایک کی زبان ہے۔ اسی لئے زمانہ دیکھ رہا ہے کہ جس ظلم کا نشانہ ایک ہے، اُسی ظلم کا نشانہ دوسرا ہے۔ وہی طرزِ عمل سب کے ساتھ ہے اور عداوت کا جو طرزِ عمل ایک امام کے ساتھ ہے، وہی طرزِ عمل باقی اماموں کے ساتھ ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کن کے ماننے والے ہیں؟ آپ جن کے ماننے والے ہیں، کوئی اُن میں بیمار نظر آتا ہے، کسی کے بدن کے ٹکڑے نظر آتے ہیں، اُن کے بچے اور مستورات دربدر اور شہر بہ شہر پھرائے جاتے ہیں۔ بے ردائی نظر آتی ہے۔ اُن کو قید خانوں میں بند رکھا جاتا ہے۔ انہیں آب و غذا سے حتی الامکان دُور رکھا جاتا ہے۔ اُن سے گستاخانہ انداز میں گفتگو کی جاتی ہے، قتل کرنے کی ترکیبیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

قدرت کے نمائندے سب کچھ دیکھ کر تحمل و وقار سے، صبر اور سکون سے اپنے مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

❁❁❁

آٹھویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا" (بنی اسرائیل: 88)۔

قرآن مجید کی آیت میں پروردگار اپنے کلام پر فخر و مباہات کرتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے کہ اہل عالم کو سنا دو کہ اگر انس و جن سب مل کر چاہیں کہ اس کا مثل لے آئیں تو ان کی اجتماعی کوششوں کے باوجود ناممکن ہے کہ قرآن کی مثل لاسکیں۔ قرآن کی مثل لانے میں انس و جن ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں، ایک دوسرے کے پشت پناہ بن جائیں مگر قیامت تک قرآن کی مثل نہ لائی جاسکے گی۔

کیا کہنا اس دعوے کا اور کیا کہنا قرآن کی بے مثالی کا!! جس کا کلام ہے، وہ حقیقتاً بے مثل ہے اور بے مثل کا جو کلام ہے، وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔ خدا کی بے مثالی کا آئینہ دار قرآن ہے۔

آج میری تقریر کا موضوع حقیقتاً یہی لفظ بے مثل ہے اور میرے خیال میں موضوع کی مناسبت سے بحمد اللہ تقریر بھی کیا عجب ہے کہ بے مثل ہی قرار پائے۔

درمیانِ ذکر میں توجہ دہانی کیلئے ضروری سمجھتا ہوں کہ خداوند عالم تو بہر حال وہ ذات بے مثل ہے جس کی مثال کسی اعتبار سے بھی اس کے ماسوا میں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی مخلوقات، اس کی صنعتیں، جب ان پر گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انتہائی مشابہتوں کے باوجود اور انتہائی مماثلتوں کے ہوتے ہوئے بھی

اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اپنی جگہ بے مثال ہے۔ خدا جانے وہ نقاش کیسا بے مثل ہوگا جس کے کھینچے ہوئے کروڑوں نقشے اور "لا تعد و لا تحصی" اُس کی مخلوقات اور مخلوقات کے افراد ہیں مگر ایسے نقشے کہ ایک نقشے سے دوسرا نقشہ آج تک نہیں مل سکا۔ صورت سے صورت نہ ملی، سیرت سے سیرت نہ ملی، مزاج سے مزاج نہ ملا، رنگ سے رنگ نہ ملا، نشان سے نشان نہ ملا۔ ہر اعتبار سے اُس کی پیدا کی ہوئی چیز اپنی جگہ بے مثل و بے مثال ہے۔

جسم انسانی کے خفیف سے خفیف نشانات، ایک کی انگشت کے نشانات دوسرے کی انگشت کے نشانات سے آج تک نہیں ملے۔ چہرے سے چہرے مل جانا تو درکنار آواز سے آواز تک نہ ملی اور اگر نگاہ غائر ہو تو صاحب نظر کیلئے بے جا نہ ہوگا اور عین حقیقت ہوگا کہ پتی سے پتی نہیں مل سکتی، بال سے بال نہیں مل سکتا۔ جن چیزوں کو ہم بے مثل سمجھ رہے ہیں، وہ اپنی جگہ حقیقتاً بے مثل ہیں۔

نگاہِ امتیاز ہمارے پاس بڑی محدود ہے اور ہم بڑی حد تک یہ سمجھتے ہیں کہ جو اَب کسی درخت کا آج ہے، وہی ایک گھنٹے کے بعد ہے لیکن عقل سلیم ہر صاحب عقل کو یہ ضرور بتا رہی ہوگی کہ اگر وہ درخت نمو کی حالت میں ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک گھنٹے کے بعد بھی اُس کی وہی قد و قامت ہو؟ اگر وہ درخت انحطاط کی طرف مائل ہے، تب بھی کیسے ممکن ہے کہ ایک گھنٹے میں کوئی تغیر ہی نہ ہوا ہو۔ ہماری نگاہیں اور ہمارے آلاتِ نظر اتنے محدود ہیں کہ جب بڑے سے بڑا تغیر ہو جائے، تب ہمیں وہ نظر آئے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ جتنا بچہ کل تھا، آج یقیناً اُس سے زیادہ ہے اور آج و کل کا فرق تو الگ رہا، ہر ہر لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اگر ہر ہر لحظہ نہ بڑھ رہا ہو تو پھر برسوں میں

بھی کیسے بڑھتا؟ ہر لمحہ بڑھنے ہی کا نام نمو ہے مگر ہم ایک لمحے کے نمو کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ایک لمحہ تو ایک لمحہ ہے، ہم ایک دو دن کے نمو کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ جتنا ہم نے اس بچے کو چند دن پہلے دیکھا تھا، اُتنا ہی یہ بچہ آج بھی ہے۔ مگر انصاف کیجئے کہ اگر چار دن کے بعد بھی وہ اُتنا ہی ہے تو اب سے چار دن بعد بھی وہ اُتنا ہی رہے گا اور پھر جتنا اُس دن ہوگا، اُس سے چار دن بعد بھی اُتنا ہی رہے گا۔ تو اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اُس کا نمو تو بالکل ختم ہو گیا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کائناتِ عالم کی ہر شے اپنی جگہ بے مثال ہے۔ کتنا ہی اتصال ہو، کتنا ہی اتصال کا کمال ہو، مگر بے مثلی اپنی جگہ قائم ہے۔ کتنی ہی مشابہت ہو، کتنی ہی مماثلت ہو لیکن کوئی امتیاز تو اپنی جگہ ہے۔ جس کی وجہ سے یہ الگ پہچانا جا رہا ہے، وہ الگ پہچانا جا رہا ہے۔ یہ الگ جانا جا رہا ہے، وہ الگ جانا جا رہا ہے۔

یہ امتیاز، امتیازِ تعارفی بتا رہا ہے کہ جو یہ ہے، وہ، وہ نہیں اور جو وہ ہے، وہ یہ نہیں ہے۔ لہٰذا جس کی مخلوق اور جس کی کائنات میں ہر ہر فرد اپنی جگہ بے مثل و بے مثال ہو، اُس کائنات کا پیدا کرنے والا خود کیسا بے مثال ہوگا!

حضرات! یہاں ایک دلچسپ سی بات ہے جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ موجودات میں کچھ باتوں میں مماثلت ہے اور کچھ باتوں میں ایسا امتیاز ہے کہ ایک دُوسرے کا مثل نہیں۔ یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ مثلیت بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ کہہ سکتا ہوں کہ جیسا میں، ویسے آپ۔ ہو گئی نا مثلیت۔ مثلیت و امتیاز دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ جب ہم دو دِلوں میں کشیدگی دیکھتے ہیں، دو بھائیوں میں نزاع پاتے ہیں تو اصلاح کے جذبے سے متاثر

ہو کر ہم کچھ ایسے کلمات کہنا چاہتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم اُن لڑنے والوں میں، اُن متنازعین میں ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ تم میں افتراق کہاں ہے؟ تم میں امتیاز کہاں ہے؟ جو تم ہو، وہی وہ ہے۔

لہٰذا ہر ایسے موقعہ پر ہم نقطۂ اتصال تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو اشخاص آپس میں متنازع ہو رہے ہیں اور وہ دونوں مثلاً آلِ رسولؐ ہیں، سلسلۂ سادات سے ہیں۔ اب ہم جو اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو نقطۂ اتصال دونوں کیلئے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہم بطور اصلاح یہ کلمات کہتے ہیں کہ آپ لڑ رہے ہیں، حالانکہ آپ دو کب ہیں؟ جس کی نسل میں تم ہو، اُسی کی نسل میں وہ ہے۔ جو شجرۂ نسب تمہارا ہے، وہی شجرۂ نسب اُس کا ہے، تم بھی سید ہو، وہ بھی سید ہے، تم بھی آلِ رسولؐ ہو، وہ بھی آلِ رسولؐ ہے۔ تو پھر آپس میں جنگ و جدل کیسی؟

درمیان میں ایک بات آگئی کہ جہاں ہم نے ان دونوں کو ایک کر دیا اور ایک مقام پر لا کر کھڑا کر کے دکھا دیا کہ جو جگہ تمہاری ہے، وہی جگہ اُس کی ہے۔ تم دو کب ہو؟ تم تو حقیقتاً ایک ہو۔

اگر یہ دیکھتے ہیں کہ یہ دو متنازع نسب کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں، کسی کا نسب کچھ ہے اور کسی کا نسب کچھ ہے تو ہمیں دُور سے کوئی نقطۂ اتصال ڈھونڈنا پڑے گا۔ مثلاً ہم نے یہ دیکھا کہ یہ بھی مؤمن ہے، وہ بھی مؤمن ہے۔ یہ بھی محبِ اہل بیتؑ ہے، وہ بھی قوم کے اعتبار سے محبِ اہل بیتؑ ہے۔ نسب کے اعتبار سے نہ سہی مگر مذہب کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہیں۔ تو پھر ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ تم بھی محبِ اہل بیتؑ ہو، وہ بھی محبِ اہل بیتؑ ہے۔ تم بھی مؤمن ہو، وہ بھی مؤمن ہے۔ دونوں ایک

ہیں، پھر یہ دو ہونا کیسا؟ یہ نقطۂ اتصال مل گیا۔ اگر مذہب یکساں نہیں ہے، یہ کسی اور فرقہ کا ہے اور وہ کسی دُوسرے فرقہ کا ہے تو ہمیں نقطۂ اتصال آگے بڑھ کر ڈھونڈنا پڑے گا اور پھر یہ کہنا پڑے گا کہ مثلاً تم بھی مسلمان ہو، وہ بھی مسلمان ہے۔ جو دین تمہارا ہے، وہی دین اُس کا ہے۔ تم دونوں کا مسلک ایک ہے۔ تو مسلمان ہونا ہی دونوں کا نقطۂ اتصال بن گیا۔

بالفرض اگر ایک مسلم ہے اور دُوسرا غیر مسلم ہے تو پھر نقطۂ اتصال اور اونچا ہو کر ڈھونڈنا پڑے گا اور کہنا پڑے گا کہ بھئی تم بھی انسان ہو اور وہ بھی انسان ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
پدر آفرینش زیک جوہر اند

تمہارا حق اس پر ہے اور اُس کا حق بحیثیت انسان ہونے کے تم پر ہے۔ تو انسانیت ایک نقطۂ اتصال قرار پا گیا۔ اگر ایک انسان کسی حیوان پر ظلم کر رہا ہے اور اُسے اس ظلم سے روکنا ہے تو پھر ایک اور نقطۂ اتصال ڈھونڈنا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ بھئی اُس میں بھی جان ہے، تم میں بھی جان ہے۔ وہ جاندار ہے۔ جیسی اذیت تمہیں پہنچتی ہے، ویسی ہی اذیت اُسے بھی پہنچتی ہے۔ جیسا احساس تم رکھتے ہو، ویسا ہی احساس وہ رکھتا ہے۔ تو جاندار ہونا ہی دونوں میں نقطۂ اتصال قرار پا گیا۔

اگر انسان کا مقابلہ کسی غیر حیوان سے ہے یعنی نباتات سے ہے تو ہم نقطۂ اتصال معین کرنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ بھئی تم بھی خدا کی مخلوق، وہ بھی خدا کی مخلوق، تم بھی اُسی کے پیدا کیے ہوئے ہو، وہ بھی اُس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو مخلوقیت ایک نقطۂ اتصال بن گئی جس سے بالکل برابری پیدا ہو گئی۔ یہ نقطۂ اتصال اتنا وسیع ہے

کہ ہم اس نقطہ اتصال کی بناء پر زمین کو آسمان سے ملا سکتے ہیں۔ آسمان کو زمین سے ملا سکتے ہیں۔ باوجود زمین اور آسمان کے انتہائی بعد کے اور انتہائی فرق کے اور انتہائی دوری کے نقطہ اتصال موجود ہے۔ زمین بھی مخلوق خدا ہے اور آسمان بھی مخلوق خدا ہے۔

انسان وشمس وقمر اس مقام پر مل جائیں گے۔ جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے، اُسی خدا نے شمس وقمر بنائے۔ تو ایک مخلوق اور دوسری مخلوق میں انتہائی تغیر ہونے کے باوجود اور انتہائی دوری ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی نقطہ اتصال آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس نقطہ اتصال کا یہ عالم ہے کہ آپ غیر نبی کو نبی سے ملا سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی مخلوقِ خدا ہے، یہ بھی مخلوق خدا ہے۔ زمین کو آسمان سے ملا سکتے ہیں، ذرّے کو خورشید خاوری سے ملا سکتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، وہ بھی اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے۔

لہٰذا نظر رکھیے گا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ مخلوقات میں انتہائی فرق ہونے کے باوجود کوئی نہ کوئی نقطہ اتصال ایسا مل جاتا ہے کہ جہاں بغیر کسی مبالغہ کے، بغیر کسی تصنع کے، یہ دونوں ایک منزل پر نظر آنے لگ جاتے ہیں اور ان دونوں کیلئے ایک لفظ بولا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ تخلیق کا رشتہ اتنا وسیع ہے کہ جو اس کیلئے ہے، جو اُس کا رشتہ ہے، وہی اس کا رشتہ ہے۔ لہٰذا مخلوق کا مخلوق سے مل جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

لیکن آپ ذرا سے تفکر سے کام لے کر نظر فرمائیے کہ مخلوق تو انتہائی تغیر کے باوجود کسی نہ کسی جگہ مل جاتے ہیں اور ضرور مل جاتے ہیں لیکن خالق اور مخلوق مل جائیں اور کوئی نقطہ اتصال خالق ومخلوق کیلئے ایسا قرار پائے کہ وہی لفظ خالق کیلئے بولا جاسکے

اور وہی لفظ مخلوق کیلئے بولا جا سکے۔ وہ ایک نقطہ اتصال ایسا بن رہا ہو کہ صحیح معنی میں خدا کیلئے بھی کہا جا سکے اور غیر خدا کیلئے بھی کہا جا سکے!

حضرات! یہ منزل آسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم اور آپ، زمین اور آسمان تو ایک مقامِ قریب سے ایک دُوسرے سے مل جاتے ہیں لیکن خداوند عالم ہم سے کیسے ملے؟ ہمارے اور اُس کے درمیان نقطہ اتصال کیسے قرار پائے؟ جو وہ ہے، وہ ہم نہیں ہیں۔ جو ہم ہیں، وہ وہ نہیں ہے۔ جو چیزیں اُس کیلئے ہیں، اگر وہ ہمارے لئے ہو جائیں تو ہم خدا بن گئے۔ اس کا قِدم ہم تک کیسے آئے اور ہمارا حدوث اُس تک کیسے پہنچے؟ اُس کے وجود میں ہم کیسے شامل ہوں اور ہمارے دائرۂ امکان میں اُس کی ذات کیسے سما سکتی ہے؟ ہم ممکن، وہ واجب۔ ہم حادث، وہ قدیم۔ اُس کی خالقیت میں ہم کیسے شریک ہوں اور ہمارے مخلوق ہونے میں وہ کیسے سمائے؟ جو خالق ہے، وہ مخلوق نہیں ہے اور جو مخلوق ہے، وہ خالق نہیں ہے۔ جو حادث ہے، وہ قدیم نہیں ہے اور جو قدیم ہے، وہ حادث نہیں ہے۔ جو واجب ہے، وہ ممکن نہیں ہے اور جو ممکن ہے، وہ واجب نہیں ہے۔ ہمارے لئے موت، اُس کیلئے موت کا کیا سوال؟ ہمارے لئے جاگنا سونا بھولنا، اُس کیلئے ان چیزوں کا کیا گزر؟

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ".

"وہ اونگھ نہیں سکتا، وہ سو نہیں سکتا"۔

وہ غافل نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ بھول سکتا ہے۔ ہم حقیقتاً جہل مطلق ہیں اور وہ عین علم۔ اب عین علم اور جہل میں نقطہ اتصال کیسے ملے؟ حدوث و قدم میں نقطہ اتصال کیسے بنے؟ لہٰذا جس منزل پر نظر جاتی ہے، جس اعتبار سے بھی ہم دیکھتے ہیں، مخلوق،

خالق سے کیسے مل جائے؟ ہمارے اور اُس کے درمیان کوئی چیز نقطہ اتصال کیسے بنے اور بننے کے بعد خدا، خدا کیسے رہے اور بندہ بندۂ خدا کیسے رہے؟

لیکن حضرات! اگر خدا خود ڈھونڈے کہ اُس کے اور اُس کی مخصوص مخلوق کے درمیان ایک نقطہ اتصال بن جائے کہ جس لفظ سے اُسے مخاطب کیا جا سکے، اُسی لفظ سے اُن کو یاد کیا جا سکے تو واقعاً اگر وہ چاہے تو پھر اُس کا چاہا ہوا تو ہونا چاہئے۔ اُس کا چاہا بھی اگر نہ ہو تو پھر کس کا چاہا ہوا ہوگا؟

مجھے ایک مقام ایسا نظر آ رہا ہے کہ خدا کے سامنے کوئی مخلوق اور منتخب افراد ہیں کہ خدا انہیں اپنے آپ سے ملانا چاہتا ہے اور اس حیثیت سے ملانا چاہتا ہے کہ جیسے باہم مخلوق میں کوئی نہ کوئی نقطہ اتصال بن جاتا ہے، خدا اور اُس کی خاص مخلوق کے درمیان بن جائے۔ ایسا بھی کوئی لفظ آ سکے کہ خدا کیلئے بھی صحیح ہو اور اُن مخصوص افراد مخلوق کیلئے بھی صحیح ہو یعنی خدا کی خواہش یہ ہو:

''میں مل جاؤں اپنے رسولؐ سے اور رسولؐ مجھ سے مل جائے اور میرے اور اُن کے درمیان نقطہ اتصال اتنی وسعت کے ساتھ ہو کہ اُسی منزل پر میرا رسولؐ ہو اور اُسی منزل پر میرے رسولؐ کے اہل بیتؑ بھی ہوں۔ وہی لفظ میرے لئے ہو، وہی لفظ رسولؐ کے لئے آئے اور وہی لفظ رسولؐ کے اہل بیتؑ کیلئے بھی آئے۔ ایسا ہی کوئی نقطہ اتصال ہو۔

اللہ، اللہ! یہ نقطہ اتصال لفظ اللہ نہیں بن سکتا، لفظِ رسول نہیں بن سکتا، لفظِ امام نہیں بن سکتا۔ خدا کو امام نہیں کہا جا سکتا، رسول کو خدا کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اللہ کو رسولؐ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو امتیاز پیدا کرنے کیلئے ہیں اور حدود کو متعین کرنے کیلئے

ہیں۔ مگر خدا نے نقطۂ اتصال معین کر ہی دیا اور یہ تلاشِ قدرت تھی۔ جستجوئے رب العالمین تھی کہ اُس نے اپنے اور اپنے رسولؐ اور اُنؑ کے اہل بیتؑ کے درمیان ایک نقطۂ اتصال قائم کر دیا اور معین کر کے کہہ دیا کہ دیکھو! تمہارا ولی میں ہوں۔

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"۔ (مائدہ 5-55)

کہ تمہارا ولی اللہ ہے اور اُس کا رسولؐ ہے اور وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہوئے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

میں تمہارا ولی، تمہارا رسول بھی تمہارا ولی اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے والا بھی تمہارا ولی۔

لہٰذا ایک لفظ ولی کو نقطۂ اتصال قرار دے دیا کہ اللہ کو ولی کہا جائے تو بجا ہے اور رسولؐ کے لئے استعمال کیا جائے تو بجا ہے اور علیؑ کیلئے استعمال کیا جائے تو بجا ہے بلکہ ان میں سے جن کیلئے نہ کہا جائے، بے جا ہے۔

حضراتِ والا! شاید آپ کی توجہ معنی خیز قرار پائے۔ ہم نے جتنے بھی نقطۂ اتصال بنائے تھے، دو کو ایک کرنے کیلئے تھے۔ دو کی جدائی کو قرب سے بدلنے کیلئے اور میں مثالیں دے چکا ہوں۔ ہم نے جتنے بھی نقطۂ اتصال بنائے تھے، کارآمد صورت میں بنائے تھے، کسی مقصد کے ساتھ بنائے تھے۔

یعنی "اگر تم بھی مومن اور یہ بھی مومن تو تم دونوں کا لڑنا کتنا بے محل ہے۔ کتنی بے جا بات ہے"۔ اس کو نقطۂ اتصال بے سبب تو نہیں بنایا تھا؟ قدرت نے ایک نقطۂ اتصال قرار دیا ہے۔ اپنے اور اپنے رسولؐ اور اُنؑ کے اہل بیتؑ کے درمیان میں

یعنی "ولی" ہونا۔

خدا نے فرمایا: "میں بھی ولی، میرا رسول بھی ولی اور وہ ایماندار جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں، وہ بھی ولی"۔

مگر نقطہ اتصال کا کچھ نتیجہ بھی ہے؟ جب میں (اللہ) بھی ولی، میرا رسولؐ بھی ولی اور وہ مومن نمازی جو رکوع میں زکوۃ دے، وہ بھی ولی تو اس نقطہ اتصال کا نتیجہ کیا ہے اور کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے کہ بے مقصد اتصال تو انسان بھی نہیں ڈھونڈتا اور اللہ تعالیٰ تو ارفع و اعلیٰ ہے!!

لہٰذا اگر پروردگار نے ولایت کو نقطہ اتصال قرار دیا یعنی اُس نے فرمایا کہ میں بھی ولی، میرا رسول بھی ولی اور وہ افراد اہل بیتؑ جو حالت نماز میں، رکوع کرتے وقت زکوۃ دیں، وہ بھی ولی ہیں۔ تو سب مذکورہ ہستیوں کو صرف ولی ہی تو قرار نہیں دیا بلکہ دوسرے مقام پر ان کی اطاعت کا حکم بھی تو یہ کہہ کر دیا ہے:

"اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ"۔

"اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی"۔

ان تینوں کی اطاعت تم پر فرض ہے۔ ان کے سوا کوئی تمہارا ولی نہیں ہے اور نہ اُس کی اطاعت تم پر مکلف ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم اطاعتِ خدا اور رسولؐ اور اولی الامر کے علاوہ کسی اور شخصیت کی اطاعت کا قلادہ نہیں پہن سکتے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ جہاں خدا نے رسولؐ اور اہل بیتِ رسولؐ کو یہ شرف عطا کیا کہ وہ بھی ہمارے ولی متعین ہوئے، اُنہیں اطاعت میں بھی اپنے ساتھ ملایا ہے یعنی ایسا لازم و ملزوم امر ہے کہ جو ولی ہوگا، اُس کی تم پر اطاعت بھی ہوگی

اور لامحالہ وہ تمہارا اولی الامر بھی ہوگا اور ولی ہوئے بغیر اُس کی تم پر اطاعت نہیں اور اطاعت کے ہوتے ہوئے وہ ولی نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔

حضرات! یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اس فہرست میں نہیں آسکا جس کو آیۂ ولایت نے اس طرح پیش کیا ہے:

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ"۔

"تمہارے ولی اللہ، رسولؐ اور وہ ایماندار ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور بحالتِ رکوع زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

حضراتِ والا! اس آیت میں "اِنَّمَا" کا حصار پہلے سے کھینچا ہوا ہے۔ لہٰذا جو آیت میں ولی ہیں، وہی ولی ہیں اور جو آیت میں مذکور نہیں ہیں، وہ ولی نہیں ہیں۔ تو جو آیت میں ہیں، وہی ولی ہیں تو کیا قرآن کا ذکر اس آیت میں ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس آیت میں قرآن ہے؟ ولی ہونے کی فہرست میں قرآن کا کہیں نام آیا ہے؟ قرآن کو جگہ دی گئی ہے؟

یہ لطف کی بات ہے کہ جب آیۂ ولایت میں قرآن شامل نہیں ہے تو آیۂ اطاعت میں بھی قرآن کا ذکر نہیں آیا کیونکہ ارشاد ہوا:

"اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ"۔

یہی تو اطاعت کے شعبے ہیں۔ اللہ کی اطاعت سے اطاعت کا آغاز ہے اور اولی الامر کی اطاعت پر اطاعت کا انجام ہے۔ وہاں سے جو اطاعت شروع ہوئی، وہ اطاعت یہاں ختم ہوگی۔

مجھے کہہ لینے دیجئے کہ "اَطِیْعُوا اللّٰہَ" نے بتلایا کہ اللہ سے پہلے کسی کی اطاعت نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کسی کی اطاعت کے بعد اللہ کی اطاعت تم پر ہے۔ اللہ کی اطاعت سے پہلے کسی کی اطاعت نہیں اور آیہ اطاعت کا حکم ختم کہاں ہوا؟ 'وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ' پر اور جب اطاعت کا حکم ختم ہو تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ کی اطاعت سے پہلے تم پر کسی کی اطاعت نہیں، اسی طرح سے اولی الامر کے بعد تم پر کسی کی اطاعت نہیں ہے۔

یہ اس لئے ہے کہ وہ وقت آ ہی نہیں سکتا کہ اُن کے بعد کا زمانہ ہو اور تم موجود رہو۔ یعنی یہ ناممکن ہے کہ تم رہ جاؤ اور وہ نہ رہیں۔ یہ بڑی منطقی چیز تھی جس کو میں نے پانی کر کے آپ کے سامنے پیش کیا۔

مجھے انصاف والے حضرات اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ رسولؐ خدا کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم خدا نے کیوں دیا؟ کیا اطاعتِ رسولؐ اپنی جگہ پر علتِ تامہ نہیں ہے؟ رسولؐ خدا کی اطاعت کے بعد اِن کی اطاعت کا حکم کیوں دیا؟

ہر شخص بآسانی یہ جواب دے گا کہ چونکہ رسولؐ کو ہمیشہ اس دُنیا میں رہنا نہیں تھا، اس لئے اطاعت کے حکم کو آگے بڑھایا ورنہ اگر پیغمبرؐ قیامت تک باقی رہنے والے ہوتے تو سرکار کی موجودگی میں خدا ہمیں کسی اور کی اطاعت کا حکم کیوں دیتا؟ اس لئے حکم دیا کہ جب یہ (رسولؐ) نہ ہوں تو پھر تم پر اولی الامر کی اطاعت ہے۔

تو ظاہر ہے کہ چونکہ رسولؐ نہ رہنے والے تھے، اس لئے اطاعتِ اولی الامر کا حکم دیا۔ اب اسی آیت سے پوچھئے کہ اطاعتِ اولی الامر کے بعد کسی کی اطاعت کا

حکم کیوں نہ دیا؟ اب اگر وہی وجہ یہاں بھی ہوتی کہ جب رسولؐ نہ رہیں تو اولی الامر کی اطاعت کرنا، اگر یہ سوال یہاں بھی آسکتا کہ اولی الامر نہ رہیں تو پھر اطاعت کا دروازہ یہ آیت ضرور کھولتی اور ہماری اطاعت کیلئے کوئی مرکز ضرور متعین کرتی۔ مگر مرکزِ اطاعت کا یہاں ختم کردینا بتاتا ہے کہ یہ تو ممکن ہے کہ رسولؐ نہ رہیں اور تم رہو مگر یہ ناممکن ہے کہ تم رہو اور اولی الامر نہ رہیں۔ یہ سلسلہ اولی الامر وہ سلسلہ نہیں ہے جو کسی دن ختم ہونے والا ہو۔

تمہیں ڈھونڈنا پڑے کہ وہ تو نہ رہے اور ہم ابھی موجود ہیں، اب کس کی اطاعت کریں؟ وہ رہیں گے اور کم از کم اُس وقت تک رہیں گے جب تک تم میں سے کوئی ایک فرد بھی موجود ہے۔ وہ قلبِ عالم ہیں۔ جب تک ایک ایک کو اپنی موجودگی میں رُخصت نہ کرلیں، اُن کا قدم صفحۂ کائنات سے اُٹھ نہیں سکتا۔

مجھے اس وقت حکماء کا ایک قول یاد آرہا ہے کہ ہماری زندگی کے جو لمحے ذکرِ اہل بیتؑ میں گزر جاتے ہیں، ساری زندگی کا حاصل ہیں۔ یہ وہ لمحے ہیں جو خدا کی عندیت میں پسندیدہ ہیں۔ میں بالکل صحیح کہنا چاہتا ہوں کہ نماز، روزہ سب عبادتیں مخلوقِ خدا کی اپنی جگہ بہتر سے بہتر چیزیں ہیں، فرائض ہیں، واجبات ہیں، فروعِ دین ہیں مگر ہمیں اپنے کئے ہوئے کسی بھی عمل کے بارے میں قبولیت کا یقین نہیں ہے۔ خدا جانے قبول ہو رہا ہے یا نہیں؟ اُمید و بیم کے عالم میں ہیں۔ مگر جب ذکرِ اہل بیتؑ کی سعادت ہمیں نصیب ہوتی ہے تو چونکہ ذکر میں شرکت ہے، بربنائے محبت ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہمارا عمل قبول ہو رہا ہے یا نہیں مگر ہمارا دل جانتا ہے کہ قبول ہو رہا ہے۔ اُن کے ذکرِ فضائل سے ہمارا دل بڑھتا ہے، ہمارا دل لپکتا ہے اور انبساط و سرور

ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا سرور خود بتا رہا ہوتا ہے کہ ہمارا عمل قبول ہے۔

جب اُنؑ کے ذکر مصائب سے ہمارے دلوں میں انقباض پیدا ہوتا ہے اور رنج وملال کے آثار طاری ہو جاتے ہیں، کوئی آنسو نکلے یا نہ نکلے، اُس سے کوئی بحث نہیں۔ کم سے کم یہ بات یقینی ہے کہ جب اُنؑ کے دُکھ کا حال ہم سنتے ہیں تو ہمارا دل دردمند ہوتا ہے اور ہمارے دل کا دردمند ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا عمل قبول ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ یہ درد مصنوعی نہیں اور وہ سرور مصنوعی نہیں۔ ان چیزوں میں ریا کا گزر نہیں ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ انسان پیدا ہوتا ہے اور کیا کہنا خدا کے عزم کا کہ بناؤں اور ایسا نقش کھینچوں کہ آج تک جتنے نقش کھینچے ہیں، اُن سے یہ نہ ملے۔ اس کے بعد جو نقش کھینچوں، اُن سے بھی نہ ملے۔ ایک بے مثل شے بنے اور ایسی جگہ بنے کہ جہاں تین اندھیرے چھائے ہوئے ہوں۔

"فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ".

یہ قرآنی فقرہ ہے کہ دستِ نقاشِ ازل ایسے تاریک مقام پر نقاشی کر رہا ہے کہ جہاں کسی روشنی کا ذکر نہیں۔ اس عزم کے ساتھ صورت ایسی بنائے کہ بے مثل ہو۔ وہ بنا رہا ہے۔ اعضاء و جوارح بن گئے اور جب شکم مادر میں تمام اعضاء و جوارح کی تکمیل ہو گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ منزل بن گئی۔ تو نازل کے نزول کا موقع ہے۔ انسان کا یہ جسم منزل ہے اور روح نازل ہونے والی شے۔ جسم روح کی خاطر بنایا ہے۔ روح جسم کیلئے نہیں بنائی گئی۔

جب اعضاء و جوارح مکمل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے نفخ روح کیا اور اس مردہ

جسم کو (جو مثل مردہ ہے) روح کے داخل کرتے ہی زندہ کر دیا۔

لیکن حضرات والا! آپ نے کبھی اس طرف توجہ فرمائی کہ اس پورے نظامِ جسمانی میں جب روح کا داخلہ ہوتا ہے تو ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟ وہ پہلا عضو کونسا ہے جو باروح ہوتا ہے؟

حضرات والا! یہ طے شدہ ہے کہ:

"اَوَّلَ مُتَحَرِّکٍ یَتَحَرَّکُ فِیْ بَدْنِ الْاِنْسَانِ فَھُوَ قَلْبُہٗ".

روح سے پہلے یہ جسم بالکل ساکن تھا، بے حس تھا، بے حرکت تھا، بے جان تھا۔ بالکل ایسا تھا کہ جیسے روح کے نکل جانے کے بعد مردہ اجسام ہوتے ہیں۔ بے بس و بے حرکت۔ روح کے داخل ہونے سے پہلے یہی حالت تھی۔ بے حرکت جسم میں جو عضو پہلے متحرک ہوتا ہے، وہ قلب انسان ہے۔ قلب کے بعد پھر باقی اعضائے انسانی میں روح کی لہریں دوڑتی ہیں۔

یہ ابتدائے آفرینش ہے کہ پہلا متحرک انسان کا قلب ہے اور ایک وقت اس روح کی رُخصت کا ہے۔ یہ تو مرنے کے وقت ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اب آنے کا جو طریقہ تھا، وہ جانے کا نہیں رہا۔ اب روح کے کھینچنے کا وقت آیا۔ جسم کے بے روح ہونے کا وقت آیا۔ یہ آپ کے مشاہدے کی چیزیں ہیں۔ ہاتھ بے روح ہو گئے، پیر بے روح ہو گئے، اعضاء و جوارح سے روح نکلتی جا رہی ہے۔ ہاتھ میں روح نہیں ہے مگر دل میں روح باقی ہے۔ اعضاء و جوارح میں روح نہیں ہے مگر دل میں روح باقی ہے۔ روح کے نکل جانے کا نام متحرک کے ساکن ہو جانے کا ہے۔

لہٰذا جب متحرک کے ساکن ہونے کا وقت آتا ہے تو:

"آخِرَ سَاكِنٍ يَسْكُنُ فِي بَدَنِهٖ فَهُوَ قَلْبُهٗ".

آخری وہ عضو کہ جو سب کے بعد ساکن اور بے روح ہوتا ہے، وہ قلبِ انسان ہے۔ تمام اعضاء و جوارح سے روح نکل جانے کے بعد آخر میں دل سے روح نکلتی ہے۔ لہٰذا یہ دل آنے میں سب سے پہلے اور جانے میں سب کے بعد۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ نظامِ جسمانی ایک لمحہ کیلئے بھی سلطان کے بغیر قائم رہے۔ قلبِ انسان سلطانِ اعضاء ہے۔ وہ سلطانِ نظامِ بشر ہے۔ تو اس سلطان کے بغیر رعایا کا وجود ایک لمحہ کیلئے بھی گوارا نہیں۔ پہلے سلطان آئے، آنے میں یہ پہلے ہو۔ رعایا بعد میں ہو اور جب جانے کا وقت آئے تو رعایا پہلے رخصت ہو، سلطان کا قدم سب کے بعد اُٹھے۔

جس طرح سے ایک ایک نظامِ جسمانی کا یہ عالم ہے کہ اُس کا قلب اس نظام کا سلطان ہوتا ہے، اسی طرح اس کائناتِ عالم کا بھی کوئی قلب ہے اور وہی سلطان قرار پاسکتا ہے جو آیا سب سے پہلے ہو اور جانے والا سب کے بعد ہو۔ مشہور حدیث ہے:

"اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِيْ".

"سب سے پہلے جو چیز اللہ نے پیدا کی ہے، وہ میرا نور ہے"۔

یہ کب پیدا ہوا؟ جب کچھ نہ تھا۔ قلبِ عالم کی مثال، لیکن حضرات! جب قلبِ عالم کی مثال ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ نور اس نظامِ کائنات سے پہلے نہ چلا جائے۔ جب آنے میں پہلے ہے تو جانے میں آخر ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے قدرت نے اُس کے اجزاء قرار دیئے ہیں۔ ہر نور اپنی جگہ وہی نور ہے۔ وہی نور ہے تو جس طرح سے وہ نور آنے میں سب سے پہلے ہے، اسی طرح وہی نور جانے میں سب سے

بعد ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے، اس پر ہمارا مذہب ہے۔

میں ایک حکایت سنانا چاہتا ہوں۔ ہمارے چھٹے امامؑ کی بارگاہ کی حکایت ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب، آپؑ کے فیضِ محبت سے مستفید ہونے والے آپ کے سامنے بیٹھے تھے کہ اس وقت آپؑ کے اصحاب میں سب سے کم عمر ہشام بن حکم تھے، نوجوان تھے۔ امام علیہ السلام ایک مرتبہ ہشام سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ ہشام! وہ مناظرہ جو تم نے شیخِ بصرہ سے کیا تھا، ہمیں بھی سناؤ۔

ہشام نے عرض کیا: "سرکارؑ! مجھے یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ آپؑ کے سامنے، آپؑ کے روبرو اپنی کسی تقریر کا اعادہ کروں؟"

امامؑ نے ارشاد فرمایا کہ ہم سننا چاہتے ہیں، تم سناؤ گے نہیں؟

یہ سننا تھا کہ یہ تھرا گئے اور عرض کی: "سرکارؑ! میری کیا مجال ہے کہ نہ سناؤں مگر میری زبان آپؑ کے سامنے کچھ عرض کرتے ہوئے لکنت کرتی ہے، رُکتی ہے مگر حکم ہے تو میں سناتا ہوں"۔

اب ہشام بیان کرتے ہیں: "فرزندِ رسولؐ، آقائے نامدار! زمانہ تھوڑا سا گزرا کہ میں نے سنا کہ بصرہ میں بڑا زبردست علامہ آیا ہوا ہے اور وہاں کی مسجد جامع میں وہ بڑے مغلق اور اُلجھے ہوئے مسائل حل کرتا جا رہا ہے۔ مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ میں بھی اس شیخ کو دیکھوں اور اس کی شیخی کو دیکھوں۔ دیکھوں کہ کتنا بڑا صاحبِ علم و فضل ہے۔ میں مشتاق ہوا اور بہرحال بصرہ پہنچا اور مسجد جامع میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے سامنے ہزاروں آدمیوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور ہر آدمی کے سوال کا جواب آسانی سے دیتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں بھی صفوں کو چیرتا ہوا اُس کے سامنے جا

بیٹھا۔ میں نے کہا کہ شیخ! مجھے بھی آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ شیخ نے کہا کہ یہاں نہ تمہید کی ضرورت ہے اور نہ سوال سے قبل اجازت لینے کی۔ جو پوچھنا ہے، پوچھو۔

میں نے کہا کہ تمہید کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ جو میں پوچھوں گا، آپ بتائیں گے۔ اُس نے کہا کہ کسی نے مجھ سے وعدہ لیا ہے؟ تم نیا کام کر رہے ہو۔ وعدہ کیسا؟ میں نے کہا کہ آپ وعدہ نہیں کر سکتے تو میں پوچھنا ہی نہیں چاہتا۔ آپ وعدہ کرلیں کہ جو میں پوچھوں گا، آپ اُس کا جواب دیں گے۔ آخر شیخ نے زچ ہو کر کہا کہ اچھا صاحب! میرا وعدہ ہے۔

جب ہشام ابن حکم نے وعدہ لے لیا تو امامؑ سے بیان کر رہے ہیں کہ پہلا سوال میں نے اُس سے یہ کیا کہ کیا آپ کی آنکھیں ہیں؟ اُس نے کہا کہ یہ کوئی سوال ہے؟ میں نے کہا کہ بس وعدے پر رہئے۔ آپ کا وعدہ ہے کہ جو پوچھوں گا، آپ اُس کا جواب دیں گے۔ اُس نے کہا کہ آنکھیں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آنکھ سے کیا کام لیتے ہیں؟ اُس نے کہا کہ دیکھتا ہوں۔

آپ کے کان ہیں؟ اُس نے کہا کہ کیا پوچھ رہے ہو؟ میں نے کہا کہ وعدے کو یاد رکھئے۔ جواب دینا آپ کا فرض ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ ہیں اور میں اُن سے سنتا ہوں۔

میں نے کہا کہ آپ کی زبان ہے؟ ہاتھ ہیں؟ ناک ہے؟ پیر ہیں؟ آخر کلام میں ہشام نے پوچھا کہ آپ کے دل بھی ہے؟ اُس نے کہا کہ دل نہ ہوتا؟

برخوردار! نظامِ جسمانی میں دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے۔ یہ آنکھ، ناک، کان اور زبان جو ہم رکھتے ہیں، اگر دل نہ ہو تو سب بیکار ہیں۔

شیخ نے کیا اچھی بات کی! آنکھ صورت بتاتی ہے مگر کس کی صورت ہے؟ یہ بتانا آنکھ کا کام نہیں ہے۔ یہ صورت زید کی ہے، یہ بتانا آنکھ کا کام نہیں۔ آنکھ تو ایک ایسی شے ہے جو بے عقل ہے۔ دیکھ رہی ہے۔ کان سنتے ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے اور اگر سنی گئی آواز کو سمجھا نہ جائے تو بیکار ہے۔

شیخ نے بتایا کہ یہ سب اعضاء تو خدمت گار دل ہیں۔ یہ جو دیکھتے ہیں، سنتے، چکھتے ہیں، سونگھتے ہیں، ان تمام معاملات کو دل پر پیش کرتے ہیں۔ وہاں سے فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ اگر دل نہ ہو تو تمام اعضاء و جوارح بیکار ہیں۔ شیخ نے بڑے اطمینان سے یہ فلسفہ بیان کیا اور ہشام نے ترغیب دلا کر فلسفہ بیان کروالیا۔

آخر میں ہشام نے کہا کہ بے شک آپ کی ساری تقریر صحیح ہے۔ مگر اب یہ بتائیں کہ خداوند عالم نے ایک انسان کے جسمانی نظام کو بادشاہ کے بغیر نہیں چھوڑا۔ جس نے ایک نظامِ جسم کو بغیر بادشاہ کے نہیں چھوڑا اور یہ بھی نہیں کہا کہ خود بنالو، بادشاہ خود ہی قرار دیا ہے اور حکمران خود ہی قرار دیا ہے۔

تو جس نے ایک نظامِ جسم کو بغیر بادشاہ کے نہیں چھوڑا، اُس خدا نے رسولؐ کے بعد اتنے لاکھوں مسلمانوں کو بغیر بادشاہ کے چھوڑ دیا؟

شیخ نے سنا اور سمجھا اور سمجھ کر، واقعی اُس کا تدبر ہے اور فہم ہے کہ اصل چیز کا تو اُس نے کچھ جواب نہ دیا مگر یہ سن کر کہا:

"اَنْتَ الْهِشَامُ اِبْنُ الْحُكْمِ"۔

"کیا ہشام ابن حکم آپ ہی کا نام ہے؟"

اس لئے کہ ہشام ابن الحکم اپنی فراستِ علمیہ میں دُور دُور تک مشہور تھے۔

چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر ٹالنا بھی چاہا:

"اَنَا رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ مَدِيْنَةَ".

شیخ نے کہا:

"وَاللّٰهِ اَنْتَ الْهِشَامَ اِبْنَ الْحَكَمْ".

شیخ نے کہا کہ آپ لاکھ چھپائیں، ہشام ابن الحکم آپ ہی ہیں۔

امامؑ نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ تو ہشام عرض کرتے ہیں کہ سرکارؑ! یہ آپؑ کا فیض ہے اور یہ آپؑ کی نورانی شعاعیں ہیں جو ہمارے دلوں اور چہروں پر پڑی ہیں کہ جب تک میں بیٹھا رہا، جو لوگ شیخ سے سوال کرتے تھے، شیخ ہر ایک کو روک دیتا تھا۔ سوال کرنے والوں کو جواب نہ دیتا تھا، میری طرف ملتفت رہا۔ کبھی آپؑ کی خیریت پوچھی اور کبھی حلقہ احباب اور کاروبار کا احوال پوچھا۔ میں نے بار بار کہا کہ جواب دیجئے۔ شیخ نے کہا کہ رہنے دیجئے۔

امام علیہ السلام نے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

"مَنْ عَلَّمَكَ هٰذَا".

ہشام! یہ تقریر تم نے کہاں سے سیکھی تھی یا کس نے بتائی تھی؟

ہشام نے کہا کہ مولاؑ! یہ میری زبان پر خود بخود جاری ہوگئی تھی۔ امامؑ نے سن کر فرمایا:

"وَاللّٰهِ هٰذَا مَكْتُوْبٌ فِيْ صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى".

یہ تقریر جو تمہاری زبان پر آئی ہے، یہ صحفِ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ میں موجود ہے۔

کیا کہنا فیوضِ امامت سے فیضیاب ہونے والے حضرات کا! پھر جن کے شاگرد بے

پڑھے پڑھائے ہیں، اُن کے اُستاد کتنے صاحبِ علم وفضل ہوں گے!

تو حضرات! یہ خصوصیت اسی گھرانے کی ہے۔ جانتے ہیں مگر معلم نہیں رکھتے۔ سب کچھ علم میں ہے مگر کسی نے آج تک نہیں بتایا کہ علم اُنہوں نے کہاں سے سیکھا؟ کوئی نہیں کہہ سکا کہ فلاں امام کا اُستاد فلاں تھا۔ آخر دُنیا نے ڈھونڈا تو ہوگا۔ اسی دُنیا میں وہ حضرات تھے۔ جہاں دُنیا والوں نے ہزاروں سبب اُن کی منقصت کے ڈھونڈے، وہاں اگر کوئی اُن کا اُستاد ہوتا تو وہ زبانوں پر نہ آتا اور ذکر نہ آتا؟

بچپن کا عالم ہے اور علمی خزانے جاری ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ کب پڑھ لیتے ہیں؟ کون پڑھا دیتا ہے؟ کس طرح پڑھ لیتے ہیں؟

امام تو امام، بیمارِ کربلا، جو امام تھے اپنے زمانے کے، نے اپنی پھوپھی کے حق میں وہ لفظ کہا ہے کہ اُس سے بہتر لفظ ہو ہی نہیں سکتا۔

"اِنَّکِ عَالِمَۃٌ غَیْرُ مُعَلَّمَۃٍ".

پھوپھی اماں! آپ وہ صاحبِ علم ہیں جس کو پڑھایا نہیں جا سکتا اور:

"فَھِمَۃٌ بِغَیْرِ مُفَھِّمَۃٍ".

اور آپ وہ صاحبِ فہم ہیں جس کی سمجھ کو کوئی سمجھ والا بڑھا نہیں سکتا۔

کیا کہنا اُس فہیمہ کا، کیا کہنا اُس علمی منزلت کا!!

ارے جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کی وہ منزلت ہے کہ جب آپؑ کوفہ میں تھیں، اپنے بزرگوار کے زمانہ میں، تو زنانِ مدینہ آپؑ کی زیارت کی مشتاق رہا کرتی تھیں اور حاضر ہوتی ہیں تو قرآن کی تفسیر کا سبق پڑھتی ہیں۔ فقہ کے مسائل دریافت کرتی ہیں اور جنابِ زینبِ کبریٰؑ کوفہ کے دارالامارہ میں بیٹھ کر قرآن کی تفسیر کا سبق

دیا کرتی تھیں۔

ایک وہ وقت تھا جنابِ زینبؑ کیلئے اور پھر وہی زینبؑ، وہی کوفہ۔ زمانہ کچھ اور آگے بڑھ گیا تھا۔ اب عالمۂ غیر معلمہ، وہی فہیمۂ غیر مفہمہ، آج کوفہ میں آ رہی ہیں، اس شان سے کہ سر پر چادر نہیں ہے، سر بے ردا ہے۔ کوفہ میں داخلہ ہے۔ زینبؑ کو اپنا وہ تزک و احتشام یاد تو آتا ہوگا کہ یہی وہ کوفہ ہے اور میں وہی زینبؑ ہوں مگر آج کیا بے بسی و بیکسی کا وقت ہے!

اُسی دارالامارہ میں وہ پہلے رہ چکی تھیں، زینبؑ آج اس میں داخل ہو رہی ہیں، اس شان سے کہ بازوؤں میں ریسمانِ ظلم ہے، اسیری ہے، مقید ہیں۔ نبی زادیاں آپؑ کے جلو میں ہیں۔ بھائی کا سر بریدہ آپؑ کے سامنے ہے، تختِ حکومت پر ابن زیاد بیٹھا ہوا ہے۔ اس موقعہ کیلئے کسی نے نقشہ کھینچتے ہوئے کہا اور کسی نے کیا دعبل خزاعی کے قصیدہ کا مشہور شعر ہے:

بَنَاتُ زِیَادٍ فِی الْقُصُوْرِ مَصُوْنَةٌ
وَبَنَاتُ رَسُوْلِ اللّٰہِ منحتکات

"ابن زیاد کی بیٹیاں تو قصر کے اندر باپردہ بیٹھی تھیں اور رسولؐ کی بیٹیاں تھیں جو ابن زیاد کے تخت کے سامنے کھڑی تھیں"۔

نبی زادیاں کھڑی ہیں اور نبی زادہ کھڑا ہے۔ بیمارِ کربلا ہیں۔ زینبؑ کی نظر بھائی کے سر پر ہے، سید سجادؑ کا سر جھکا ہوا ہے۔

اللہ، اللہ! یہ نجس اور یہ شوم ابن زیاد امام حسین علیہ السلام کے سر کے ساتھ بے ادبی کرتا ہے۔ کبھی اپنا پائے نجس سرِ امامؑ کی طرف پھیلا دیتا ہے، کبھی سمیٹ لیتا

ہے، کبھی سرِ حسینؑ کو اُٹھا کر زانو پر رکھ لیتا ہے اور حد ہو گئی آخری مرحلہ پر کہ ظالم نے چھڑی اُٹھائی اور لب ہائے امام حسینؑ سے گستاخی اور بے ادبی ہو رہی ہے۔ یہ چھڑی امامؑ کے دانتوں پر چل رہی تھی۔

زید بن ارقم اصحابِ رسولؐ میں سے تھے، کھڑے تھے اور لب ہائے امامؑ سے بے ادبی ہو رہی تھی۔ یہ چھڑی امامؑ کے لبوں پر چل رہی تھی، کھڑے تھے۔ مگر جب یہ دیکھا کہ ظالم چھڑی چلا رہا ہے اور دُرِ دندانِ امامؑ سے بے ادبی کر رہا ہے تو اس مرحلہ پر زید بن ارقم سے خاموش نہ رہا گیا اور بالکل بے حواس ہو کر کہا:

''اللہ تیرے ہاتھ کو قطع کر دے۔ اے ظالم! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن ہونٹوں سے تو بے ادبی کر رہا ہے اور جن دانتوں سے تو بے ادبی کر رہا ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسولؐ اللہ بوسے دیا کرتے تھے، ان دانتوں کو چوسا کرتے تھے۔ آج تو یہ بے ادبی کر رہا ہے''۔

ظالم نے اس کی طرف خشم کی نظر سے دیکھا اور کہا: ''زید بن ارقم! اگر تم اصحابِ پیغمبرؐ سے نہ ہوتے تو ابھی قتل کر دیئے جاتے''۔

زید بن ارقم نے سنا اور ایک کلمہ کہا کہ میں اس لئے چھوڑا جا رہا ہوں کہ میں اصحابِ رسولؐ میں سے ہوں؟ اس لئے میری جان بخشی ہو رہی ہے کہ میں اصحابِ رسولؐ میں سے ہوں اور یہ سر جو تیرے زانو پر ہے، یہ سر جو تیرے سامنے رکھا ہے، یہ کس کا ہے؟ اسے بھی رسولؐ سے کوئی رشتہ ہے کہ نہیں؟ اور یہ بیبیاں جو سر برہنہ تیرے سامنے کھڑی ہیں، انہیں بھی رسولؐ سے کوئی رشتہ ہے یا نہیں؟ افسوس! کہ اصحابِ رسولؐ پر نگاہِ اعانت ہو اور فرزندِ رسولؐ پر یہ نگاہِ عداوت ہو اور ان بیبیوں پر یہ تشدد ہو؟

اُن کو نہ چھوڑا جو نبی کی نواسیاں ہیں اور اُس پر رحم نہ کیا جو رسول کا فرزند ہے"۔

اس کے بعد یہ کہتے ہوئے: "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّابِاللّٰهِ"

اُس کے دربار سے نکل گئے۔ جو کچھ اُنہوں نے کہا تھا، نظر انداز کر دیا گیا۔

اس کے بعد ابن زیاد نبی زادی، جناب کبریٰؑ کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے اندر تاب نہیں ہے کہ میں اُن کلمات کا اعادہ کرسکوں جو اُس ملعون کی زبان پر آئے۔ بہرحال شیر خدا کی بیٹی جواب دے رہی ہیں اور مجمع یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تو علیؑ کے بولنے کی آواز ہے۔ یہ تو علیؑ کا لہجہ ہمارے کانوں میں گونج رہا ہے۔

ابن زیاد نے بھی درمیان میں ایک لفظ کہا کہ تمہارا بیان علیؑ کے کلام سے کتنا مشابہ ہے! تو آخر مشابہ کیوں نہ ہوتا؟ آخر علیؑ کی بیٹی ہیں۔

بہرحال وہ طعن و تشنیع کر رہا ہے اور سیدہؑ کی بیٹی اُس کے ہر ہر طعن کا جواب دیتی جا رہی ہیں۔ کیوں رُکتیں؟ سید سجادؑ دیر تک تو خاموش رہے۔ مگر سید الصابرینؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جس ذات پر صبر کی انتہا ہے، وہ سجادؑ اس مرحلہ پر آ کر بے صبر ہو گئے۔ تو پھر کیا کہنا آپؑ کی شجاعت کا اور پھر کیا کہنا آپؑ کی کمال ہمت کا!! آپؑ نے ابن زیاد کی طرف دیکھا اور فرمایا: "یابن اللئام متیٰ تھتک عمتی"۔

اے کمینوں کی اولاد! آخر تو میری پھوپھی کی ہتک کب تک کرتا جائے گا؟ کب تک تو اُن کو طعن و تشنیع کرتا رہے گا اور میں کب تک سنتا رہوں گا؟ تو اِن کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے کہ وہ کس ماں کی بیٹی ہیں اور کس نانا کی نواسی ہیں اور کن بھائیوں کی بہن ہیں؟ اے بدنصیب! تو اپنے طعن و تشنیع کے ذریعہ سے اُن لوگوں کی بھی پہچان کروا رہا ہے جو اَب تک زینبؑ کو پہچانتے نہ تھے!

امامؑ نے صحیح دعوے کے ساتھ یابن اللعام کہہ کر اُس کو ٹوکا۔ پھر اُس کی یہ حالت ہوئی کہ اپنے جوش اور غم وغصہ میں کانپنے لگا اور کانپتے ہوئے اُس نے کہا:

"نہیں ہے کوئی اس دربار میں جو اس گستاخ کا کام تمام کردے؟"

بس اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ کوئی ظالم شمشیر بکف سید سجادؑ کے قریب پہنچ گیا۔ اب جنابِ زینبؑ نے دیکھا کہ ایک ہی رہ گیا تھا۔ اب اس دربار میں یہ بھی قتل کیا جارہا ہے۔ خدا کی قسم! وہ کام کیا کہ جس سے بہتر کوئی مثال نہیں ہوسکتی تھی۔ جب یہ دیکھا کہ تلوار کا وار چلا چاہتا ہے اور لاوارثوں کا وارث بھی قتل ہوا چاہتا ہے تو آپؑ بھتیجے سے لپٹ گئیں اور لپٹتے ہوئے آپؑ نے کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ اکیلا سجادؑ مارا جائے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ سجادؑ اکیلا قتل کردیا جائے۔ یہ قتل ہوگا تو اس کی پھوپھی بھی ساتھ قتل ہوگی۔ تلوار کا وار چلے گا تو اکیلے سجادؑ پر نہیں بلکہ دونوں پر چلے گا۔ ظالم سے کہا کہ اب تو اپنا وار چلا اور قتل کر۔ ہم دونوں کا قاتل بن۔

بس جنابِ زینبؑ کا یہ فرمانا اور بھتیجے سے لپٹنا دربار میں شورِ گریہ بلند ہوگیا اور ہر ایک کی زبان پر یہ آنے لگا کہ سارا گھر کا گھر اس خاندان کا کربلا میں مارا گیا اور کربلا کی زمین اُن کے خون سے سیراب ہوچکی ہے۔ اب لاوارثوں کا ایک وارث رہ گیا ہے، اُسے قتل کرنا بیکار ہے، نہایت ظلم ہے۔

جنابِ زینبؑ کی آواز یہ تھی کہ نہیں، میں قتل سے نہیں روکتی مگر اتنا ہے کہ میں بھتیجے کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ برابر لپٹی رہوں گی تاکہ جو وار ہو، وہ دونوں کا کام تمام کردے۔

ابن زیاد کو خاموش ہونا پڑا اور زینبؑ کی غمخواری سے امامؑ کی خدا نے حفاظت کردی۔

نویں

مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى".

"اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا". (شوریٰ:23) و (مریم:96)

اجر رسالت، بلفظ دیگر محبت اہل بیتؑ کے ذکر کو سننے کیلئے آپ حضرات جمع ہوئے ہیں۔ گرمی کا موسم بھی ہے اور محبت کی گرمی بھی ہے۔ پروردگار ارشاد فرما رہا ہے اور یہ کہتے ہوئے وعدہ فرما رہا ہے:

"یقیناً جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں، عنقریب رحمٰن اُن کیلئے محبت قرار دے گا"۔

کھلی ہوئی آیت ہے اور کھلا ہوا وعدہ ہے۔ ہونے والی کسی قرارداد کا تذکرہ ہے۔ وعدے کے الفاظ پر پھر ایک نظر ڈالیں۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں، رحمٰن اُن کیلئے قراردادِ محبت پیش کرے گا۔ رحمٰن اُن کیلئے عنقریب محبت کا حکم بھیجے گا۔

حضرات! یہیں سے فوراً ایک بات طے پا رہی ہے کہ وہ معمولی باتیں جن میں کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی، وہ تمہید کے بغیر بیان کی جاتی ہیں۔ معمولی باتوں کیلئے کسی تمہید کا قائم کرنا اتنا ہی عیب ہے جتنا کہ کسی اہم بات کو بغیر تمہید کے پیش کرنا۔ اب متکلم خود جانے کہ کونسا اُس کا کلام اُس کے نزدیک اہم ہے اور کونسی باتیں عام باتیں ہیں۔ اس قرآن مجید میں حکم نماز کا بھی ہے، روزے کا بھی ہے۔ جو حکم دینا منظور ہوا،

وہ حاکم نے دے دیا۔ پہلے سے کیوں متنبہ کیا جائے؟ کیوں منتظر بنایا جائے کہ حکم کے سننے کے مشتاق ہو جاؤ۔ ہم ایک مہتم بالشان حکم نماز کے بارے میں، زکوٰۃ کے بارے میں، روزوں کے فرض قرار دیے جانے کے بارے میں بھیجنے والے ہیں۔

بس حکم آیا، تمہید نہیں قائم کی گئی کیونکہ یہ چیزیں تمہید کی متقاضی نہیں تھیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں بعض احکام یقیناً قارئین کو نظر آئیں گے جن کیلئے قدرت نے پہلے سے تمہید آراستہ کی اور تمہید کو اُستوار کرنے کے بعد اہلِ عالم کو اصل مقصد کیلئے مشتاق بنانے کے بعد وقت آیا تو اصل شے کا اظہار کر دیا۔

آپ کے سامنے قرآن مجید کی آیت ہے جس میں پروردگار عالم نے اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ"۔ (مائدہ: 67)

"پہنچا دو جو نازل کیا جا چکا ہے، تمہاری جانب تمہارے رب کی طرف سے"

تو فوراً پتہ چلا کہ حکم اس آیت کے نزول سے قبل آ چکا ہے، اُسے پہنچا دو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حکم پہلے آ چکا ہے جب ہی تو "اُنْزِلَ" کہا اور جب ہی تو "مَآ اُنْزِلَ" کہہ کر اسی حکم کی طرف اشارہ کیا کہ جو آ چکا ہے، اُسے پہنچا دو۔

تو معلوم ہوا کہ حکم پہلے آ چکا ہے اور جو چیز پہلے آ چکی ہے، وہ تمہید کے طور پر آئی ہے۔ تمہید پہلے ہو چکی ہے۔ آج اُس کی اشاعت منظور ہے۔ تمہید پر غور کریں تو یہ آیت فوراً آپ کے سامنے آئے گی:

"فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ"۔

"اے میرے حبیبؐ! جب تم فارغ ہو جاؤ تو نصب کر دینا اور نصب کرنے

کے بعد اپنے رب کی طرف چلے آنا"۔

جب تم فارغ ہو جاؤ، اگر ہم سے کہا جا رہا ہوتا تو وضاحت ہوتی کہ کس فراغت پر کیا نصب کرنا ہے! مگر اس کلام کے مخاطب تو رسولؐ ہیں۔ وہ منشائے خدا سے آگاہ تھے اور "فَرَغْتَ" کا لفظ سنتے ہی سمجھ گئے کہ کس چیز سے فارغ ہو جانا مراد ہے اور وہ "فَانْصَبْ" کا لفظ سنتے ہی سمجھ گئے کہ کیا چیز نصب کروائی جا رہی ہے۔

لہٰذا حضرات! حکم آ چکا تھا کہ فراغت کے بعد نصب کر دینا اور نصب کرنے کے بعد ہماری طرف چلے آنا۔ اب جو حکم آ چکا تھا، اُس کے بھروسے پر کہا جا رہا ہے:

"بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ".

وہ بات جو تمہارے رب کی طرف سے نازل کی جا چکی ہے، اُسے آج پہنچا دو۔ وہ تمہید تھی جو پہلے آئی، یہ آیت اصل غرض ہے، جو بعد میں آئی۔

حضرات! ان عنوان سے کہنا چاہتا ہوں کہ پہلے خدا نے وعدے کی صورت میں آیت نازل کی اور ارشاد فرمایا کہ جو ایمان رکھتے ہیں اور اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں، عنقریب (وہ وقت دُور نہیں ہے) رحمٰن ان کی محبت کا حکم دے گا۔

یاد رکھئے گا کہ جیسے حُب اور محبت ایک ہی شے ہے، اسی طرح سے وُدّ اور مودّت بھی ایک ہی شے ہے۔ اس آیت میں لفظ وُدّ آیا ہے اور ہو سکتا ہے وعدے کی ایفا کے مقام پر لفظ مودّت آئے۔ وُدّ وہی ہے جو مودّت ہے اور مودّت وہی ہے جو وُدّ ہے۔

خداوند عالم نے وعدہ کر لیا، جی چاہتا ہے کہ میں اس مقام پر کہہ دوں کہ وعدہ کر کے اُس نے ایفائے وعدہ اپنے اُوپر لازم کر لیا۔ وعدہ ہو جائے تو "الکریم اِذَا

وَعَدَ وَفیٰ "، یعنی کریم جب بھی وعدہ کرتا ہے، اُسے پورا کر کے رہتا ہے۔

جب عام وعدہ ایفائے عہد کا مقتضی ہو تو وہ ذات جو عین کرم ہو اور کمالِ کرم ہو، اُس کا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ وعدہ کی وفا میں تو رُکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم وعدہ پورا نہ کر سکیں، ضعف عارض حال ہو جاتا ہے، مواقع سدِ راہ ہو جاتے ہیں، ہماری کمزوریاں روک دیتی ہیں۔

مگر یہ وعدہ اُس کا ہے جو قدیر مطلق ہے، جس تک ضعف کا گزر نہیں، جہاں عدمِ قدرت کا کوئی سوال نہیں، جہاں مانع اور حائل پیش آجانے کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا جب وہ وعدہ کرے، بس یہی آیت پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

"وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ".

"اللہ سے زیادہ کون ہو سکتا ہے جو اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو"۔

وعدہ تو رسول کا بھی کوئی ایسا نہ ملے گا جو وفا نہ ہوا ہو۔ وعدہ تو آئمہ میں سے بھی کسی ایک کا نہ ملے گا جو وفا نہ ہوا ہو۔ معصوم ہستیوں کا تو کیا ذکر ہے، جو لوگ رنگِ امامت میں رنگے گئے، وعدہ تو آپ کو اُن کا بھی ایسا نہ ملے گا جو ایفا نہ ہوا ہو۔ صادق جب وعدہ کرے گا، اپنے وعدے کو پورا کر کے رہے گا۔

مگر بصیرت افروزی کے اعتبار سے ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں، وعدے کے الفاظ یہ ہیں: "جو ایمان رکھتے ہیں، وہ جو الصالحات کو عمل میں لاتے ہیں، اُن کیلئے رحمٰن محبت کا حکم بھیجے گا"۔

حضرات! اس سلسلہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ بعض الفاظ ہمارے استعمال کی زد میں آ کر اپنے حقیقی معیار سے ایسے گر گئے ہیں کہ اب اُن کا حقیقی معیار ہمارے

تصور میں بھی نہیں آتا۔

''جو ایمان رکھتے ہیں'' یا ''ایمان رکھنے والے'' یا ''مومنین''۔ اب جب ان لفظوں کا استعمال ہم جیسوں کیلئے ہونے لگے اور میں اپنے جیسے کیلئے کرنے لگوں تو پھر لفظ ایمان کی کیا قدر رہے گی؟ لفظ مومن کی کیا قدر رہے گی؟

جب بھی واعظ اپنے مجمع کو مخاطب کرتا ہے تو کہتا ہے ''مومنین''۔ جب یہ مومنین ٹھہرے تو پھر کیسے کھلے کہ مومن کسے کہتے ہیں؟ تصور میں جناب یونس کی تسبیح کیسے آئے جس کا ذکر قرآن مجید کرتا ہے:

''لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ''.

اس تسبیح خوانی میں حضرت یونس مشغول تھے۔ اس کے بعد ارشادِ الٰہی ہوا:

''فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ''.

''ہم نے یونس کی دعا کو قبول کرلیا''۔

''وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ''.

''اور ہم نے اُسے غم سے نجات دی''۔

''وَكَذٰلِكَ نُـْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ''

''اور اسی طرح سے ہم مومنین کو نجات دیتے ہیں''۔

آپ نے توجہ فرمائی ہے تو سمجھ گئے ہوں گے کہ لفظ ''مومنین'' اس آیت نے کیسی ہستیوں کیلئے استعمال کیا ہے۔ حضرت یونس اور اُن کے انصار کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اسی طرح ہم انبیاء کو نجات دیا کرتے ہیں۔

''اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ''.

''ہماری جانب سے واضح آزمائش تھی''۔

ہم نے جانچنا تھا، جانچ لیا۔ اب ہم نے اُسے ذبحِ عظیم سے بدل دیا۔

"كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ".

"ہم اسی طرح سے محسنین کو جزائے خیر دیا کرتے ہیں"۔

تو محسنین (اس گروہ کو محسنین) کہہ رہا ہے جس گروہ میں ابراہیمؑ شامل ہیں۔ اب اندازہ کیجئے کہ محسنین کا گروہ کتنا بلند اور مومنین کا گروہ کتنا اونچا ہے۔ مگر لفظ ہمارے استعمال کی زد میں آ کر کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ ایمان ہم بھی رکھتے ہیں مگر ہم کیا اور ہمارا ایمان کیا!!

جب لفظ ایمان ہمارے کانوں تک پہنچتا ہے تو ہمیں اندازا ایسے ہی ایمان کا ہوتا ہے جیسے ایمان رکھنے والے ہم ہیں اور جب آیت میں لفظ مومن آتا ہے تو ہمارا تصور ایسی ہستیوں کی طرف چلا جاتا ہے کہ جن معنی میں ہم بھی مومن ہیں۔ مگر کہاں وہ مومن جسے خدا مومن کہے اور کہاں وہ مومن جسے بندہ مومن کہے۔

کلام میں جان متکلم کی رعایت سے ہوتی ہے۔ جتنا اونچا کلام بولنے والا ہو گا، اُتنی ہی جان متکلم کے قول کی ہوگی۔ ایک لفظ مومن وہ ہے جو میرا کہا ہوا ہے اور ایک لفظ مومن وہ ہے جو خدا کا بولا ہوا ہے۔

حضرات! میں کیوں نہ کہہ دوں کہ ایک تو وہ مومن ہیں جنہیں ہم مومن کہتے ہیں جو اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں۔ مومن کی تو جمع مومنین ہے۔ اب اس محفل میں جو ہے، وہ مومن ہے۔ سب مل کر مومنین ہوئے۔ ایک تو میری اس محفل کا ہر فرد اپنی جگہ مومن اور یہی لفظ مومن جب سورۂ حشر میں آتا ہے تو:

"الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ".

''خدا مؤمن ہے، نگہبان، طاقتور، زبردست صاحب کبریائی ہے''۔

کہاں وہ لفظ مؤمن جو میرے لئے ہے اور کہاں وہ لفظ مؤمن جو خدا نے اپنے لئے استعمال کیا ہے۔

تو خداوند عالم کے ارشاد میں وہ جو مؤمن ہوں، جو اعمالِ صالحہ کے بجالانے والے ہوں، اُن کیلئے وعدہ کیا جاتا ہے کہ پروردگار عنقریب اُن کے بارے میں مودّت کا حکم بھیجے گا۔ فوراً پتہ چلا کہ یہاں ایمان سے مراد ایمان کا کمال ہے اور اعمالِ صالحہ سے مراد اعمالِ صالحہ کی انتہائی معراج ہے۔ یہ وہ اعمالِ صالحہ بجالانے والے نہیں ہیں جو کبھی نیک عمل بجالائیں اور کبھی بد عمل کے مرتکب ہو جائیں بلکہ اعمالِ صالح سے مراد خدا کے یہاں اُن ہستیوں سے ہے جن کا کوئی عمل صالحات سے الگ نہ ہو۔ اُن کا ہر عمل صالح ہو اور اس بناء پر اُن میں کسی کا لقب صالح المؤمنین ہو۔

یہ وعدہ ہے۔ پہلے سے کیوں کیا جا رہا ہے؟ منتظر بنایا جا رہا ہے، تمہید قائم کی جا رہی ہے اور سچ پوچھئے تو اُسے ہمیں یہ بتانا ہے کہ دیکھو! میں وعدہ اسی شرط پر کر رہا ہوں کہ جب میں کسی مقام پر اس وعدے کی ایفا کروں تو فوراً سمجھنا کہ یہ وعدہ اسی منزل کے واسطے ہے۔ وعدہ اسی محل کے بارے میں اور وعدے کے الفاظ اسی مقام کیلئے تھے۔ ''آمنوا'' کے لفظ کو انہی کیلئے استعمال کیا تھا اور ''عَمِلُوا الصّٰلِحٰت'' کی نشاندہی انہی کے بارے میں تھی۔

اب یہ وعدہ، جس طرح سے کہ آپ کے سامنے آ گیا ہے، اسی انداز سے وعدہ کی ایفا بھی آپ کے سامنے آنی چاہئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ خدا نے وعدہ کیا اور ایک وقت ایسا بھی آنا چاہئے کہ خدا نے اس وعدہ کا ایفا بھی کیا ہو اور وہ محبت کا حکم جو

آنے والا تھا، وہ آیا ہو اور آیت بن کر آیا ہو، جہاں یہ آیت مبنی بر وعدہ نظر آرہی ہے، یہ کونسی آیت ہے؟ وہ یہ ہے:

"قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى".

"کہہ دو اے رسولؐ! میں اپنی تبلیغ پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، سوائے محبت اہل بیت کے"۔

ذرا ایک باریک سی بات آرہی ہے اور میں خاص طور پر آپ حضرات سے کمال توجہ کا ملتجی ہوں۔ وعدے میں آیت کے الفاظ تھے:

"آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ".

محبت کا حکم آنے والا ہے۔ کن کیلئے آنے والا ہے؟ اُن کیلئے جو ایمانِ کامل رکھتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ بجالاتے ہیں۔ اُن کیلئے محبت کا حکم آنے والا ہے اور یہ حکم آیا تو کیا کہتا ہوا نظر آیا؟

"میں تم سے تبلیغِ رسالت کا کوئی اجر نہیں چاہتا، سوائے محبت اہل بیت"۔

ایفائے وعدہ والی آیت میں اُنہیں قربیٰ کہہ کر یاد کیا جارہا ہے اور وعدے میں اُنہیں "آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے الفاظ استعمال کرکے معرف کردیا گیا تھا۔ بظاہر ہونا تو چاہئے تھا کہ جو لفظ آیت وعدہ میں استعمال کئے گئے تھے، وہی الفاظ ایفائے وعدہ میں آتے یا جس لفظ سے ایفائے وعدہ کرتا تھا، اُسی لفظ سے وعدہ کیا ہوتا مگر وعدہ کیا گیا اُن افراد کیلئے جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالاتے رہے۔

جو آیت وفائے وعدہ کے سلسلہ میں اُتری، وہ اقربائے پیغمبرؐ کے لئے ہے۔ میں اُس کیلئے مخصوص توجہ کا طالب ہوں۔

حضرات! یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ہر امر میں دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ جو امر کا معیار ہو اور ایک وہ جو اُس امر کیلئے شناخت اور پہچان مقرر کی جائے۔ معیار الگ ہوتا ہے اور پہچان کی چیزیں بالکل الگ ہوتی ہیں۔

اس وقت جو آپ کے سامنے تقریر کر رہا ہے، اُس کے سر پر ایک ٹوپی ہے، اُس کے جسم پر ایک قبا ہے، اُس کی انگشت میں ایک انگشتری ہے، صورت ایسی ہے اور شکل ایسی ہے اور آواز ایسی ہے۔ عمر ایسی ہے اور داڑھی ایسی ہے۔ وہی تقریر کر رہا ہے۔ لیکن یہ سب چیزیں تقریر کا معیار نہیں ہیں بلکہ مقرر کی پہچان ہیں۔

good

اگر یہ ٹوپی میرے سر پر اس وقت نہ ہو تو بھی میں تقریر کئے جاؤں۔ قبا اُتار کر پھینک دوں تو پھر بھی تقریر کئے جاؤں اور اگر داڑھی ایسی نہ بھی ہو تو میں تقریر کئے جاؤں۔ یہ لباس زیب بدن نہ ہو تو دوسرے لباس میں تقریر کئے جاؤں بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا نام بھی بنائے تقریر نہیں ہے۔ کوئی نام اور ہوتا، تب بھی تقریر ہو سکتی تھی۔ معیارِ تقریر کچھ اور چیز ہے اور بنائے تقریر نہیں ہے۔ معیارِ تقریر کچھ اور چیز ہے اور بنائے تقریر وہ چیز ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو تقریر کر ہی نہیں سکتا۔

اب معیارِ تقریر وہ چیز ہے جس کے بغیر تقریر نہ ہو سکے۔ اب مقرر کی پہچان کہ اُس کا لباس ایسا ہے اور بال ایسے ہیں اور ٹوپی ایسی ہے۔ یہ سب چیزیں پہچان کیلئے بتائی جاتی ہیں۔ نام بھی جو اشتہار میں دیا گیا ہے، پہچان کیلئے دیا گیا ہے۔ معیارِ تقریر بنا کر نہیں دیا گیا۔ آپ دوسرے نام رکھتے ہیں، وہ بھی تقریر کرتے ہیں۔

لہٰذا حضرات! اگر نام ہی تقریر کا معیار ہوتا تو جہاں یہ نہ ہوتا، وہاں تقریر نہ ہوتی۔ تو معیارِ تقریر تو ہے تقریر کر سکنا! تقریر کرنے کے لائق ہونا، تقریر کی صلاحیت

[illegible] تقرر [illegible] ہوتی [illegible]

[illegible] ہوتی۔

[illegible]

[illegible] سے [illegible]

[illegible] گے۔

اب حضرت [illegible] کے بعد یہ نہیں [illegible] قرابت [illegible]

[illegible] حکم [illegible] یہ لفظ نہیں ہے جس کے معنی [illegible]

[illegible] قرابت [illegible] ہے۔ یہ [illegible] ہے کہ

[illegible] (معاذ اللہ)

[illegible] قرابت [illegible] حضرت [illegible] حضرت [illegible]

[illegible] قرابت [illegible] پیغمبر تو [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] پیغمبر [illegible]

[illegible] ہوتا۔

قرابت کے اعتبار سے [illegible] حضرت [illegible] بھی تھیں۔ جن میں سے کوئی

[illegible] اگر [illegible] دیکھنا چاہتے ہو تو میری کتاب

[illegible] رسولؐ سے دشمنی ابوجہل کو بھی تھی۔ ابوسفیان کو بھی تھی مگر میں نے ان میں

سے کسی کا نام نہیں لیا۔ یہ [illegible] ہے کہ اگر رسولؐ کے کسی دشمن کا [illegible] اس کا جس کو رسولؐ سے

قرابت داری تھی جیسا کہ آیت "تبت یدا ابی لہب" سے واضح ہے۔ جس کے معنی

یہ نکلتے ہیں کہ اگر رسولؐ سے قرابت ہو [illegible] تو دوسروں کی رعایت کی حد تک

ہو سکتی ہے، ان کی نہیں ہو سکتی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ خداوند عالم نے محبت کا حکم بھیجنے کا وعدہ کرتے وقت بھی نہیں فرمایا کہ میں اقربائے نبی کی محبت کا حکم دینے والا ہوں بلکہ فرمایا تھا کہ محبت کا حکم بھیجنے والا ہوں، اُن کیلئے جو "آمنوا اور عملوا الصّٰلحٰت" کے اعلیٰ ترین معیار پر ہوں گے۔ میں قرابت دیکھ کر نہیں بلکہ اُن کا ایمان دیکھ کر، اُن کے اعمالِ صالحہ دیکھ کر حکم دوں گا کیونکہ وہ اُن کا ایمان کا کمال ہے اور اُن کا اعمالِ صالحہ کا کمال ہے جو باعثِ حکم نزولِ محبتِ قربیٰ ہوا۔ جس بناء پر میں چاہتا ہوں کہ عالم کو اُن کا محب بنا دوں اور انہیں محبوبِ عالم بنا دوں۔

حضرات! یہاں سے یہ تخیل بروقت ہوگا کہ کائنات اور عالمین کی بناء ہی محبت پر ہے۔ ارض وسماء کی تخلیق کا سبب ہی محبت ہے۔

"کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرِفَ".

میں تو خزانہ مخفی تھا۔ پس میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ میں نے ایک مخصوص خلق تھی، جسے پیدا کیا۔

تو اب یہ خلق، خالق کی جانب سے اُس "اَحْبَبْتُ" کی بناء پر ہے۔ یہیں سے پتہ چلا کہ محبت ہی باعثِ تخلیقِ عالم ہے اور خدا چاہتا ہے کہ جس محبت سے ابتداء ہوئی، اُسی محبت پر اس عالم کی انتہا بھی ہو جائے۔ ابتداء خدا کی محبت سے ہوئی اور انتہا بندگانِ خدا کی محبت سے۔ ابتدائے عالم سے لے کر انتہائے عالم تک محبت ہی محبت ہے اور یہ محبت بھی بندگانِ خدا کی جانب سے ہو اور یہ محبت بھی بر بنائے محبتِ خدا ہی ہے۔

غرضیکہ "آمَنُوا اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کہہ کر وعدہ کیا گیا اور "اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی" کہہ کر وعدہ کو ایفا کیا گیا۔ فوراً پتہ چلا کہ بنائے وجوبِ محبت اُن کا ایمان ہے اور اُن کے اعمالِ صالحہ ہیں۔ اور اقرباء کی جو یہ چیز بتائی گئی ہے، یہ تو پہچان ہے، یہ تو شناخت ہے، یہ تو معیارِ تعارف ہے۔ یعنی یہ تو سونے پر سوہاگہ ہے کہ ایمان میں بھی کامل اور اعمالِ صالحہ میں بھی منفرد اور شرفِ قرابت بھی رکھنے والے ہیں۔ تو سونے پر سوہاگہ ہے۔

حضرات! یہاں بحمد اللہ ذہنوں میں ترقی ہو رہی ہے، تصورات میں روشنی ہوتی جا رہی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس مقام پر عرض کر دوں کہ صبح کی نماز جو میں نے پڑھی ہے، اُس کا ثواب کیا آپ کو مل جائے گا؟ میرے گھر والوں کو مل جائے گا؟ میری اولاد کو مل جائے گا؟ اور یہ جو گناہ جو مجھ سے ہوتے ہیں، اُن کی سزا محلہ والوں کو، رشتہ داروں کو، قرابت والوں کو مل جائے گی؟ کیا وہ سزا کی زد میں آسکتے ہیں؟

طے شدہ ہے:

"لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی".

"ایک کا بوجھ دُوسرا اُٹھانے والا نہیں ہے"۔

ایک کا الزام دُوسرے پر نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر عبادت کر رہا ہے تو ثواب بھی وہی پائے گا جو عبادت کر رہا ہے۔ اگر معصیت کر رہا ہے تو سزا بھی وہی پائے گا جو معصیت کر رہا ہے۔ نہ عبادت میں کوئی دُوسرا حصہ لینے والا ہے اور نہ معصیت میں اُس کے وبال کا حصہ بٹانے والا ہے۔ شریکِ عبادت ہو جانا اور بات ہے۔ دو نے مل کر عبادت کی، جماعت نے مل کر نمازِ جماعت پڑھی مگر جہاں شرکتِ عمل نہ ہو، وہاں

عمل میں جزاوسزا میں شرکت کیسی؟ اسی وجہ سے قرآن نے صاف کہہ دیا:

"مَنْ اَحْسَنَ فَلِنَفْسِهٖ".

"جس نے نیکی کی، اپنے نفس کیلئے کی"۔

"وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا".

"اور جس نے گناہ کیا تو اُس نے اپنے اوپر ستم ڈھایا"۔

جب آپ یہ پڑھ چکے تو میں ایک سوال آپ سے کرنا چاہتا ہوں کہ دُنیا میں ہزاروں نیکیاں کی ہیں اور ہزاروں کرتے رہیں گے۔ لیکن نیکی نیک کے بقدر ہوتی ہے یعنی نیک ہی تو نیکی کرتا ہے۔ نیکی کا کتنا وزن ہوگا اور کتنا وزن لے سکتا ہوگا؟ میں ایک نماز پڑھتا ہوں اور ایک امام نے پڑھی۔ ایک نبی نے پڑھ لی۔ نام نماز کا ہر جگہ ہے مگر کیا میری نماز ویسی ہے جیسی امام کی نماز یا نبی کی نماز ہے؟

یہاں پھر کہنے کو جی چاہتا ہے کہ نیکی ہوتی ہے نیک کے بقدر۔ نیکی کرنے والا جس قدر کا ہوگا، ویسی ہی قدر کے لائق اُس کی نیکی ہوگی۔ اب مجھے بتایئے کہ سیدؐ الانبیاء سے کوئی زیادہ نیک ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا۔ سیدؐ الانبیاء کی نیکیوں میں بھی تبلیغ رسالت سے بہتر کوئی نیکی ہو سکتی ہے؟ آپ کی نماز کا کیا کہنا! وہ نمازوں کی امام ہے۔ آپؐ کے روزوں کا کیا کہنا! آپ کا روزہ روزوں کا مقتداء ہے۔ ایک طرف پیغمبرؐ خدا کی نیکیاں ہیں اور نماز روزہ ہے اور ذکرِ خدا ہے اور ایک طرف وہ نیکی کہ جس کا نام تبلیغ رسالت ہے یعنی وہ نیکی جو حضورؐ کی خلقت کا باعث ہے۔ پیدا ہی تبلیغ کیلئے ہوئے ہیں۔ اب یہ طے کرنا پڑے گا کہ آپ کی بے شمار نیکیوں سے پیغمبرؐ خدا کی نیکیاں آگے ہیں اور آپؐ کی تمام نیکیوں سے آپؐ کی تبلیغ رسالت پیش پیش ہے۔ وہ سب نیکیوں

کی سرتاج اور سب سے بہتر نیکی ہے۔ اُس کی مثال عالم میں نہیں ہے۔

جس کا نام تبلیغ رسالت ہے، وہ ایسی عظیم الشان نیکی ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ جب سب نیکیوں کی سرتاج رسولؐ خدا کی نیکیاں ہیں اور اس کی کوئی مثال نہیں اور اس سے زیادہ بے مثال تبلیغ رسالت کی نیکی ہے جو اعلیٰ ترین بے مثال شے ہے تو میں آپ سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب ہماری دو رکعت نماز، جو نقائص سے بھری ہوئی ہے اور وسوسوں سے مملو ہوتی ہے، جس میں خضوع کا پتہ نہیں اور خشوع کا نشان نہیں، خدا اُس کے ثواب کو ہمارے لئے بچا بچا کر رکھے اور فرمائے کہ جس نے پڑھی ہے، اُسی کو اجر دوں گا، غیر کو اجر نہ ملے گا۔

یعنی ہمارے اجر کی بھرپور ذمہ داری خدا لے رہا ہے اور اس کی حفاظت فرما رہا ہے مگر تبلیغ رسولؐ کی نیکی کا اجر خدا یوں چکا دے کہ رسولؐ کے پاس کچھ بھی نہ آئے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر آیت بھیج کر رسولؐ ہی کی زبان سے کہلوائے:

"قُل لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى".

"میں تبلیغ رسالت کا کوئی اجر تم سے نہیں چاہتا، بجز اس کے کہ تم میرے قربیٰ سے مودّت کرو"۔

اُن سے محبت کرو، قاعدہ کلیہ کے تحت، اجر رسالت رسولؐ خدا کو ملنا چاہیے تھا کیونکہ رسالت کی تبلیغ رسولؐ خدا کی بہترین نیکی تھی مگر اجر اس کا جو ہم سے مانگا گیا، وہ رسولؐ کی محبت نہیں ہے بلکہ اُن کی اولاد سے محبت قرار پا گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون رسولؐ خدا کی حد تک کیوں بدل گیا؟ ابھی ابھی تو خدا فرما رہا تھا:

"وَمَنْ اَحْسَنَ فَلِنَفْسِهٖ".

"اور جس نے نیکی کی، اُس نے اپنے نفس کیلئے کی"۔

تو جوابِ قدرت یہ ہوگا کہ مذکورہ آیت میں تو نے پورے طور پر غور نہیں کیا، خصوصاً ان الفاظ پر "جس نے نیکی کی، اُس نے اپنے نفس کیلئے کی"، اگر ان الفاظ پر غور کرلیتا تو کوئی شبہ نہ ہوتا کیونکہ اہل بیتؑ ہی تو نفسِ رسولؐ کہلانے کے مستحق ہیں۔

اس ذیل میں یہ عرض کرنا ہے کہ آیۂ مباہلہ میں "اَنْفُسَنَا" کا لفظ صرف حضرت علی علیہ السلام پر منطبق ہوتا ہے۔

یہاں سے ایک امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ قرابت جس کا ذکر آیت کر رہی ہے، اس چیز کو جاننے کے بعد اگر آپ کو اس کا اندازہ ابھی نہیں ہوا تو میں توجہ دلا دوں کہ جب فوراً ہی پتہ چلا کہ لفظ قربیٰ میں جس قرابت کا ذکر ہے، یہاں اُس سے مراد قرابت بالنبی نہیں ہے، اس لئے کہ اجر تبلیغ نبوت اور تبلیغ رسالت کا ہے۔ اگر کوئی اس کو پاس رکھتا ہے تو وہی جسے رسالت اور نبوت سے رشتہ ہو اور اگر نبوت و رسالت سے رشتہ ہے تو برمحل ہے، بے شک برمحل ہے۔

حضرات! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مناجات میں ایک لفظ آ گیا ہے:

"وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ"۔

یہاں بھی چونکہ آنحضرتؐ نے خود فرما دیا ہے:

"اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی"۔

آپ کو یاد ہوگا کہ حضرت موسیٰؑ نے التماس کی تھی کہ بارالٰہا! میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے اور اُسے میرے امر میں شریک کر دے۔ جبکہ سرکارؐ نے فرمایا ہے: "علیؑ! تم کو مجھ سے وہی منزلت ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰؑ سے تھی بلکہ

قرآن میں بھی کچھ آیات اس امر پر روشنی ڈال رہی ہیں، مثلاً:

"وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ".

اے رسولؐ! کیا ہم نے تیرا بوجھ بٹا نہیں دیا؟

اس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ تمہارا بوجھ بٹا کر ختم کر دیا۔ تو پھر وہ بوجھ کون اُٹھائے گا؟ اب وہ تبلیغ کا بوجھ اُٹھا کر کون تبلیغ کرے گا؟ تو کیا کوئی اور نبی آئے گا؟ کوئی اور مبلغ آئے گا؟ بوجھ بٹانے کے معنی یہی ہیں کہ کچھ تم پر رکھا اور کچھ بانٹ دیا۔ اس انداز میں کہ تمہارے گھر والے ہیں، کچھ یہ اُٹھائیں گے اور کچھ وہ اُٹھائیں گے۔ یہ سب مل کر تبلیغِ رسالت کریں اور سب مل کر اس بار کو برداشت کریں۔

کیا کہنا اس گھرانے کا جس کا بار، بارِ رسالت ہو اور جس کا کار، کارِ رسالت ہو! رسالت ہی اس گھرانے کا کاروبار ہو، بارِ رسالت کو اس طرح سے اُن کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریکِ کارِ رسالت ہو گئے اور جب شریکِ کار ہو گئے تو اجرِ رسالت کے اہل ہو گئے۔

صاف پتہ چلتا ہے کہ لوگوں نے رسالت مآبؐ سے کہا: "جو اجرِ رسالت آپ فرمائیں، ہم ادا کر دیں"۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے اور انبیاء کے بارے میں بھی تذکرہ ہے۔ مگر جب کسی نبی کی اُمت نے نبی کو اجرِ رسالت کی طرف متوجہ کیا ہے تو قرآن کہتا ہے کہ ہر نبی نے جواب دیا:

"مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ".

"میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو اللہ پر ہے"۔

اب اگر ہمارے رسول کچھ کہتے تو کیا کہتے؟ آپؐ سے کہلوانا چاہ رہے ہیں

کہلوانے والے۔ مگر آپ کا موقف یہ ہے کہ بغیر خدا کے کہے، میں کچھ نہ کہوں گا۔ آیت آتی ہے:

"قُل لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی".

مجھے کہنے دیجئے کہ آیت اس مقام تک ادھوری رہی۔ ہر نبی نے یہی تو کہا کہ "لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا" کوئی نہیں کہہ سکا تھا۔

معلوم ہوا کہ آیت کا دُوسرا حصہ چھپا ہوا تھا اور وہ دُوسرا حصہ، حصہ محفوظ کی طرح رکھ لیا گیا تھا۔ حصہ کسی سابقہ نبی کی زبان پر آ ہی نہ سکا اور ہر ایک سابقہ نبی کو یہی کہتے بن پڑی: "میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا"۔

اگر کوئی نبی رسولؐ اللہ کی تشریف آوری سے قبل چاہ سکتا تو ہمارے رسول بھی چاہ سکتے تھے۔ اب اس منزل پر جب خدا چاہتا ہے تو یہ کیسے نہ چاہیں؟ سابقہ نبیوں کا نہ چاہنا اسی بناء پر تھا کہ امتنانِ حکم جاری ہوا تھا۔ اس مقام پر کچھ کہوں تو یہی کہوں گا کہ اگر وہ چاہتے تو نبی نہ رہتے اور اگر ہمارے نبی نہ چاہتے تو یہ نبی نہ رہتے۔ اب جب یہ کہیں "قُل لَّآ اَسْئَلُکُمْ" تو کیا نہ کہیں گے؟ "اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی"، کیونکہ اب خدا کی طرف سے اجر رسالت کے طور پر قربٰی کی محبت مانگنے کا حکم ہو رہا ہے۔

لہٰذا جب خدا کا حکم نافذ ہو جائے تو پیغمبرِ خدا حکم بجا لانے میں کوتاہی کیسے کریں؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منشائے الٰہی یہی تھا مگر سابقہ انبیاء کو نہیں کہا کہ مانگو۔ تو جو سابقہ انبیاء کو حکم ہوا، اُس کی تعمیل اُنہوں نے کی اور جو ہمارے رسول کو حکم ہوا، اُس کی تعمیل ختمی مرتبتؐ نے کی۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اُن کے بارے میں کیوں نہ کہا اور

ہمارے رسول کو کیوں کہا؟ تو جواب یہ آئے گا کہ سابقہ انبیاء کی نبوت اثنائے مراحل میں تھی۔ ایک نبی جاتا تھا اور دوسرے کو آنے کی خبر دے کر جاتا تھا۔ دوسرے کیلئے عالم کو منتظر بنا کر جاتا تھا۔ ایک کے بعد جب تک ایک آنے والا تھا، سلسلہ چل رہا تھا، سلسلہ جاری تھا۔ انہوں نے اجر نہ مانگا، کام ابھی تکمیل تک نہ پہنچا تھا۔ تبلیغ منزلِ تکمیل تک نہ پہنچی تھی۔ اگر وہ مانگ لیں تو قبل از وقت مانگ لیں۔

حضرات! ہمارے نبی یہ کہتے ہوئے کہ "لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ"، "میرے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں"۔

لیکن ہمارے رسول آخری نبیؐ ہیں۔ سابقہ نبیوں نے نہ مانگا، اس اعتماد پر کہ ان کے بعد بھی تو آئیں گے۔ جب کوئی سابقہ نبی جاتا تھا، سمجھ کر جاتا تھا کہ اس کے بعد بھی کوئی نبی آئے گا۔ مگر ہمارے نبی جب تشریف لائے تو اس علم کے ساتھ کہ انؐ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔ اب اگر وہ بھی نہ مانگیں تو پھر کون مانگے گا؟

میں بعض اوقات کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ ختم نبوت کے دلائل پیش کیا کرتے ہیں، وہ اس آیت کو دلیل بنا کر کیوں پیش نہیں کرتے؟ کیونکہ اس آیت میں طلب اجر رسالت خود ختم نبوت کی دلیل ہے۔ جب تک نبوت ختم نہ ہوئی تھی، کوئی اجر رسالت نہ مانگ سکا۔ مانگا اس وقت جاتا ہے جب کام اختتام پر ہو۔ اس لئے ختم نبوت پر ہی اجر نبوت و رسالت مانگا گیا ہے۔

لہٰذا حضرات! جب آپ اتنا سمجھ چکے ہیں تو آپ کی روح میں یہ چیز ضرور جذب ہو کر رہے گی کہ آخری نبی کی حیثیت سے جب اجر مانگا جائے تو وہ ایک تبلیغ کا اجر نہ ہوگا، وہ ایک نبی کی نبوت کا اجر نہ ہوگا۔ وہ اجر تبلیغ بنی آدم سے لے کر تبلیغ ختمی

مرتبت تک کا ہوگا۔ یہ کلِ نبوت ورسالت کا اجر ہے۔ ناموں سے غرض نہیں ہے، ڈیوٹی سے بحث نہیں ہے، یہ اصل میں سلسلہ نبوت کا اجر ہے۔

یہاں آپ کے ذہنوں میں بھی ایک چیز پیدا ہونا چاہئے کہ بہرحال آلِ محمدؐ اور سابقہ انبیاء کے شرف میں فرق ہے کہ آلِ محمد کی محبت کو خدا نے کلِ نبوت کی تبلیغ کا اجر قرار دے دیا ہے۔ میں نے کسی مجلس میں اس سے پہلے بھی اشارہ کیا تھا اور آج بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ تفصیل سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے کہ بار الہا! تیری عجب شان ہے کہ ہر اہلِ زمانہ کے سامنے تو نے ایک ایک معیارِ امتحان رکھا تھا۔ کتنا ہی ہلکا ہو مگر انجام کے اعتبار سے وہ معیار اتنا بھاری کہ صرف صحیح شخص ہی معیار پر پورا اُتر سکے اور کوئی دُوسرا اس معیار کی تکمیل کر ہی نہ سکے۔

ایک وہ بزم تھی جس میں پروردگار نے ایک سجدے کو معیار بنا دیا اور سجدہ کرنے والے آدم کے شرف کو نہیں بڑھا سکے۔ آدم کی سرحد میں داخل نہیں ہو سکے اور آدم کے درجہ سے نہیں بڑھ سکتے۔ میرے اور آپ کے عمل سے نبی کا شرف بڑھتا ہو، یہ اُس نبی میں نقص ہوگا کہ جب چاہیں بڑھا دیں اور جب چاہیں کم کر دیں۔ ہم لاکھ اُن پر درود بھیجیں، یہ اُن کے درجہ کو بڑھا نہیں دیں گے اور اگر کروڑ دفعہ رسول کی تنقیص مرتبت کے الفاظ استعمال کریں تو اس سے اُن کی شان میں بالکل کوئی کمی واقع نہ ہو گی۔ یہ بھی تو سوچئے کہ جس کا خدا محبّ ہو، وہ غیر محبّ کا محتاج رہے گا؟ جس کو خدا نے مان لیا ہو، کیا وہ کسی غیر کے ماننے کا حاجت مند رہے گا؟ جب سب چیزیں غنی کی طرف سے ہیں، نبی خود غنی ہو گیا تو پھر کسی دُوسرے کے ماننے کا محتاج نہ رہا۔

تو غرض یہ کہ سجدہ معیارِ امتحان بنا کر رکھ دیا اور اُس نے اپنے علم کے

بھروسے پر رکھا۔ جانتا تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر سجدہ نہیں کرے گا۔

حضرات! کمزوریاں نفوس میں عجیب عجیب قسم کی ہوتی ہیں۔ کوئی کسی معاملہ میں کمزور ہے، کوئی کسی امر میں کمزور ہے۔ یہ انسانوں وغیرہ میں سبب تفاوت ہوتے ہیں اور خداوند عالم جانتا تھا کہ شیطان اس معاملہ میں (سجدہ کرنے میں) کمزور ہے، وہ آدم کو سجدہ کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

چنانچہ وہ ایسا کمزور نکلا کہ وہ سجدہ اُس کیلئے پہاڑ ہو گیا۔ سجدہ اُس کیلئے ناممکن ہو گیا اور اُس نے طے کر لیا کہ سب کچھ ہونا منظور مگر میں آدم کو سجدہ تو نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حکم بلا وسیلہ تھا، کسی کی معرفت کے بغیر تھا۔ خدا خود حکم دے رہا تھا، راوی درمیان میں نہ تھا کہ خیال کمی وبیشی یا خبر کے باوثوق ومعتبر یا غیر معتبر ہونے کا سوال پیدا ہو۔ آوازِ قدرت خود ہی سن رہا ہے، بغیر کسی واسطے کے یا فاصلے کے، مگر فیصلہ یہی کیا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔

اُسے سجدہ کرنا کیا مشکل تھا کہ سجدے کا خوگر تھا۔ جس کا رات دن ہی سجدہ تھا، جس کا روزمرہ تھا۔ سجدوں میں اُس کی عمر ہی گزری تھی۔ مگر خدا جانتا تھا کہ جسے میں سجدہ کرواؤں، اُسے یہ ہرگز سجدہ کرنے والا نہیں۔ یہیں سے پتہ چل گیا کہ تعمیل کرنے والا کون ہے! کتنا آسان تھا! سجدے کے لفظ بتاتے ہیں کہ کتنا آسان معیارِ امتحان تھا۔ جانا نہیں ہے، کچھ دینا نہیں ہے، کسی خطرہ میں نہیں پڑنا، سجدہ کرنا ہے اور اُس نے کرنا ہے جو کرتا ہی رہتا ہے۔ سجدہ کرنے والے کیلئے کیا نئی بات تھی؟

بہرحال یہ شیطان کی مستقل کمزوری تھی کہ وہ خدا کے سوا کسی کو خدا کے حکم کے بعد بھی سجدہ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کے ناخلف فرزند کیلئے

معیارِ امتحان کشتی میں سوار ہونے کا قرار دے دیا۔ وہ بھی جو انسان کے امکان میں اور مصیبت امتحان بھی ہو۔ پانی بڑھتا چلا جا رہا ہو، زمین سے پانی اُبل رہا ہو اور آسمان سے بھی بارش برس رہی ہے اور پانی اتنا بڑھا ہے کہ پہاڑ ڈوبتے چلے جا رہے ہیں۔ بارشوں کا تو کیا ذکر؟ ایسی حالت میں کیا مشکل تھا کہ نوحؑ کو مان کر کشتی میں بیٹھ جائے مگر ڈوبنا منظور، تباہ ہونا منظور، نوحؑ کو ماننا نہیں، کشتی میں نہیں بیٹھنا۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سارے امتحان ہوئے اور معیارِ امتحان ہر زمانہ میں قائم ہوتے رہے تو آخری نبیؐ کے زمانہ میں ایسا معیارِ امتحان نہ آئے جو قیامت تک باقی رہے۔ نام کے معیار سے وہ امتحان کتنا کم ہی کیوں نہ ہو، مگر خدا کے علم کے اعتبار سے یہ امتحان دشوار ہو کہ جو مومن ہو، وہ پورا اُترے اور جو مومن نہ ہو، وہ اُسے اختیار ہی نہ کر سکے۔ بے شک معیارِ استقامت میدانِ جہاد میں بڑا زبردست معیار ہے مگر جہاد ہر زمانہ میں نہیں ہوتا، ہر وقت نہیں ہوتا، ہر صدی میں نہیں ہوتا۔ تو پھر کیا ہمارے لئے معیارِ امتحان ہی نہ رہے؟ ہم رہیں اور معیارِ امتحان نہ رہے۔

یہ ضروری تھا کہ قیامت تک کے زمانہ کیلئے اُدھر سے ایسا معیار آئے کہ قیامت تک صحیح اور غلط کا پتہ چلتا رہے اور وہ معیارِ امتحان کیا ہے؟ محبتِ اہل بیتؑ!

آپ کہیں گے کہ یہ کونسی مشکل بات ہے یا معیار ہے؟ یہ تو کوئی خاص معیار نہیں۔ میں کہوں گا کہ یہ مشکل معیار ہے۔ مشکل کا آپ کو کیا پتہ؟ سجدہ کرنا کونسا مشکل تھا اور ڈوب جانے والوں کیلئے کشتی میں بیٹھ جانا کونسا مشکل امر تھا؟ ارے کشتی میں بیٹھنا مشکل تھا یا کشتی میں نہ بیٹھنا؟ آپ کہیں گے کہ یہ کونسی بڑی بات ہے؟ یہ ایسی مشکل بات ہے کہ نماز پڑھ سکا، روزہ رکھ سکا، تلاوتِ قرآن کر سکا، نوافل پڑھ سکا، حج

کرسکا، سب کچھ کرسکا مگر اہل بیتؑ کی محبت اختیار نہ کرسکا۔ سب کچھ کرے گا مگر یہ نہ ہوسکا کہ محبِ اہل بیتؑ بن سکے۔ حالانکہ اہل بیت کی محبت سبب خیر ہے، سبب ہدایت ہے۔ یہ اُن کی محبت ہوتی جو دینے والے ہیں، نہ لینے والے۔ یہ محبت اُن کی ہوتی جن پر صدقہ حرام تھا، جن کو کسی کا دست نگر نہیں بنایا بلکہ اُن کو حلال مشکلات بنایا۔ جن سے عقدے حل ہوتے رہے، حاجتیں روا ہوتی رہیں۔ ایسوں سے محبت کوئی مشکل بات تھی؟ ایسے افراد تو ہر لحاظ سے محبت کے لائق ہیں کیونکہ وہ مرکزِ صفاتِ الٰہیہ ہیں۔

میں تو کہتا ہوں کہ خدا حکم دیتا یا نہ دیتا، یہ محبت کے لائق تھے۔ اگر خدا ان کی محبت نہ بھی واجب کرتا، پھر بھی اُن کی محبت واجب تھی۔ یہ بات یاد رہے کہ اُن کی محبت کا وجوب محتاجِ حکم نہیں تھا۔

کوئی کہے کہ اولادِ رسولؐ سے محبت کے متعلق کوئی آیت تو قرآن میں نہیں ہے! موئے مبارک کی محبت کیلئے قرآن میں کوئی آیت تو نہیں ہے! اس کا جواب یہ ہوگا کہ محبت مبنی بر حکم نہیں ہے۔ جب رسولِ خدا کی محبت فرض واجب ہے تو جتنی چیزیں رسولؐ سے منسوب ہوں، اُن کا احترام واجب ہے اور عصائے رسولؐ اور موئے رسولؐ کا احترام بھی واجب ہے۔

آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہر چیز کیلئے الگ الگ حکم آئے۔ اس بناء پر اگر میں نے کہا تو کیا بے جا کہا کہ اگر موئے مبارک کیلئے الگ حکم نہ آیا ہو، روضۂ انور کیلئے اور اُس کے احترام کیلئے کوئی حکم نہیں آیا۔ جس طرح عصائے پیغمبر کیلئے الگ کوئی حکم نہیں آیا، اسی طرح اقربائے پیغمبرؐ کے متعلق اگر کوئی حکم نہ بھی آتا، پھر بھی اُن کی محبت فرض ہوتی۔ جب حکم آگیا تو فرض نہ رہی، ایمان بن گئی۔

حضرات! یہ جملہ میں نے کیوں کہا ہے؟ ایمان اور فرض میں فرق ہے۔ بہترین فرض نماز ہے لیکن نماز کس وقت؟ بس جب وقت کا سوال آیا، وقت کا تعین ہے، ہر وقت نہیں ہے۔ اس وقت بھی کوئی نماز ہے آپ پر؟ حالانکہ غرض اصل ہے عبادت اور افضل عبادات نماز ہے مگر جب صبح کی نماز پڑھ چکے، ظہر کی نماز سے پہلے کوئی نماز آپ پر ہے؟ جب ظہر وعصر کی نماز پڑھ چکے تو مغرب تک آپ کے اوپر کوئی نماز فرض ہے؟ نماز مغرب وعشاء پڑھ چکے تو ساری رات آپ پر کوئی نماز فرض ہے؟

حضرات! فرض وہ ہے جو کسی وقت فرض ہو اور کسی وقت فرض نہ ہو۔ ذہن میں اس چیز کو رکھئے گا۔ روزہ فرض، کیا شعبان کے ماہ کے روزے بھی فرض ہیں؟ بارہ مہینوں میں ایک مہینہ فرض ہیں اور ایک مہینے کے بھی دن کو فرض ہیں اور وہ بھی اگر بیمار ہو تو اُس پر نہیں۔ مسافر پر نہیں۔ گیارہ مہینے فرض نہیں۔ تو ایک وقت میں فرض ہوتے ہیں اور ایک وقت فرض نہیں ہوتے۔ یعنی فرض ہونے کے وقت کم سے کم ہیں اور جن اوقات میں فرض نہیں ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ ہیں۔ عمر بھر میں حج ایک مرتبہ فرض ہے، باقی ساری عمر خالی ہے۔ گیارہ مہینے روزے سے خالی ہیں، بارہویں کا بھی آدھا خالی ہے (رات کا) اور اگر بیمار ہو گئے تو فریضہ اور بھی کم ہو گیا۔

لہٰذا پتہ چلا کہ جو کسی وقت فرض ہو اور کسی وقت فرض نہ ہو، وہ فرض ہے اور ایمان کیا ہے؟ ایمان وہ چیز نہیں جو اس وقت ہو اور اُس وقت نہ ہو۔ ایمان کیلئے وقت کی پابندی نہیں ہے۔ خدا کو خدا ماننا، رسولؐ کو رسولؐ برحق ماننا اور آئمہؑ کی امامت کو ماننا، عادل کی عدالت کو ماننا، یہ ماننا آپ پر کس وقت فرض ہے؟ وقت کا سوال ہی نہیں۔ یہ کہنا چاہیے کہ کس وقت فرض نہیں ہے؟ وہ وقت کونسا ہے کہ وقت ہو اور فرض نہ ہو؟

فرض اور ایمان میں ایک اور فرق ہے۔ فرض بیماریوں میں ساقط ہو جاتا ہے مگر ایمان ساقط نہیں ہوتا بلکہ جتنی بیماری بڑھے، اُتنا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے کیونکہ امکان ہے کہ بیماری موت کا سبب بن جائے۔ اس لئے بیماریوں میں ایمان کو مستحکم کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ اسبابِ موت میں ایک سبب تو ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے۔ غرضیکہ فرض وہ چیز ہے جس کا کوئی بدل ہو۔ وضو نہ کر سکو تو تیمم کر لو۔

اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر خدا کو نہ مان سکو تو کوئی بدل ہے کہ خدا کی بجائے اُس کو مان لو؟ رسولؐ کو نہ مان سکو، کسی غیر رسول کو مان لو۔ نہیں! ان معاملات میں کوئی بدل نہیں ہے۔ وہ بوڑھے آدمی جو روزہ نہیں رکھ سکتے، اُن کو اجازت ہے کہ ایک مُد طعام بدل کے طور پر دے دیں۔ معلوم ہوا کہ روزے کا بدل ہے۔ روزے کا سقوط، روزے کی تخفیف ہو سکتی ہے۔ نماز میں بھی قصر ہے یا نہیں؟ پوری بھی آدھی ہو جاتی ہے۔

اب اُلوہیت میں بھی قصر ہے؟ رسالت میں بھی قصر ہے؟ بارہ اماموں کی بجائے چھ کو مان لو، اس میں بھی قصر ہے؟ لہٰذا ایمان اور فرض میں کتنے فرق ہو گئے۔ جو کسی وقت فرض ہو اور کسی وقت فرض نہ ہو، وہ فرض ہے اور جو ہر وقت فرض ہو، وہ ایمان ہے۔ اسی بناء پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حبِ آلِ محمدؐ کو فرض نہیں کہا بلکہ آپؐ نے فرمایا:

"حُبُّهُمْ اِيْمَانٌ وَبُغْضُهُمْ كُفْرٌ"۔

"اُن کی محبت ایمان ہے اور اُن سے بغض کفر"۔

اہلِ نظر نے یہ تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا اجر اُن کی محبت کو قرار دیا مگر

اس پہلو پر شاید زمانہ نے نظر ہی نہیں ڈالی۔

اگر چہ اس آیت میں ''اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی'' نے نقشہ کھینچ دیا کہ منبر پر جلوہ افروز پیغمبرؐ ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ ''لَآ اَسْئَلُکُمْ''، پھر نبیؐ کے سامنے کوئی جماعت ہے جسے کہہ رہے ہیں۔ پیغمبرؐ ''لَآ اَسْئَلُکُمْ'' میں ''کُمْ'' کہہ کر خطاب کر رہے ہیں۔ تو پیغمبر کی نظر اس مجمع پر ہے اور فرما رہے ہیں:

''لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی''.

ایک نظر کے سامنے وہ ہیں جن کو پیغمبر کہہ رہے ہیں ''لَآ اَسْئَلُکُمْ'' اور ایک پیغمبر کی نظر کے سامنے وہ ہیں ''اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی''۔

اب اس سے صاف پتہ چلا کہ ''کُمْ'' کا خطاب قربیٰ سے نہیں اور قربیٰ کی معیت ''کُمْ'' والوں کیلئے نہیں ہے۔ وہ اور ہیں جن کو آیت پکار رہی ہے اور وہ اور ہیں جن کی محبت کا حکم آیت دے رہی ہے۔

اب سب سے پہلے اجر کا سوال ہے۔ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، عورتیں ہوں، حاضرین و غائبین ہوں، حاضرات ہوں، غائبات ہوں، قیامت تک آنے والے اور اُمت رسولؐ میں داخل ہونے والے سب سے خطاب ہے:

''لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی''.

میں سوال کر رہا ہوں اُن کی محبت کا اور اُن کے بارے میں اور کوئی سوال نہیں کر رہا۔ اس کے معنی یہ قرار پاگئے کہ کُل اُمت اجرِ رسالت کی ادائگی کی ذمہ دار ہے اور وہ اجر کیا ہے؟ اِنؑ کی محبت ہے۔

دیکھئے! نتیجہ نکل رہا ہے اور بڑی عجیب چیز ہے۔ سب سے اجر چاہا جا رہا ہے

اور وہ کیا ہے؟ اُن کی محبت! جب وہ اجر اِن کی محبت ہے اور جب "کُم" کا خطاب ساری اُمت کو ہے تو فوراً پتہ چلا کہ اقربائے پیغمبرؐ سے آیت نے اجر نہیں مانگا اور خدا نے پیغمبر کو حکم اقرباء سے محبت چاہنے کا نہیں دیا۔ اب سب اجر کے ذمہ دار ہیں، سوائے اہل بیتؑ کے۔ یہ بحث تو الگ رہا کہ جو اجر ہے، وہ کیا ہے؟ وہ بھی اُن کی محبت ہے مگر اس کے علاوہ جو چیز نکل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ سوالِ اجر کس سے نہیں ہے۔ اقرباء سے سوالِ اجر کا نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ شریکِ کار تھے۔ اس لئے اُن سے اجر کا مانگنا بالکل ایسا ہے جیسے موسیٰ اپنی تبلیغ کا اجر ہارون سے مانگیں۔ شریکِ امرِ نبوت ہیں، شریکِ کارِ رسالت ہیں۔

كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِىْ وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتَابِ.

خداوند عالم نے اُن کو رسالت کا گواہ قرار دیا ہے۔ جب یہ گواہ پیغمبرؐ کے ہیں تو اجر گواہ کو دیا جاتا ہے یا گواہ سے مانگا جاتا ہے۔ شاہدِ امرِ نبوت ہیں۔ شریکِ کارِ رسالت ہیں۔ ان سب کو مل کر کرنا ہے، جو کچھ کرنا ہے۔ ان کا مقام عجب ہے۔

حضرات! اگر میں ایک لفظ تمہ کلام میں کہہ دوں تو وہ لفظ کتنا مضبوط ہوگا۔ محبتِ اہل بیتؑ کا حکم رسولؐ کے واسطے سے اُمت تک پہنچ رہا ہے۔ جب پیغمبرؐ کے واسطے سے پہنچ رہا ہے، جیسا کہ نماز کا حکم پیغمبرؐ کے واسطے سے پہنچا، روزے کا حکم از خود تو نہیں آیا، نبیؐ کے واسطے سے آیا۔ نماز کا حکم نبیؐ پر آیا، انہوںؐ نے آپ تک پہنچایا۔ اگر کہیں نبیؐ نے نماز کا حکم تنہا پہنچا دیا ہوتا، خود پڑھے بغیر، تو عالم کو کہنے کا حق ہو جاتا کہ خود تو پڑھتے نہیں، ہمیں کہہ رہے ہیں۔ روزے کا حکم روزہ رکھے بغیر پہنچا دیا ہوتا تو مندرجہ ذیل آیت کی زد میں آجاتے:

"اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ".

"دُوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو"۔

"خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت"۔ کسی کا یہ فارسی جملہ ضرب المثل بن گیا ہے۔ نماز کا حکم نماز پڑھ کر پہنچایا۔ روزے کا حکم روزہ رکھ کر پہنچایا۔ ایفائے عہد کا حکم ایفائے عہد کر کے دیا۔

اب سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آیا حب اہل بیتؑ کا حکم اُن کو محبت کر کے پہنچایا؟ عرض کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر امر میں تبلیغ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ حکم کے مطابق پیغمبرؐ نے ایسا عمل کیا ہو کہ قیامت تک ایسا عمل ہو ہی نہ سکے۔ یعنی وہ نمونہ عمل اتنا بلند ہو کہ اب اُس کی برابری کوئی کر ہی نہ سکے۔ نماز پڑھنے والے پڑھیں گے مگر ایسی نماز کوئی نہیں پڑھ سکتا جیسی نماز پڑھ کر پیغمبرؐ نے دکھائی۔ روزہ رکھنے والے روزہ رکھیں گے مگر ایسا روزہ کوئی نہیں رکھ سکتا جیسا کہ رسولؐ نے رکھ کر دکھایا۔

رسولؐ خدا کا عمل قیامت تک ہر آنے والے کے عمل سے بہتر ہونا ضروری ہے۔ اللہ اکبر! عجب مقام ہے جس پر میں اس وقت ہوں۔ حب آلِ محمدؐ کا حکم خدا نے رسول سے دلوایا۔ اُمت تک رسول کی معرفت پہنچایا۔ اب ضروری ہے کہ اس محبت پر عمل کرنے کیلئے اُمت کے سامنے کوئی نمونہ عمل ہو کہ جس پر اُمت عمل کر سکے اور وہ نمونہ عمل کیلئے مددگار بن سکے۔ وہ نمونہ عمل اتنا بلند ہونا چاہئے کہ اب لاکھ محبت کرنے والے کریں مگر اس نمونہ عمل کی ہمسری نہ کر سکیں۔

لہٰذا وہ نمونہ عمل کس کا عمل ہے؟ پیغمبرؐ کا عمل ہے۔ اگر آپ نے اہل بیتؑ کی محبت کا حکم دیا تو موصوف حضرات سے محبت کر کے دکھائی۔

خدا کی قسم! اب ایسی محبت کی مثال ہو ہی نہیں سکتی۔ لاکھ کوئی محبت کرے، اس محبت کی برابری نہیں کر سکتا جو محبت رسولؐ نے اپنے اہل بیتؑ سے کی ہے۔ اس محبت کا ذکر کون کر سکتا ہے؟ اس کیلئے کونسا انداز بیان اختیار کر سکتا ہے؟ وہ تو تمام نمازوں کی نماز، ان کی نماز اور تمام روزوں کا روزہ، ان کا روزہ، اور تمام محبتوں کی محبت، ان کی محبت۔ نمونۂ عمل دکھلایا۔ محبت کی مثال قائم کر دی۔

اب میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ حسینؑ نے کیسی محبت کی؟ حسینؑ و حسنؑ کا تو ذکر ہی کیا؟ اگر کسی بچے کو ساتھ کھیلتے دیکھ لیا تو پیغمبرؐ کا محبوب بن گیا۔

سرکارِ رسالتؐ تشریف لے جا رہے ہیں۔ مجمع آپؐ کے ساتھ ہے۔ راستہ میں آپؐ نے دیکھا کہ بچے کھیل رہے ہیں۔ گھر کا کوئی بچہ ان میں نہیں ہے۔ آپؐ نے ان میں سے ایک بچے کی طرف توجہ فرمائی۔ قریب پہنچے، گود میں اٹھا لیا۔ پیغمبرؐ خاک پر بیٹھ گئے اور اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے لگے۔ محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اصحاب متحیر ہیں۔ یہ بچہ اپنی قوم کا نہیں، قبیلہ کا نہیں، خاندان کا نہیں، وطن کا نہیں۔ یہ پیغمبرؐ کا انداز محبت آج اس سے ایسا کیوں ہے؟ مگر کون بتاتا؟ آخر انہوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا: "سرکارؐ! اس بچے سے آپ کی محبت کی وجہ کیا ہے؟"

آپؐ نے ارشاد فرمایا: "میں نے اس بچے کو اپنے حسینؑ کے ساتھ ایک دن کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ دیکھا تھا کہ بچہ کھیلتا جاتا ہے اور خاکِ قدمِ حسینؑ اٹھا کر اپنی آنکھوں سے ملتا ہے۔ جس بچے کی معرفت کا اس سن میں یہ عالم ہو کہ خاکِ قدم کو آنکھوں سے لگاتا ہو، اس کی جوانی کیسی ہوگی اور بڑھاپا کیسا ہوگا!!"

سرکارؐ وہ عالم فرماتے ہیں کہ جبرئیلؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ بچہ کربلا کے

واقعہ میں میرے حسینؑ کے انصار میں سے ہوگا۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء نے یہ افادہ کیا ہے کہ بچہ ہو نہ ہو، حبیبؓ ابن مظاہر ہے۔

حضرات! امامؑ کی قدر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ لشکر نہیں بلاتے، رسالے نہیں بلاتے۔ امامؑ کا خط جاتا ہے تو اس بوڑھے کے نام! بچپنے کے دوست کو طلب کرتے ہیں۔ خاص طور پر خط بھیجا اور قاصد کوفہ میں پہنچا۔ حبیبؓ کے دروازے کو کھٹکھٹایا کیونکہ دروازہ بند تھا۔ حبیبؓ نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا کہ دروازہ پر کون ہے؟ اُس نے آواز دی:

"اَنَا بَرِیْدُ الْحُسَیْنِ"

"میں آقا حسینؑ کا فرستادہ ہوں"۔

یہ سننا تھا کہ حبیبؓ نے بے چین ہو کر دروازہ کھولا۔ حبیبؓ کی قدر رسولؐ نے حسینؑ کی خاطر کی تھی۔ اب حبیبؓ قاصد کی قدر حسینؑ کی خاطر کرتے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ حبیبؓ کبھی قاصد کے ہاتھ چوم رہے ہیں اور کبھی سینے سے لگا رہے ہیں، کبھی اُس کی پیشانی چوم رہے ہیں۔

قاصد نے کہا کہ امامؑ نے یہ خط بھیجا ہے۔ حبیبؓ نے وہ خط لے کر سر پر رکھ لیا، سینے سے لگایا، آنکھوں سے مس کیا۔ خط جو کھول کر پڑھا تو اب امامؑ مصائب کے بادلوں میں گھرے ہوئے ہیں اور حبیب کو لکھ رہے ہیں کہ تم حق اہل بیتؑ کے بڑے عارف ہو۔ دیکھنا! آج اپنی جان سے بخل نہ کرنا۔

بس اس خط کا پڑھنا تھا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ حبیبؓ کے دل پر کیا گزر گئی! حبیبؓ کے دل کو قرار کیسے ممکن تھا؟ غلام کو بلایا اور فرمایا کہ میرے راہوار کو تیار کرو۔

یہاں نہیں، شہر کے فلاں مقام پر شہر کے باہر لے چلو۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں گا۔ وہاں میرا انتظار کرنا۔ غلام نے راہوار تیار کیا اور جو جگہ حبیبؓ نے بتائی تھی، وہاں جا کر کھڑا کر دیا اور انتظار کرنے لگا۔

کوفہ سے نکلنا اور امامؑ کی نصرت کیلئے نکلنا اور حبیبؓ کا نکلنا آسان نہیں تھا۔ عجب عجب راستے اختیار کیے۔ کوئی کچھ سمجھے، کوئی کچھ سمجھے۔ جدھر اُن کی زراعت تھی، اُدھر کا راستہ اختیار کیا۔ دیکھنے والے یہ سمجھے کہ اپنی زراعت کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ طولانی راستے جو اختیار کیے تو راہوار تک پہنچنے میں دیر لگی اور خدا جانے کتنی دیر لگی کہ غلام کھڑا کھڑا مایوس ہو گیا اور اُس نے گھوڑے کو مخاطب کر کے کہا کہ تھوڑی دیر اپنے آقا کا اور انتظار کرتا ہوں، اگر نہ آئیں تو نہ آئیں۔ میں تم پر سوار ہو کر نصرتِ امامؑ کیلئے جاؤں گا۔ بے زبان تھا، مگر جیسے ہی غلام نے منہ موڑ کر گھوڑے کو خطاب کیا، گھوڑے نے منہ اُٹھا لیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

یہ باتیں سنتے ہوئے اور یہ حالت گھوڑے کی دیکھ کر حبیب بھی پہنچ گئے اور پوچھا کہ تو کیا کہہ رہا تھا؟ اس وقت اُس نے بتایا کہ یہ کہہ رہا تھا اور اُسی وقت سے گھوڑا رو رہا ہے۔ بس تڑپ کر حبیبؓ نے کہا:

"اے میرے مظلوم امامؑ! سلام ہو آپؑ پر، کیسی مظلومیت چھا گئی ہے کہ یہ غلام بھی آپؑ پر جاں نثاری کی تمنا کر رہے ہیں۔ اے مولاؑ! میں آزاد ہو کر نہ پہنچوں؟"

یہ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور غلام سے کہا کہ جا! میں نے تجھے آزاد کیا۔ غالباً آزاد کر دینے کا سبب یہی تھا کہ جوشِ نصرتِ امامؑ جو دیکھا، اُس کے عمل کو قابلِ اطمینان سمجھا اور امامؑ کے لب ولہجہ میں کہا کہ جا! میں نے تجھے آزاد کیا۔

مگر غلام کہتا ہے کہ آقا! آج تک تو آپ نے مجھ سے خدمتیں لیں اور مجھے اپنے ساتھ رکھا اور جس وقت اپنے ساتھ رکھنے میں مجھے سعادت ابدی مل رہی ہو، اُس وقت آپ مجھے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔

حبیبؓ نے کہا کہ تو کیا چاہتا ہے؟ غلام نے کہا: جو آپ چاہتے ہیں اور جہاں آپ جانا چاہتے ہیں، وہیں میں بھی جانا چاہتا ہوں۔ جس طرح آپ اپنی جان اپنے امامؑ پر نثار کریں گے، میں بھی اپنی جان اپنے امامؑ پر نثار کروں گا۔ خدا کیلئے مجھے چھوڑیئے نہیں، ساتھ لے چلیے۔

غلام پیچھے پیچھے ہے، آقا آگے آگے ہے۔ وہ گھوڑے پر ہیں، یہ پا پیادہ ہے۔ عشق ومحبت کا راستہ ہے جو طے ہوتا جا رہا ہے اور قربت امامؑ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے حبیبؓ نے گھوڑے کی بلندی سے چوبِ خیمۂ امامؑ کو دیکھ لیا۔ رکاب سے پیر چھوٹنے لگے۔ غلام نے کہا کہ ابھی تو راستہ اچھا خاصا باقی ہے۔ آپ ابھی سے پا پیادہ ہوئے جاتے ہیں؟

حبیبؓ نے فرمایا کہ چوبِ خیمۂ امامؑ نظر آگئی ہے۔ اب بے ادبی ہے کہ میں گھوڑے پر سوار رہوں۔ دونوں پا پیادہ ہو گئے۔

اُدھر سے پیشوائی کا اہتمام ہوا۔ مختصر یہ کہ حبیبؓ اپنے محبوب امامؑ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ امامؑ بغلگیر ہوئے، متبسم ہوئے، شادمان ہوئے۔ امامؑ خوش ہوئے تو ہجومِ امامؑ بھی خوش ہوا۔ امامؑ مسکرائے تو سب ہی ہنسنے لگے۔ یہ خوشی کی آوازیں سنیں تو جنابِ زینبؑ نے فضہ کو بلایا اور فرمایا: فضہ! میرے بھائی کے انصار اس قت کیوں خوش ہو رہے ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ میرے بھائی کی مدد کیلئے کوئی فوج آگئی ہے۔ ذرا

باہر نکل کر حال تو معلوم کرو۔

فضہ گئیں اور پلٹ کر عرض کیا: شہزادی! فوج تو کوئی نہیں آئی، رسالہ تو کوئی نہیں آیا۔ آپ کے بھائی کے بچپنے کے دوست حبیبؓ ابن مظاہر آئے ہیں۔ اُنؓ کے آنے سے امامؑ اور اُنؑ کے انصار خوش ہیں۔

معظمہؑ نے یہ سن کر فرمایا:

"اِقْرَئْ مِنِّی السَّلَام"۔

اے فضہ! خیمہ سے باہر تو نکلو اور حبیب کو میرا سلام کہہ دو۔

فضہ گئیں اور پکار کر کہا: خوشا نصیب تمہارے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کی بڑی بیٹی اور رسولِ اکرمؐ کی نواسی زینبؑ کبریٰ نے تمہیں سلام کہلایا ہے۔

حبیبؓ نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ اپنے منہ پر طمانچے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ کہاں میں گناہگار، کہاں میں ذلیل وخوار؟ کہاں میں حبیبؓ اور کہاں زینبِ کبریٰ کا سلام! کہاں میں ذرۂ خاک اور کہاں دُخترِ سراجِ منیر کا سلام!!

دسویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"اِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً".

اے حبیبؐ! یاد کرو اُس وقت کو جبکہ تمہارے رب نے کہا ملائکہ سے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (بقرہ:30)

حقیقتاً مجھے انتہا کو پیش کرنا ہے مگر میں نے ابتداء سے آغاز کیا ہے۔ انتہا ہمیشہ اپنے آغاز سے مرتبط ہوتی ہے۔ خداوند عالم کا وہ ارشاد جس سے پہلے کوئی ارشاد ہمارے علم میں نہیں ہے۔ خداوند عالم کی وہ آواز جس آواز سے پہلے کوئی آواز ہماری اطلاع میں نہیں۔ وہ یہی آواز ہے:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً".

میرے حبیبؐ! یاد کرو اُس وقت کو جبکہ تمہارے رب نے کہا ملائکہ سے کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں اور خلیفہ قرار دے رہا ہوں۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ پرانے سے پرانا واقعہ قرآن ہمیشہ یہ کہہ کر بیان کرتا ہے کہ "رسولؐ! یاد کروؐ"۔

آپ جانتے ہیں کہ "یاد کرو" کے الفاظ وہیں کہے جا سکتے ہیں جہاں وہ چیز پہلے سے علم میں ہو۔ اگر رسولؐ اُس وقت نہ ہوتے اور یہ واقعہ آپؐ کے پیش نظر نہ ہوتا تو یاد دہانی کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ یہاں لفظ "اِذْ" کا آنا یا:

"اِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ".

میں حضرت ابراہیمؑ کے امتحانات کو یاد دلانا یہ صاف بتا رہا ہے کہ تاریخ عالم

کا ہر واقعہ وہ واقعہ ہے جو اس پیغمبر آخر کے سامنے ہوا۔

خداوند عالم کہہ رہا ہے اور ملائکہ سے کہہ رہا ہے، مگر کہنے والا اس مقام پر اپنے آپ کو اس آخری نبی کا رب قرار دے کر کہہ رہا ہے، فرشتوں سے کہا اور کس نے کہا؟ نہ یہ کہا کہ فرشتوں کے خدا نے کہا، نہ یہ کہا کہ آدم کے رب نے کہا بلکہ "اور اے حبیب! تیرے رب نے کہا"۔ اشارہ ملتا ہے کہ جو کچھ بھی کہا، تیری خاطر کہا۔ یہ تیری تربیت کا اہتمام تھا اور تیرے رب نے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ قرار دینے والا ہوں۔

یہ لفظ کہنے کو میرا دل چاہ رہا ہے کہ اگر خدا خود آ سکتا تو کیوں کسی کو خلیفہ قرار دیتا؟ اگر اپنے بندوں کے پیش نظر ہو سکتا تو کیوں کسی کو اپنا جانشین بناتا؟ عموماً جانشین وہاں ہوا کرتے ہیں جہاں جانے والا جا رہا ہو اور چاہتا ہو کہ میرے بعد یہ محفل سونی نہ رہے، میرا کلام معطل نہ رہے، میرے بعد بھی کوئی کارگزار رہے۔

لیکن خداوند عالم کی ذات تو وہ ذات ہی نہیں کہ جو آج ہو، کل نہ ہو۔ یہاں رہنے والا، یہاں قائم رہنے والا خلیفہ قرار دے رہا ہے۔ کیوں قرار دے رہا ہے؟ اُسے ہم سے کچھ کہنا ہے، اُسے ہم کو بتانا ہے، ہم کو راہ پر لگانا ہے۔ لیکن وہ ہم سے کہنے کیلئے نہیں آسکتا۔ جو آ جائے، وہ خدا نہیں۔ ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے۔ زبان نہیں رکھتا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے کلام نہیں رکھتا۔ پھر بات بندوں تک کیسے پہنچے؟ تو اگر اس کام کو وہ خود کر سکتا تو کیوں کسی کو خلیفہ قرار دیتا؟ کیونکہ خدائی شان اُن اُمور کے منافی ہے جن اُمور کو قائم کرنا ہے۔ اس لئے خداوند عالم چاہتا ہے کہ میں نہ سہی، میرا کوئی بدل ہو۔ جو مجھے کہنا ہے، وہ، وہ کہے۔ مسئلہ ہدایت میں جو مجھے کرنا ہے، وہ وہ کرے۔ جو انداز میری تبلیغ کا ہوتا، وہ اُس کی تبلیغ کا ہو۔ جو انداز

میرے وعظ کا ہوتا، وہ انداز اُس کے وعظ کا ہو۔ وہ میرا بدل قرار پائے۔ اُس کا کہنا میرا کہنا ہو۔ اُس کا قول میرا قول ہو اور اُس کا عمل میرا عمل ہو۔ وہ میرا قائم مقام ہو اور تاثیر کے اعتبار سے اور منزلت کے اعتبار سے وہ میرا بدل ہو۔

یہ لفظ میں بار بار اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مستخلف کا بدل اور خلف اُس کا خلیفہ ہوتا ہے۔ جب بدل ہوتا ہے تو کسی شے کی بدل وہی شے ہو سکتی ہے جو اُس سے ملتی جلتی ہو۔ کسی دوا کا بدل وہ دوا قرار پا سکتی ہے جو تاثیر کے اعتبار سے اُس سے مل رہی ہو۔ کسی غذا کا بدل وہی غذا قرار پا سکتی ہے جو اثر کے اعتبار سے اُس جیسی ہو۔

یقیناً خدا جیسا کوئی نہیں مگر خلیفۃ اللہ کو کارِ خدا انجام دینا ہے۔ لہٰذا خداوند عالم نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے:

"اِذَا نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ"۔

"اے میرے ملائکہ! جب میں اس جسم میں روح ڈال دوں تو تم فوراً اس کیلئے سجدہ میں گر پڑنا"۔

فوراً اسے سجدہ کرنا۔ روحِ آدم کو خداوند عالم اپنی روح کہہ کر یاد کر رہا ہے ورنہ حقیقتاً نہ اُس کی روح ہے اور نہ جسم۔ وہ تو مخلوق کی شان ہے۔ یہاں روح سے مراد روحِ ذاتِ خدا تو ہو نہیں سکتی مگر "رُوْحِيْ" کہہ کر یہ بتا دیا ہے کہ اس روح کو میں نے اپنے کمالات کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔

میں لفظِ قرآنی سے حقیقی فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ کسی کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جس میں اُس کی روح موجود ہو۔ اگر مستخلف روح والا ہے، تب تو حقیقتاً خلیفہ میں اُس کی روح ہو گی اور اگر خلیفہ بنانے والا بار وح نہیں ہے تو کم سے کم

اُس کا خلیفہ ایسا ہو کہ جس کو خلیفہ بنانے والا روح کہہ سکے۔

حضرات! یہاں ایک لطیف پیرایہ میرے ذہن میں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ذہنوں میں اسی طرح پہنچے۔

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً".

یہ خبری جملہ ہے۔ میں زمین میں ایک خلیفہ قرار دینے والا ہوں۔ اس جملہ خبریہ کے بعد جملہ انشائیہ آتا ہے:

"فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ".

"تم فوراً سجدہ میں گر پڑنا"۔

اب یہ خبریہ حکمیہ جملہ ہے۔ جسے اصطلاح میں انشائیہ کہا جاتا ہے۔ تو پہلا جملہ خبریہ ہے اور دوسرا جملہ انشائیہ ہے۔ میں آپ کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ پہلے تو خداوند عالم نے یہ بتایا کہ آنے والا کس حیثیت کو لے کر آرہا ہے! آنے والے کی حیثیت کیا ہے!

تو بتایا کہ اُس کی حیثیت یہ ہے کہ وہ میرا خلیفہ قرار پاکر آرہا ہے۔ میں اُسے خلیفہ قرار دے رہا ہوں۔ یہاں سے حیثیت کو واضح کیا اور اس کے بعد فرمایا کہ جب میری روح اُس کے جسم میں پہنچ جائے تو فوراً اُس کو سجدہ کرنا۔

یہاں دو چیزیں الگ الگ ملتی ہیں۔ پہلے جملہ آنے والے کی حیثیت کو ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ پہلے جملہ میں حکم نہیں ہے، محض خبر ہے۔ اُس کے بعد جب آنے والے حکم کیلئے بساط بچھادی گئی اور حیثیت کو واضح کردیا گیا، اُس حیثیت کو جس کی بناء پر سجدے کا حکم دیا جاتا تھا، اُس کے بعد سجدے کا حکم دیا۔

تو ایک تو اس پر نظر ڈالئے کہ ایک تو سبب ہے سجدے کے حکم کا اور ایک سبب ہے سجدہ کرنے والوں کیلئے سجدہ کرنے کا۔ اگر آپ نے نظر جما کر دیکھا تو غالباً ایک عجیب بات آپ کے سامنے ہوگی۔

خدا نے سجدہ کا حکم کس بناء پر دیا؟ ایک تو خدا کے حکم کی بناء ہے۔ بناء پہلے متعین کردی گئی:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً".

میں زمین میں خلیفہ قرار دے رہا ہوں۔

اب جو سجدہ کا حکم آنے والا ہے، وہ اس لئے کہ یہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اگر یہ خلیفۃ اللہ نہ ہوتا تو ملائکہ کو سجدہ کا حکم نہ دیا جاتا۔ سجدے کا سبب کیا ہے؟ ان کی خلافت، حاکم نے سجدہ کا حکم کیوں دیا؟ اس لئے کہ یہ خلیفہ ہے۔

اچھا! اب جن کو حکم دیا گیا، اُن پر تعمیل واجب ہوئی۔ اب وہ سجدہ کریں گے مگر اُن کے سجدہ کرنے کا سبب کیا ہے؟

جس طرح آپ نے دیکھا کہ خدا کے سجدہ کے حکم دینے کا سبب کیا ہے؟ (حکم دینے کا سبب وہ ہوگا جو ملائکہ کیلئے ہوگا)۔ خدا نے کیوں حکم دیا؟ اس لئے کہ وہ خلیفہ ہے۔ فرشتے نے کیوں سجدہ کیا؟ خدا نے کیوں حکم دیا؟ اس لئے کہ وہ خلیفہ ہے۔

ذرا میں عام سطح سے ذہنوں کو بلند کرنا چاہتا ہوں۔ آپ شاید یہ کہہ دیں کہ جس بناء پر خدا نے حکم دیا، اُسی بناء پر ملائکہ نے تعمیل کی۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ خدا نے سجدہ کا حکم اس لئے دیا کہ وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیوں کیا؟

اب یہ جواب: "اس لئے کہ خلیفہ ہے"، غلط ہے اور اس غلطی کا اظہار خود

آیت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ ملائکہ نے جب سجدہ کرلیا اور نہ کرنے والے نے نہ کیا تو کرنے والوں سے تو پوچھنا تھا ہی نہیں۔ یہ تو سوال ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ تم نے سجدہ کیوں کیا؟ مگر جس نے نہ کیا تھا، اُس سے پوچھا گیا تو یہ:

"مَامَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ اِذْاَمَرْتُکَ"۔

"تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جبکہ حکم تجھے میں نے دیا تھا"۔

یہاں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حکمِ سجدہ کی بناء ہے خلافت۔ مگر حکم کی تعمیل کی بناء امرِ الٰہی ہے۔

مفہوم ابھی تک غالباً زیادہ تر ذہنوں میں نہیں آیا ہوگا۔ مگر میں کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے ذہنوں میں یہ چیز جم جائے۔

کیوں نہ کیا سجدہ؟ (اب خدا یہ نہیں کہتا کہ جبکہ اُس کی روح کو میں نے اپنی روح کہا تھا، یہ نہیں کہتا کہ جبکہ میں نے اس کو اپنا خلیفہ قرار دیا تھا) جبکہ حکم تجھ کو میں نے دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکم کی تعمیل کا سبب (آدم کی) شخصیت نہیں ہونا چاہئے بلکہ خدا کا حکم ہونا چاہئے۔ یہی سبب ہے کہ دو جملے الگ الگ آئے۔ میں زمین میں خلیفہ قرار دے رہا ہوں۔ اب اگر خلافت سبب سجدہ ہو تو یہ چیز اپنی جگہ کافی تھی۔ 'خلیفہ قرار دینے والا ہوں'، یہ الگ کہا اور 'فوراً اُس کیلئے سجدہ میں گر پڑنا'، یہ حکم الگ دیا۔ اگر دوسرا حکم نہ ہوتا کہ فوراً سجدے میں گر پڑنا، تب تو ملائکہ پر سجدہ واجب نہ ہوتا۔

لہٰذا سجدہ واجب کب ہوا؟ جب خدا نے حکم دیا۔ یہاں سے ایک عجیب بات نکل رہی ہے۔ خداوند عالم ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اُس کا بندہ، خواہ فرشتہ ہو یا جن ہو یا انسان ہو، اُس کے (خدا کے) سوا کسی کی اطاعت کرے، اُس کے سوا کسی کی

فرمانبرداری کرے، اُس کے سوا کسی کا حکم مانے کیونکہ خدا حاکم ہے، پیدا کرنے والا وہ خدا ہے۔ اُن کی حیات اُس کے ہاتھ میں ہے، اُن کی موت اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وجود و عدم یہ سب کچھ اُس کے اختیار میں ہے۔ تو اُس کا بندہ غیر کا مطیع کیوں ہو؟ اُس کے سوا کسی اور کی اطاعت کیوں کرے؟ دُوسرے کو اطاعت کروانے کا حق اُس وقت ہوگا جبکہ خدا حکم دے کہ اُس کی اطاعت کرو۔ اگر کوئی اُس کے حکم کے بغیر اطاعت کرے، خواہ وہ خلیفہ ہو، رسول ہو، نبی ہو، امام ہو، تو یہ اطاعت اُس کی ہوئی، خدا کی نہ ہوئی۔ لیکن اگر پروردگار نے کسی کی اطاعت کا حکم دیا تو پھر یہ اطاعت اُس کی نہ ہوئی بلکہ خدا کی اطاعت ہوئی۔

کوئی طاقت ہے جو اس کی تردید کر سکے؟ خداوند عالم یہ چاہتا ہے کہ اطاعت خالصتاً اُس کی ہوتی رہے۔ اگر کوئی کسی کے سامنے جھکے تو اُس خدا کے حکم کے بغیر نہیں۔ کسی کی فرمانبرداری کرے تو اُس کے حکم کے بغیر نہیں۔ اگر کسی کو ماننے کا سوال پیدا ہو تو اُس کے حکم کے بغیر نہیں مان سکتا۔ اُن کو ماننا چاہیے جن کیلئے خدا کا حکم ہو۔ دُنیا چاہے کہتی پھرے کہ اُس امام کے فرمانبردار ہیں، مگر اُس کے فرمانبردار تو جب ہوتے جب خدا نے حکم دیا ہوتا۔ خدا جس کے سامنے جھکا دے، جھک جاؤ۔

اب یہ جھکنے والا کسی اور کے سامنے جھکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے حکم دیا:

"اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ".

"اللہ کی اطاعت کرو اور اُس رسول کی"۔

جب رسول کی اطاعت کا حکم خدا دے تو یہ اطاعت کس کی ہوگی؟ ظاہر میں رسول کی لیکن رسول کی اطاعت جب ہوتی جب اُس نے کہا ہوتا۔ پروردگار کے حکم پر

اطاعت رسول کی اطاعت نہیں بلکہ اطاعتِ خدا ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم خدا نے دیا تو اب اولی الامر کی اطاعت اُس کی اطاعت نہیں بلکہ اطاعت خدا ہے۔

میں اکثر یہ جملہ کہا کرتا ہوں کہ آلِ محمد صلوات اللہ علیہم والسلام کا منصب و جلالت واقتدار موجودہ حالت سے ہزار گنا زیادہ ہوتا لیکن خدا ہم سے نہ کہتا کہ مانو تو کیا ہم پھر بھی مانتے؟ کسی کو اُس کے مرتبہ کی بناء پر نہیں مانا جاتا، صاحب کا مرتبہ اُس کیلئے ہے۔ دُنیا ہم سے بیکار پوچھتی ہے کہ فلاں بڑا عالی مرتبہ تھا، آپ نے مانا یا نہیں؟ فلاں انسان بڑی روحانیت کا مالک تھا، آپ مانتے ہیں یا نہیں؟

جنابِ والا! بہتر سے بہتر ہے تو اپنے لئے اور بد سے بدتر ہو تو اپنے لئے۔ ماننے کا اصول یہ ہے کہ خدا منوائے تو مانیں۔ اطاعت کا حکم خدا دے تو اطاعت کریں تاکہ یہ اطاعتِ غیر نہ ہو، خالص اطاعتِ خدا ہو۔

آپ یہ اندازہ لگائیں کہ سجدہ کرنے والوں نے بہر حال نیت ہی سے سجدہ کیا کیونکہ یہ طے ہے کہ نیت کے بغیر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر کام کرنے والا جانتا ہے کہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے اور اُس کے ذہن میں اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔

خداوند عالم کا سجدے کا حکم نیت کے ساتھ ہوا یعنی یہ حکم اُس نے ارادۃً دیا۔ ارادہ ہی نیت ہے۔ سجدہ کرنے والوں نے ارادۃً سجدہ کیا۔ لہٰذا نیت لازمی ہے۔ اب نیت میں کیا چیز ہوگی؟ یہ نہیں ہو سکتی کہ چونکہ خلیفہ ہے۔ اگر یہ نیت ہو چکی ہوتی تو ہر آنے والے خلیفہ کیلئے سجدہ ہوتا۔

وجہ کیا ہے کہ آدمؑ کیلئے ملائکہ ساجد ہیں، نوحؑ کیلئے نہیں، ابراہیمؑ کیلئے نہیں، کسی اور نبی کیلئے نہیں؟ تو اگر سجدہ کا سبب خلافت تھی تو جب سبب ہر جگہ موجود تھا تو

مسبب کیوں نہیں ہے؟ پھر وہ سجدہ کیوں نہیں ہے؟ لہٰذا طے شدہ امر ہے کہ سجدہ کرنے والوں کیلئے سبب خلافت نہیں ہے بلکہ امرِ الٰہی ہے، جہاں جو حکم ہو۔

لہٰذا سجدہ کرنے والوں نے یقیناً یہ سوچ کر سجدہ کیا کہ چونکہ خدا کا حکم ہے، اس لئے کر رہے ہیں۔ اب خلافت کی بحث نہیں رہی، خدا کے حکم کی بناء پر سجدہ ہوا۔ خدا نے اپنی اطاعت، اطاعتِ رسول اور اولی الامر کا حکم دیا۔ ہم خدا کے حکم کی تعمیل میں اطاعتِ پروردگار، اطاعتِ رسول اور اطاعتِ اولی الامر کر رہے ہیں۔

آپ کو علم ہے کہ میرے اور آپ کے مولا امیر المومنین علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کیا غیر اللہ کو بھی سجدہ جائز ہے؟ (یعنی اللہ کے سوا کسی اور کو بھی سجدہ کرنا یا کروانا جائز ہے؟)

یہ ہمارے لئے بنائے توحید ہے اور اس میں ہمیں فخر و ناز ہے۔ سائل نے اس پر داغ پیدا کرنے کیلئے یہ سوال کیا کہ آیا غیر خدا کیلئے بھی سجدہ جائز ہے؟

امامؑ نے مسکرا کر فرمایا کہ جو سجدہ خدا کے حکم سے ہو، وہ غیر کو نہیں، خدا کو ہے۔ یہاں سے ایک بات اور کہتا چلوں کہ:

"رُبَّ مَشْهُوْرٍ لَا اَصْلَ لَهٗ".

بہت سی مشہور باتیں انتہائی مشہور ہوتی ہیں مگر اُن کی اصلیت کچھ نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں مجھے آپ سے کہنا ہے کہ چلتے پھرتے کوئی آپ سے پوچھے کہ شیطان کیوں راندۂ درگاہ قرار پا گیا تو آپ کا جواب یہی ہوگا کہ سجدہ نہ کرنے سے۔ سامنے کا جواب ہے، مشہور ہے:

اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اگر سجدہ نہ کرنے سے کوئی شیطان بن جائے تو ذرا اس پر بھی نگاہ ڈالئے کہ زیادہ سے زیادہ وہ سجدہ فرض ہی تو تھا یا فرض اور واجب ہی تو تھا۔ اُس نے سجدہ نہ کیا تو وہ کافر اور میں نے نہ کیا تو میں مسلمان!

تو کیا اُس کا خدا کوئی اور ہے اور میرا خدا کوئی اور ہے؟ اُس کیلئے قانون کچھ اور ہے اور میرے لئے قانونِ قدرت کچھ اور ہے؟

یہ غلط ہے کیونکہ جب اُس نے سجدہ نہ کیا تو نہ ترکِ سجدہ پر خدا نے اُسے وہاں سے نکالا تھا اور نہ طوقِ لعنت اُس کی گردن میں ڈالا تھا۔ نہ اُسے رجیم کہا اور نہ اُسے لعین کہا۔ اُس نے سجدہ تو نہیں کیا، یہ تو ظاہر ہے مگر اُس کے بعد کوئی تعزیری حکم نافذ نہیں ہوا۔ کوئی تعزیری پہلو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ اِدھر اُس نے سجدہ نہ کیا اور اُدھر خداوند عالم نے اُس سے سوال کیا جس کو میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔

اُس سے سوال کیا جا رہا ہے کہ جب میں نے تجھے حکم دیا تھا تو تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ جس کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ خداوند عالم موقعہ دے رہا ہے۔ سجدہ کرنے کا نہیں بلکہ سنبھل جانے کا۔ میں نے حکم دیا تھا، سجدہ کیوں نہ کیا؟ حکم کی تعمیل میں سجدہ نہ کرنے کی وجہ بتا۔

اب وجہ بتانا اُس کا کام ہے۔ چاہے سنبھل کر وجہ بتادے، ہوش مند ہو کر وجہ بتادے، چاہے بیہوش ہو کر بتائے۔ بہر حال اگر سنبھلنا چاہے تو سنبھل سکتا ہے اور میرا عقیدہ ہے اور یقین ہے کہ اگر وہ جواب میں کہہ دیتا کہ غلطی ہوئی تو پھر کیا مردود ہوتا اور کیا ملعون ہوتا؟ خداوند عالم ارحم الراحمین ہے، غفور الرحیم ہے۔ اُس نے قیامت کی

"اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ".

"میں اس سے افضل و بہتر ہوں"۔

میں اس کو سجدہ کیوں کرتا جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟ بس اُس کا یہ کہنا تھا کہ میں اُس سے افضل ہوں، تو سجدے کی بات تو پیچھے رہ گئی کہ کیا تھا یا نہ کیا تھا۔ سجدہ نہ کرنے پر نکالا کس نے تھا؟ اگر سجدہ نہ کرنے پر وہ نکال دیا گیا ہوتا تو یہ سوال کیوں ہوتا کہ سجدہ کیوں نہ کیا؟ بلکہ اُسے موقعہ دیا گیا کہ جو عذر چاہے، پیش کر دے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ غلط بھی کہہ دیتا تو چونکہ فیصلہ ظاہر پر ہی ہوتا ہے، اُس وقت یہ غلط بات بھی مان لی جاتی۔ مگر اس نے یہ کہہ کر قیامت ڈھا دی کہ میں کیوں اُس کو سجدہ کرتا جس سے میں افضل ہوں۔

ذرا یہ لفظ لطافت سے غور کے لائق ہے۔ حضرات! یہ میری نگاہوں کا تجسس ہے۔ اُس نے تو ایک بار کہا کہ میں اس سے افضل ہوں۔ خداوند عالم نے اُس کے جواب میں مطلق نہیں کہا کہ تو جھوٹا ہے بلکہ وہ تجھ سے افضل ہے۔ "وہ تجھ سے افضل ہے"، قدرت نے یہ نہیں کہا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس لئے نہیں کہا کہ یہ کہنا بھی خلیفۃ اللہ کیلئے کہ "وہ تجھ سے افضل ہے"، اُس کی توہین تھی۔ میں جس سے افضل ہوں، اُس کو سجدہ کیوں کرتا؟ اس بات کا قدرت نے مطلقاً جواب نہیں دیا۔ اس بارے میں کوئی آیت قرآنی مجھے نظر نہیں آئی جس میں اس بات کی تردید کی گئی ہو یا کہا گیا ہو کہ تو غلط کہتا ہے۔ قدرت نے اس کا بالکل جواب دیا ہی نہیں۔ جیسے ہی اُس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں:

"قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا".

"نکل یہاں سے"۔

"فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ وَعَلَیْکَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنَ"۔

'نکل یہاں سے، تو رجیم ہے اور قیامت تک تجھ پر لعنت ہے اور پھٹکار ہے'

اب بتایئے کیوں نکالا؟ حضراتِ والا! یہ بات تو کچھ چھپانے کی ہو رہی ہے کہ سجدہ نہ کرنے پر نکالا۔ سجدہ نہ کرنے پر نہیں نکالا بلکہ خلیفۃ اللہ سے اپنے کو افضل کہنے پر نکالا۔ میں درمیان میں ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں اور وہ میرا جملہ نہیں ہے، میرے اور آپ کے آقا امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا ہے اور اتنا بصیرت افروز ہے کہ میرے اس بیان کو معراج پر پہنچا دینے والا ہے۔ کیا لطیف پیرایہ ہے اور کیا عجیب آپؑ کا فرمودہ ہے:

"جس جرم کے ارتکاب پر جنت میں رہتے ہوئے کو اللہ نے جنت سے نکال باہر کیا، کیا تم یہ توقع کرتے ہو کہ ویسے ہی کسی باہر کے مجرم کو اللہ تعالیٰ جنت میں بلائے گا؟"

کیا خدا اُسے خوش آمدید کہہ دے گا کہ آیئے تشریف لایئے، جنت آپ کیلئے موجود ہے؟ رہنے والے کو بڑی حد تک رعایت دی جاتی ہے۔ رہ رہا تھا۔ باہر والے کیلئے کیا رعایت ہے؟ جب رہنے والے کی رعایت نہیں، باہر رہ کر کوئی بالکل ویسا ہی جرم کرے، خدا اُسے جنت میں کیسے بلائے گا؟

بہرحال میں نے یہ اس لئے عرض کیا تھا کہ نہ جانے کتنے صد ہا برس سے مجمع مخلوط تھا۔ ایک کے ملنے سے بھی تو مجمع مخلوط ہو گیا۔ ایک فیصد کہیے، ایک فی ہزار کہیے۔ بہرحال لفظ "فی" تو آ گیا۔ جانے کتنے برس سے یہ مجمع مخلوط تھا۔ مگر خدا نے

طرح دی، جب تک کر دی اور بٹھائے رکھا، جب تک بٹھائے رکھا، اس خیال سے کہ کوئی وقت تو ایسا آجائے کہ فرشتہ فرشتہ نظر آئے اور شیطان شیطان نظر آئے۔

تو اگر وہ یوں کہہ دیتا تو جب چاہتا، یہ کہہ دیتا کہ تم سب ملائکہ ہو اور یہ شیطان ہے مگر ہر شخص یہ کہتا کہ بغیر بناء کے کہہ دیا، بغیر کسی بات کے کہہ دیا۔

یہ خدا کی شان نہیں ہے کہ اپنے علم سے کسی پر فردِ جرم لگا دے۔ نہ خدا کی یہ شان ہے، نہ خدا والوں کی یہ شان ہے۔ ہزار دفعہ آپ نے سنا ہوگا کہ اپنے قاتل کو دکھا رہے ہیں۔

میثم! یہ ہے میرا قاتل۔ اُس نے کہا مولاؑ! آپؑ اس کو قتل کیوں نہیں کروا دیتے؟ کہا: میثم! جرم سے پہلے قصاص کیسا؟

کہا: مولاؑ! اسے کوفہ کی حدود سے باہر نکال دیجئے، شہر بدر کر دیجئے۔

فرمایا: میثم! جرم سے پہلے سزا کیسے دی جائے؟

اللہ کی اور اہل اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ ظہورِ جرم سے پہلے اُس کو سزا دی جائے اور اُسے مجرم قرار دیا جائے۔

اب قدرت نے چاہا کہ کوئی دن کسوٹی کے پیش کرنے کا دن ہو جس سے فرشتہ کا رنگ الگ ظاہر ہو اور شیطان کی بے رنگی کا الگ ظہور ہو۔ اب خداوند عالم کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیسا حکم ہو اور کیا حکم ہو جس کیلئے فرشتہ کی تعمیل اتنی آسان ہو کہ چشم زدن میں تعمیل کر ڈالے اور شیطان کیلئے اتنا مشکل ہو کہ سب کچھ بن جانا وہ گوارا کرلے مگر حکم پر عمل نہ کر سکے۔

حضرات! انسان کو جن کاموں کی عادت ہو جاتی ہے، اُن کے بارے میں

وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ لکھنے والے سے کہئے کہ دو حرف لکھ دو کہ میں کل پہنچوں گا۔ حاضر ہوں، کیا مشکل ہے؟ مگر اُس شخص کیلئے جس نے ایک حرف نہیں پڑھا، یہی دو حروف لکھنے کتنے مشکل ہیں! وہ کیسے لکھے؟

فرشتہ اور شیطان دونوں خدا کو سجدہ کرنے کے عادی تھے۔ اس لئے آدم کو سجدہ کا حکم کوئی بھاری چیز تو نہ تھی مگر شیطان کیلئے یہ اتنی بھاری ہوگئی کہ وہ اپنا سب کچھ تباہ کر سکتا تھا، کر لیا مگر سجدہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کام اتنا بھاری تھا۔ خداوند عالم نے اُس کو معیارِ امتحان بنا دیا اور ملائکہ جو ہیں، سب سجدے میں ہیں۔ یہ الگ سرکش بنا بیٹھا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرشتہ کون ہے اور غیر فرشتہ کون ہے؟

خدا جانے اتنا پرانا قصہ قدرت نے ہمیں کیوں سنایا؟ ہمارے دلوں کو لگانے کیلئے سنایا؟ کیا ہماری تفریح کیلئے سنایا؟ قرآن کا اپنا ارشاد ہے کہ وہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔ قرآن کا تو کُل ہو یا جزو، ہدایت کیلئے ہے۔

خداوند عالم نے ہدایت کی ہے کہ شیطان صفت نہ بننا، فرشتہ خصال بننا۔ جو کرنے والا کر گزرا، وہ نہ بن جانا۔ وہ شیطان اپنے نام کی بناء پر نہیں بنا، اپنے کام کی بناء پر بنا۔ لہٰذا وہی کام جو کرلے، وہ شیطان ہے۔

لہٰذا حضرات! آدم کی جگہ دُوسرا آئے گا۔ اُس کی جگہ کوئی تیسرا آئے گا۔ ہر آنے والا اپنے زمانے کا آدم ہوگا اور جب وہ اپنے زمانے کا آدم ہوگا تو وہ نیابتِ الٰہیہ کا وارث بن کر آئے گا اور وہی حکم الٰہی انسانوں پر بھی جاری رہے گا۔ مان لیا تو صفِ ملائکہ میں داخل، نہ مانا تو نہ ماننے والے کا ساتھی۔ شیطان بھی بنتے چلے جائیں گے، فرشتہ صفت بھی بنتے چلے جائیں گے۔ ایک کا قائم مقام، دُوسرا قرار پاتا جائے

گا۔ خلیفہ کی جگہ دُوسرا خلیفہ اور شیطان کی بجائے دُوسرا شیطان۔ فرشتہ کی بجائے دُوسرا فرشتہ، یہ سلسلہ برابر قائم رہے گا۔

میں نے ابتداء کسی انتہا کیلئے کی تھی۔ یہ دیکھنا کہ کسے مانا؟ بیکار ہے۔ یہ دیکھنا کہ کس کی اطاعت کر رہا ہے؟ بیکار ہے۔ دیکھنے کے لائق جو چیز ہے، وہ یہ کہ مانا کسی کو بھی ہو، مانا کس کے کہنے سے؟ اطاعت کسی کی بھی ہو، کس کے حکم سے؟ اگر اطاعت میں خدا کا حکم موجود ہے تو جن کی اطاعت کی، بظاہر اُن کی اطاعت نہیں کی بلکہ اُس کی اطاعت کی جس کے کہنے سے کی ہے۔ مانا لاکھوں کو سہی لیکن اگر اُن سب کو اُس ایک کے کہنے سے مانا تو پھر ماننا اُس کا ہوا۔

اب ذرا مجھے سوچ کر جواب دیجئے کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ اہل بیتؑ کے ماننے والے ہیں۔ کہنے والے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ علیؑ کے ماننے والے ہیں۔ لیکن کیا آپ واقعاً اہل بیتؑ کے یا حضرت علیؑ کے ماننے والے ہیں؟ علیؑ کے ماننے والے آپ اُس وقت ہوتے جب غدیر خم پر مولا حضرت علیؑ نے کہا ہوتا کہ جس کے رسولؐ مولا ہیں، اُس کا میں مولا ہوں اور علیؑ نے کہا ہوتا کہ علم کے شہر نبیؐ ہیں اور میں اُس کا دروازہ ہوں۔

اگر آپ نے علیؑ کو باب العلم علیؑ کے کہنے سے مانا ہوتا، تب آپ علیؑ کے ماننے والے ہوتے۔ اہل بیتؑ نے اگر کہا ہوتا کہ اللہ نے ہمیں پاک وپاکیزہ بنایا ہے، تب آپ اہل بیتؑ کے ماننے والے ہوتے۔

مگر حضرات والا! حقیقت یہ ہے کہ یہ اہل بیتؑ کا جو ذکر ہم اپنی مجالس میں کرتے ہیں، اگر اُنؑ کے حکم سے ذکر کرنے والے ہوتے تو تب ہم اُنؑ کے ماننے

والے ہوتے اور اُن کے حکم کی تعمیل کرنے والے ہوتے۔ مگر کہنے والا تو کوئی اور ہے کہ اپنی مجالس کو علیؑ کے ذکر سے سجاؤ۔ اب یہ ذکرِ علیؑ حضرت علیؑ کے حکم کی تعمیل نہیں ہے بلکہ رسولؐ کے حکم کی تعمیل ہے۔ علیؑ کی خاطر نہیں بلکہ رسولؐ کی خاطر۔ علیؑ کو ہم نے ولی نبیؐ کے کہنے سے مانا۔ علیؑ کو ہم نے امام مانا، امیر المؤمنینؑ مانا، بابِ علم مانا، طاہر مانا، کرار مانا، غیر فرار مانا، یعسوب الدین مانا، کلمة التقویٰ مانا، حبل اللہ مانا، حجۃ اللہ مانا۔ سب کچھ مانا اور ان میں سے کچھ بھی تو علیؑ کے کہنے سے نہیں مانا۔ جب اُنہیں کچھ مانا، نبیؐ کے کہنے سے مانا یا خدا کے کہنے سے مانا۔

جب خدا اور رسولؐ کے کہنے سے مانا، یہ ماننا کس کا ہوا؟ خدا اور رسول کا۔ وہ منوائیں اور پھر بھی ہم نہ مانیں تو یہ علیؑ کا نہ ماننا نہ ہوا، منوانے والوں کا نہ ماننا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ سرکار نے فرمایا: علیؑ کا ذکر میرا ذکر ہے اور میرا ذکر اللہ کا ذکر ہے اور اللہ کا ذکر عبادت ہے۔

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" کے لفظ پے در پے اسی ترتیب سے قرآن میں آئے ہیں۔ بالکل اسی ترتیب سے یہ سب الفاظ مترجم قرآن یعنی پیغمبرؐ خدا کے ذریعہ اللہ کا پہلا ارشاد بن کر ہم تک پہنچے ہیں اور وہ ارشاد یہی ہے:

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً".

اس سے پہلے کی ہمیں کچھ خبر نہیں کہ اُس نے کیا کہا اور کس سے کہا؟ یہ اللہ کا پہلا ارشاد ہے۔ اُس کے بعد انبیاء کے ارشادات ملتے رہیں گے۔ پھر سیدُ الانبیاء کے ارشادات ملتے رہیں گے اور آخری نبی کا کوئی آخری ارشاد بھی ہوگا۔ میں تھوڑی دیر کیلئے تو حیرت زدہ ہو جاتا ہوں کہ وہ اللہ کا پہلا قول اور رسولؐ اللہ کا آخری قول اتنا مل

رہا ہے۔ وہاں خدا کا پہلا قول کیا تھا؟

"اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً".

رسولؐ خدا کا آخری قول کیا ہے؟

"اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْن".

جتنا اس ترتیب پر نگاہ جمائیں گے، یقیناً میرے بیان کی تائید فرمائیں گے۔ لفظ سے لفظ مل رہا ہے۔ "اِنِّیْ" کا لفظ دونوں جگہ ہے۔ ایک جگہ "جَاعِلٌ" ہے اور دوسری جگہ "تَارِکٌ" ہے۔ یہ دونوں شبہ فعل ایک وزن پر ہے۔ اگر آپ کہیں کہ نبی بھی "جَاعِلٌ" کہتے۔ اگر کہتے تو نبی نہ رہتے اور نبی کی طرح خدا اگر "تَارِکٌ" کہتا تو خدا نہ رہتا۔

آپ خود غور فرمائیں کہ خدا کیسے کہہ سکتا تھا اور اگر خدا کی طرح نبی 'جَاعِلٌ' کا لفظ استعمال کرتے تو نبی نہ رہتے اور نبی کی طرح خدا "تَارِکٌ" کہتا تو خدا نہ رہتا، یہ بھی تو سوچئے کہ خدا کیسے کہہ سکتا ہے کہ "میں چھوڑ رہا ہوں" یا "میں چھوڑے جا رہا ہوں"۔

حضرات! جب قرار داد نبی کی نہ تھی تو پیغمبرؐ "اِنِّیْ جَاعِلٌ" کیسے فرماتے؟ نبی "جَاعِلٌ" کیسے کہتے؟ چھوڑنا آپ کا کام تھا۔ خدا نے "جَاعِلٌ" اپنے منصب کے اعتبار سے کہا۔ پیغمبرؐ نے "تَارِکٌ" اپنی حیثیت کے مدنظر کہا۔ خدا کا کلام زمین کے اوپر کسی جگہ تھا۔ اس لئے "فِی الْاَرْض" کہا۔ نبی کا کلام لوگوں کے سامنے تھا، آپؐ نے "فِیْکُمْ" فرمایا۔

اب چوتھے لفظ کا چوتھے لفظ سے مقابلہ بڑے راز کھول رہا ہے۔ وہاں "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی

اَلْاَرْضِ خَلِیْفَۃً"، یہاں "اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَبَیْتِیْ"، آپ نے شاید ثقلین کے لفظ پر نظر نہ فرمائی ہو، جو نبیؐ نے فرمایا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں ہو کہ ایک اُس قرآن کو، جو الماری میں ہے، کے متعلق کہا ہے اور ایک اپنے اہل بیتؑ کو فرمایا ہے کیونکہ آگے چل کر یہ بھی تو فرمایا ہے کہ "لَنْ یَّفْتَرِقَا"، "یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہو سکتے۔ تو الماری والا اور وہ تو پھر جدا ہو گئے۔ حالانکہ ارشادِ نبوی تو یہ ہے کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہو سکتے۔

حضرات! یہ قرآن تو وہ قرآن ہو سکتا ہے جس قرآن میں اور اُن میں افتراق پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے یہ فرما کر اور واضح کیا ہے:

"حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ"۔

تو حضرات! یہ دونوں جو وارد ہوں گے، کیا الماری والا بھی جائے گا اور اہل بیتؑ بھی جائیں گے یا کتب خانہ والے قرآن اور اہل بیتؑ ملے جلے جائیں گے اور حوضِ کوثر پر دونوں پہنچیں گے؟ کبھی سوچا بھی ہے کہ کیسے پہنچیں گے؟ یہ قرآن کونسا ہے جو حوضِ کوثر پر نبی کی بارگاہ میں پہنچے گا؟ کس زمانہ کا لکھا ہوا ہوگا؟ کس مطبع کا چھپا ہوا ہوگا؟ کس کاغذ پر لکھا ہوا ہوگا؟ قیامت ہے کہ قیامت آ گئی اور یہ رہ گیا؟

حضرات! آج ہزار برس پہلے کے قرآن نہیں ملتے۔ آج کے قرآن دس بیس ہزار سال رہ سکیں گے؟ لکھتے جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ کیسا کاغذ ہوگا جو رہ جائے گا اور نبی تک پہنچے گا؟ سمجھا ہی نہیں گیا۔ قرآن نے اپنی اس حقیقت کو آیت قرآنی سے بیان کیا ہے۔ یہ تو نقلیں ہیں۔ پیغمبرؐ کا اشارہ نقلوں کی طرف نہیں ہے، اصل کی طرف ہے اور اصل کا پتہ خود قرآن نے دیا ہے:

"بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ".

"اصل قرآن تو وہ آیاتِ بینات ہیں جو اُن لوگوں کے سینے میں ہیں جن کو علم دیا گیا ہے"۔ (عنکبوت:49)

نہ اُن سینوں سے یہ آیات باہر نکل سکتی ہیں اور نہ وہ سینے اِن آیات سے خالی ہو سکتے ہیں۔ تو جن کے سینوں میں اصل قرآن ہے، جب وہ نبی کی بارگاہ میں پہنچیں گے تو اُن کا وہ پہنچنا قرآن اور اہل بیت کا ملا جلا پہنچنا ہے۔ یہ ہے قرآن کی حقیقت۔

پھر مجھے وہ آیت یاد آتی ہے کہ پیغمبر عرصہ محشر میں کھڑے ہوئے ہوں گے اور خدائے حبیب سے عرض کر رہے ہوں گے:

"يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا".

"میرے پالنے والے! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا"۔

اگر یہی لفظ ہوتا کہ میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا، تب بھی اور بات تھی مگر وہاں الفاظ یہ ہیں "هٰذَا الْقُرْآن"۔ اِس قرآن کو چھوڑ دیا تھا جو نبیؐ کے پہلو میں ہے، نبیؐ سے قریب ہے۔ "هٰذَا" کے لفظ سے مشارٌ الیہ کی طرف اشارہ قریب ہو رہا ہے کہ میری قوم نے اِس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ تو وہ قرآن جو نبیؐ کے پہلو میں ہوگا، برابر میں ہوگا، قریب ہوگا، آلِ محمدؐ ہیں اور پھر نہ پوچھئے نبی کیا کیا کہیں گے اور نبی کیا کیا دکھائیں گے اور کیا کیا پیش کریں گے۔ بڑا سخت وقت ہوگا۔ ایک طرف نبی کی فریاد ہوگی اور دوسری طرف علیؑ کی فریاد ہوگی۔ پھر:

فریاد از آن زمان کہ زبیداد کوفیاں
ہنگام داد خواہی خیر النساء رسد

سیدۂ خدا کی بارگاہ میں فریاد کریں گی اور غالباً اُسی لب ولہجہ میں جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ میرے بچے کے ٹکڑے کردیئے۔ کبھی عباسؑ کے ہاتھوں کے قطع ہونے کا ذکر کریں گی، کبھی اعضائے مقطعاتِ حسینؑ کا ذکر کریں گی۔ ایک لعل کے جگر کے ٹکڑوں کا ذکر کرتی ہوئی فریاد کریں گی۔ خدا جانے کیا عالم ہوگا؟

اللہ، اللہ! یہ اہتمام بتایا گیا ہے کہ جب معظمہؑ کی سواری آئے گی تو منادی ندا کرے گا:

"غُضُّوا اَبْصَارَكُمْ".

"اہلِ محشر! اپنی آنکھوں کو بند کرلو"۔

فاطمہؑ بنت رسول آرہی ہیں۔ زینبؑ اسی فاطمہؑ کی بیٹی ہیں۔ کبھی سواری آپؑ کی کوفہ میں پہنچتی ہے، کبھی شام کے بازار سے گزرتی ہے۔ ارے وہاں یہ منادی ہوگی کہ آنکھوں کو بند کرلو اور یہاں یہ ندائیں تھیں کہ آنکھیں کھول لو۔

"هٰذِهٖ زَيْنَب وَهٰذِهٖ اُمّ كُلْثُوم".

کیا ترجمہ کروں؟

"هٰذَا بَنَاتُ رَسُوْلُ اللّٰه".

دیکھو! یہ رسول اللہؐ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ آلِ محمدؐ کے قیدی ہیں۔ کہاں کہاں لے جائی گئیں؟ کس کس بازار سے گزاری گئیں؟ کس کس دربار میں کھڑی کی گئیں؟

مجھے سہل ابن ساعد ساعدی کا بیان یاد آرہا ہے۔ یہ رسول اللہؐ کے اصحاب میں سے تھے اور روزِ عاشور جناب سہل کا نام خود ہمارے امامؑ نے لیا تھا، جب تقریر فرمائی تھی اور اپنے مراتب کا اظہار کیا تھا۔ فرماتے فرماتے اور اپنے جدِ بزرگوار کے

ارشاد کو سناتے سناتے آپؑ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم کو میرے کہنے کا یقین نہ آتا ہو تو میرے جدِ نامدار کے اصحاب زندہ ہیں، اُن سے پوچھ لو۔ میرے بارے میں نبی نے کہا تھا کہ نہیں اور میرے اور میرے برادر نامدار کے بارے میں جدِ نامدار نے یہ کہا تھا یا نہیں؟ ابھی نبیؐ کے اصحاب موجود ہیں۔

آپؑ نے کچھ نام جو اصحابِ رسولؐ کے لئے ہیں، اُن میں ایک نام سہل ابن ساعد ساعدی کا بھی تھا اور روزِ عاشور اپنی زبان پر جاری کیا۔ اتفاق کی بات دیکھئے کہ سہل کا گزر بے خبری میں شام کے بازار سے ہوا۔ بیت المقدس کی زیارت کیلئے جا رہے تھے۔ یہ خبر نہ تھی کہ راستے میں کون کونسی زیارات آ رہی ہیں۔ بیت المقدس کی زیارت کے اشتیاق میں نکلے ہیں۔ شہر دمشق میں سے اُن کا گزر ہوا اور بازار کو جو دیکھا تو سجا ہوا دیکھا اور اس شان سے دیکھا کہ کبھی اس شان سے بازار کو نہ دیکھا تھا۔ حیران ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ آج کوئی عید کا دن ہے؟ آج یہ جشن کا سامان اور زینت کا سامان کیسا ہے؟ کسی نے کہا کہ تو پردیسی معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے حکومت پر چڑھائی کی تھی، اُس کو قتل کر دیا گیا۔ اُس کے مردوں کو مار دیا گیا، اُن کی بیوائیں اور یتیم قید کر کے لائے جا رہے ہیں۔ آج اُن کا داخلہ اس شہر میں ہے۔ بحالِ تباہ اُن کے آنے کی عید منائی جا رہی ہے۔

پوچھنے بھی نہ پائے کہ وہ گھرانہ کون تھا؟ یہ بیوائیں اور یتیم کن کے ہیں کہ یک بیک قافلہ نمودار ہو گیا اور اس شان سے نظر آیا کہ اس قافلے کے آگے آگے ایک نیزہ بردار ہے جو کسی کا سر نیزہ پر لئے ہوئے ہے اور اس سر کے پیچھے بیبیاں ہیں۔ لباسِ کہنہ، لباسِ بوسیدہ اُن کے بدنوں پر ہے۔ حال تباہ ہے۔ نہ کوئی عماری ہے، نہ

کجاوہ ہے۔ رسن بستہ بیبیاں ہیں۔ باقی سب بچے اور عورتیں ہیں۔

حضرات! سہل آگے بڑھے اور سرِ حسینؑ دیکھا، نہ پہچانے۔ سید سجادؑ کو دیکھا، نہ پہچانا اور اُن حالات میں کیسے پہچانتے؟ امامؑ کے سر کی خصوصیات تو آپ نے بار بار سنی ہوں گی کہ خدا جانے کتنے خونی خضاب تھے اور کتنے خاک و غبار کا اجتماع!! سر پہچاننے کے لائق کب رہا تھا؟ بیمار کا حال عجیب ہے۔ طوق گردن میں ہے، بیڑیاں پاؤں میں ہیں، پشت سے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ خدا جانے چہرے کا رنگ کیا سے کیا ہو گیا ہے!

اب سہل بیمارِ کربلا کے پاس پہنچے اور دریافت کیا:

"مِنْ اَیِّ قَوْمٍ اَنْتُمْ".

"مجھے معلوم کرنا ہے کہ آپ کس قوم سے ہیں؟"

اب بیمارِ کربلا نے سر اُٹھایا اور پوچھنے والے کے منہ کو دیکھا۔ سہل نے نہ پہچانا ہو مگر آپؑ نے پہچان لیا اور فرمایا: "سہل! تو نے ہمیں پہچانا نہیں؟"

سہل گھبرا اُٹھے کہ یہ کیا واقعہ ہے۔ میں انہیں پہچانتا نہیں، یہ مجھے جانتے ہیں۔ شرمندہ ہونے لگے۔ امامؑ نے فرمایا: "نہیں! شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ سہل! تم ہمیں کیسے پہچانتے؟ تم نے ہمیں طوق پہنے کب دیکھا تھا؟ بیڑیاں پہنے کب دیکھا تھا؟ اس ذلت اسیری کا لباس پہنے کب دیکھا تھا؟ تم نے نہ پہچانا مگر ہم نے پہچان لیا"۔

اب سہل تڑپ کر کہتے ہیں کہ خدا کیلئے بتا دیجئے کہ آپ کون ہیں؟ فرماتے ہیں کہ اچھا سنو!

"اَنَاابْنُ مَكَّةَ وَمِنٰی".

"میں مکہ اور منیٰ کا وارث ہوں"۔

"اَنَاابْنُ زَمْزَمَةَ وَصَفَا".

"میں زمزم اور صفا کا وارث ہوں"۔

محمد مصطفےٰ کا فرزند ہوں، میں زہرا کا فرزند ہوں، میں حسین کا بیٹا ہوں۔

سہل نے کہا: کاش! آج میں نابینا ہو گیا ہوتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ".

"تحقیق آیا ہے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے ایک نور اور ایک کتاب جو واضح بیان والی ہے"۔ (المائدہ:15)

آج کی اس محفل کی انتہائی برتری اور عظیم تقدس کیلئے یہ امر کافی ہے کہ یہ محفل اُس ذاتِ والا صفات کے ذکر سے منسوب ہے جس کی بدولت قدرت نے عالمین کی محفل کو سجایا۔ وجہ ایجادِ عالم کا ذکر مقصود ہے اور میں سب سے پہلے یہ کہوں گا کہ آسان کو دُشوار سمجھ لینا کم ہمتی ہے۔ لیکن دُشوار کو آسان سمجھ لینا جرأت و جسارت نہیں ہے بلکہ نافہمی ہے۔ ثنائے سیدؐالانبیاء اور اُسے ہمارا سہل سمجھ لینا، اتنی بلند ذات کہ جس سے مافوق بلندی عالمِ امکان کے تصور میں نہیں آسکتی۔ اس ذاتِ بلند کے ذکرِ بلند کیلئے زبانیں اتنی پست، تصور اتنے پست۔

جی یہ کہنے کو چاہتا ہے کہ اتنی بلند ذات کے بیان کیلئے کم سے کم نبی کی زبان تو ہو۔ ذکرِ سیدؐ انبیاء کیلئے، تذکرۂ امامِ انبیاء کیلئے کم سے کم کسی نبی کی زبان تو ہو، کسی ولی کی زبان تو ہو اور یا یہ نہ ہو تو علیؑ کی زبان ہو۔ کہاں وہ نبی اعلیٰ اور کہاں اُس کے ذکر کیلئے زبانِ ادنیٰ۔

میرے خیال میں اس ذکر کو اگر کسی نے دُشوار نہ سمجھا تو اُس نے نبی کو نہیں پہچانا۔ حقیقتاً آپ کے ذکر کا حق اگر کسی نے پورا کیا ہے تو وہ خداوندِ عالم کی ذات ہے اور اگر آپ کے ماننے کا حق کسی نے ادا کیا ہے تو وہ امیرالمومنینؑ کی ذات ہے۔

سب سے پہلے مجھے یہ امر روشن کرنا ہے کہ بہتر ہے بہتر کا ذکر اگر واسطے کے بغیر ہوگا تو ذکر میں عظمت پیدا نہیں ہوگی۔ ذکر کو اگر عظیم سمجھنا ہے اور قرار دینا ہے تو واسطہ اختیار کیجئے۔ جس کی صفت مقصود ہے، اگر اُس کا ذکر آپ نے چھیڑ دیا تو کیا حسنِ ادب رہا، کیا رجوع تصور رہا۔ ذکر ہمیشہ وہی موثر ثابت ہوگا جو وساطت کے ساتھ ہو۔ بتائیے تو سہی اُس کی ثنا و صفت کون کرسکتا ہے جس کی گود کے پالوں کی مدح نہیں ہوسکتی، جس کے پڑھائے ہوؤں کے علم و حکمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، جس کی زبان کے چسائے ہوؤں کی مدح نہیں ہوسکتی۔ وہ، جو اس نور سے منور ہوئے، جو اس ضیاء سے پُرضیاء ہوئے، جب اُن کے چہروں پر نگاہیں نہ ٹھہر سکیں تو اُس نورِ عظیم کا کیا ذکر!

میں شکایتاً یہ لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ دُنیا نے اِن کے ذکر کو سہل سمجھ لیا ہے اور براہِ راست اُن کا ذکر شروع کردیا۔ یہ ذکر کا حق نہیں ہے۔ آج میں ایک جملے کے ذریعہ یہ بات کہنا چاہتا ہوں، ذرا آپ تصور سے اور تفکر سے غور کیجئے۔

کیا یہ آج ہی کی محفل ہے جس کا مقصد ذکرِ سیّدُ الانبیاء ہے؟ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام میں جتنی محفلیں بھی قائم ہوتی ہیں، نام چاہے کسی محفل کا کچھ بھی ہو، ہر محفل اصل میں ذکرِ سیّدُ الانبیاء کی ضامن ہے، اس لئے کہ جس کا ذکر بھی جس محفل میں ہو، وہ اُس کی شخصیت کی بناء پر نہیں بلکہ اس امر کی بناء پر ہے کہ کوئی اُنؑ کا گود کا پالا ہے، کوئی اُن کا پرورش کیا ہوا ہے، کوئی وہ ہے جس نے ان کی زبان چوسی ہے۔ مسلمانوں نے آپ کے سوا جس کسی کو بھی مانا، آپ ہی کی بدولت مانا اور حد یہ ہے کہ اگر آپ سچ پوچھیں تو ہم نے تو اگر خدا کو بھی مانا تو صرف اُن کی بدولت مانا۔

اُس نے کب کہا ہم سے آ کر کہ میں تمہارا خدا ہوں، اُس نے کب آ کر کہا کہ مجھ کو آ کر مانو؟ ہم نے کب اُسے دیکھا؟ اِن کو دیکھا تو اُسے پایا، انہیں مانا تو اُسے مانا۔ انہوں نے منوایا تو اُسے مانا۔ یہ نہ ہوتے تو کون خدا کو مانتا؟ خدا کو مانا تو اِن کی بدولت مانا، آدمؑ کو مانا تو اِن کی بدولت مانا، ابراہیمؑ کو مانا تو اِن کی بدولت مانا، عیسیٰؑ کو مانا تو اِن کی بدولت مانا، توریت کو مانا، زبور کو مانا، انجیل کو مانا، قرآن کو بالآخر۔ سب کچھ اِن کے منوانے سے مانا۔

بحمد اللہ ہم نے ایسا مانا اور اس صاف دلی سے مانا کہ سرکار جسے منوائیں گے، ہم اُس کو مانیں گے، چوں چرا نہ ہوگا۔ پھر ہم نہ دیکھیں گے کہ پتھر کو کیوں منوایا جا رہا ہے؟ بے حس و حرکت گھر کو کیوں منوایا جا رہا ہے؟ اس لئے کہ ماننے کے بعد یہ شرط لگانا کہ اُسے کیوں مانوں اور اِسے کیوں مانوں، یہ شیطنت ہے۔ کشادہ دلی سے ماننے کے معنی تو یہ ہیں کہ امیر جس کو منوانا جائے، قائد جسے تسلیم کروانا چاہے، وہ پتھر ہو، جامد ہو اور پتھر میں بھی یہ نہیں دیکھنا کہ سیاہ ہے یا سفید! ہمارا تو سیاہ و سفید آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جسے آپ منوائیں گے، اُسے کیوں نہ مانیں گے اور جسے آپ نہ منوائیں، اُسے کیوں مانیں؟

حضرات! پھر ماننے میں یہ شرط نہیں کہ پچھلوں کو آپ منوائیں گے یا اپنے بعد میں آنے والوں کو آپ منوائیں گے تو مانیں گے۔ یہ شرط نہیں ہے۔ جو گزر گئے، آپ کے کہنے سے انہیں بھی مانا ہے اور جو آپ کے بعد آنے والے ہیں، آپ کے منوانے سے انہیں بھی مانیں گے۔

غرضیکہ آپ ہی کی بدولت ماضی کو مانا اور مستقبل کو مانا۔ جسے مانا، آپ کے

کہنے سے مانا۔

یہ نقطہ بڑی توجہ کے لائق ہو گا کہ جسے مانا، آپ کے کہنے سے مانا اور یہ کہہ کر مانا کہ اگر آپ نہ منواتے تو ہم ہرگز نہ مانتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس کسی کو بھی آپ نے نہیں منوایا، ہم نے ہرگز نہیں مانا۔ ہمارا یہی تو نقص ہے۔ اگر ہم میں کوئی عیب ہے تو یہی ہے کہ آپ نہیں منوا رہے تو پھر خدا ہی جانے، ہم ماننے کیلئے آمادہ نہیں ہیں اور اگر آپ منوانا چاہتے ہیں تو ہمیں تو آپ کو ماننا ہے، آپ کے حکم کو ماننا ہے، آپ کے اشارہ کو ماننا ہے، آپ کی پسند کو تسلیم کرنا ہے۔

یہاں میں ایک جملہ کہوں گا جو شاید میرے بیان کی شرح قرار پا سکے۔ بحمد للہ جتنے بھی افراد میری نظر میں ہیں، یہ سب آلِ محمدؐ کے ماننے والے اور مسلمان ہیں۔ ایسا کون ہو گا جو آلِ محمدؐ کا ماننے والا نہ ہو؟

مگر میں آپ سے کہوں گا کہ اہلِ بیتؑ کے ماننے والو! آلِ محمدؐ کے ماننے والو! تمہیں ناز ضرور ہے اس پر کہ ہم آنحضرتؐ کے اہلِ بیتؑ کے ماننے والے ہیں، سرکار کی آل کے ماننے والے ہیں، لیکن میں کہوں گا کہ یہ بات ترمیم کے لائق ہے۔ سب سے پہلے میں اپنی ذات کے متعلق کہنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہم آلِ محمدؐ کے ماننے والے ہیں مگر یہ ہمارا ماننا آلِ محمدؐ کا ماننا نہیں ہے اور کیوں آلِ محمدؐ کا ماننا نہیں ہے؟

اُس وقت آلِ محمدؐ کا ماننا ہوتا جب ہم نے آلِ محمدؐ کو آلِ محمدؐ کے کہنے سے مانا ہوتا۔ بڑی گہری بات ہے جو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ علیؑ کا ماننا اُس وقت ہوتا جب ماننے والوں نے نبیؐ کو علیؑ کے کہنے سے مانا ہوتا۔ خاتونِ جنتؑ کا ماننا، شبابِ اہلِ جنت کا ماننا، اہلِ بیتِ اطہار کا ماننا، یہ اُس وقت ہوتا جب ماننے والوں نے اُن کے

فرمانے سے مانا ہوتا۔

مگر عجیب واقعہ ہے، وہ یہ کہ اُن کو بہت کچھ ماناہے اور ماننا ہے (انشاء اللہ) مگر مانا کس کے کہنے سے؟ اُن کو اُن کے کہنے سے نہیں مانا۔ کہنا کسی اور کا، ماننا اِن کا۔

آپ غدیر کے میدان میں ذرا تصور کو لے چلئے۔ اس میدان میں ہر آواز آپ کو سنائی دے گی۔ خدا نے بھی کچھ کہا، جبھی تو نبیؐ نے بھی کچھ کہا اور فرشتہ نے بھی آکر کچھ نبیؐ سے کہا، جبھی تو نبیؐ نے بھی کہا۔ منبر کی بلندی پر نبیؐ نے بھی کچھ ارشاد فرمایا۔ فرش نشین مجمع نے بھی کچھ کہا۔ بقدرِ ظرف جو بات خدا کے کہنے کی تھی، وہ اُس نے کہی۔ جو کام فرشتے کے کرنے کا تھا، اُس نے کیا، جو حق نبیؐ کے کہنے کا تھا، اس حق کو نبیؐ نے پورا کیا۔

درمیان میں پھر یہ تخیل آرہا ہے کہ ایک مجھے وہ نبی نظر آتا ہے جس نے خدا سے اپنے فرزند کے بارے میں کہا اور جواب ملا کہ ہمارے نبی ایک بار کہہ چکے۔ اب اگر کہو گے تو ڈوبنے والا تو نہ بچے گا مگر تمہارا نام فہرستِ انبیاء سے نکال دیا جائے گا۔ اب اگر تم نے کہا تو نبی نہ رہو گے۔ ایک وہ مقام ہے کہ جہاں نبی کہے تو نبی نہ رہے، اسے ذہن میں رکھیے گا اور ایک آخری مقام یہ ہے کہ اگر نبیؐ نہ کہے تو نبی نہ رہے:

"وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ"۔

رسولؐ! تم نے یہ نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہ پہنچایا۔ "کچھ بھی نہ پہنچایا" کے معنی پھر یہی نکلے کہ رسول نہ رہے۔ معلوم ہوا کہ نااہلیت کی وہاں انتہا اور اہلیت کی یہاں انتہا!

غرضیکہ میں کہہ رہا تھا کہ اس میدان میں جو ہے، وہ بولتا ہوا نظر آرہا ہے۔

خدا نے بھی کچھ کہا، فرشتے نے بھی کچھ کہا، نبیؐ نے بھی کچھ کہا، حاضرین نے بھی کہا۔ لیکن تمام تاریخ کے ورق اُلٹتے ہوئے بڑھ جایئے، سب بولتے ہوئے نظر آ رہے ہیں، ہر ایک کی زبان کا ایک ایک جملہ، دو دو جملے سنائی دے رہے ہیں۔ کسی تاریخ نے آپ کو یہ بھی بتایا ہے کہ جہاں سب بولے تھے، عرش سے لے کر فرش تک اور فرش سے لے کر عرش تک، اُس بھری محفل میں علیؑ نے بھی کچھ کہا تھا؟ کوئی کلمہ، کوئی لفظ علیؑ کی زبان سے نکلا ہوا بھی آپ کے سامنے ہے یا آپ تک پہنچا ہے؟

مجمع بھی مبارکباد پیش کر رہا ہے، کبھی "بلیٰ" کہہ کر اقرار کر رہا ہے، پیغمبر بھی فرما رہے ہیں، خدا اور فرشتہ دونوں گویا ہیں، سب بول رہے ہیں اور علیؑ بصورتِ قرآن خاموش ہیں۔ کوئی لفظ ہی نہیں ملتا جو اُس زبان سے نکلا ہو۔ کوئی کلمہ ہی نظر نہیں آتا جو اُس دہن سے منکشف ہوا ہو۔ خاموشِ محض ہیں۔ اگرچہ قرآنِ ناطق ہیں مگر اس وقت ناطق نہیں، قرآنِ خاموش بنے ہوئے ہیں۔ صرف اس لئے کہ دکھانے والا دکھا رہا ہے اور دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ منطقی صورت ہے۔ منطق اور فقہ کی آمیزش کہہ لیجئے۔ حضراتِ والا! جس چیز کا دیکھنا عبادت ہو، پھر اُس کا دکھانا بھی عبادت ہے۔ مجمع کی نظر اُس کے چہرے پر ہے جس کے چہرے پر نظر کرنا عبادت ہے اور دکھانے والے اس چہرہ کے پیغمبرؐ ہیں۔ گویا اپنے عمل سے دکھلا رہے ہیں اور بتلا رہے ہیں:

"دیکھو اس چہرے کو اور داخلِ عبادت ہو جاؤ، میں دکھا رہا ہوں اور داخلِ عبادت ہو رہا ہوں"۔

کوئی کلمہ آپ کی زبان سے جاری نہیں ہوا۔ آپ نے کبھی اس طرف توجہ بھی

کی ہے کہ جو کچھ پیغمبرؐ نے کہا، مجمع نے مانا اور مجھے اس سے بحث نہیں کہ کوئی ایسا بھی تھا جس نے نہ مانا ہو۔ بہرحال ماننا نہ ماننا، یہ اُن کا کام تھا۔ علیؑ نے کچھ نہیں کہا۔ جو کچھ کہا، نبیؐ نے کہا۔

ہماری جانیں قربان ہو جائیں اس خاموش چہرے پر، علیؑ نے اُس دن کچھ نہ کہہ کر سب کچھ کہہ دیا، اس لئے کہ اُس مجمع میں کوئی آواز بھی علیؑ کی جانب سے بلند ہوتی تو کہنے والوں کو موقعہ مل جاتا کہ علیؑ نے اپنے آپ کو منوایا تھا۔ علیؑ نے خاموش رہ کر یہ بتلا دیا کہ اپنا منوانے والا میں خود نہیں ہوں۔ اُس (خدا) نے یا انہوں (ختمی مرتبتؐ) نے کہا، میں نے کچھ نہیں کہا اور جب میں نے کچھ نہیں کہا تو ماننے والے نے اگر مجھے مانا تو میرے کہنے سے نہیں مانا۔

مجھے یا تو خدا کے کہنے سے مانا یا خدا کے رسولؐ کے کہنے سے مانا۔

لہٰذا حضرات والا! یہ دیکھنا بیوقوفی ہے کہ کسے مانا! دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس کے کہنے سے مانا!

ایک موٹی سے بات آپ کے سامنے آ رہی ہے۔ کونسا نبی ہے، جس کے آپ ماننے والے نہیں ہیں؟ کوئی نبی ایسا ہے، جس کی نبوت سے آپ کو انکار ہو؟ آدمؑ سے لے کر خاتمؐ تک ہزارہا نبی آئے، نام بنام مانا۔ کسی کو نام کے علم کے بغیر مانا۔ مگر آپ نہ اُمت موسیٰؑ ہیں اور نہ اُمت ابراہیمؑ ہیں، نہ اُمت عیسیٰؑ ہیں۔

کیوں جناب! جب آپ نے انہیں مانا تو آپ اُن کی اُمت کیوں نہیں ہیں؟ جیسا کہ ہم نبی برحق اپنے نبی کو مانتے ہیں، ویسے ہی ہم نبی برحق موسیٰؑ کو بھی سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم قرآن کو بحق سمجھتے ہیں، اسی طرح ہم توریت کو بھی بحق سمجھتے ہیں۔

ہم اہلِ قرآن کیوں کہلا رہے ہیں؟ اُمتِ محمد مصطفٰے کیوں کہلاتے ہیں؟ ہم اُمتِ ابراہیمؑ کیوں نہیں ہیں؟ ہم اُمتِ موسیٰ کیوں نہیں ہیں؟ ہم اُمتِ عیسیٰ کیوں نہیں ہیں جبکہ ان سب کے ماننے والے ہیں؟

حضرات! اس لئے نہیں ہیں کہ اُن سب کو ماننا ضرور ہے مگر جن کو مانا ہے، اُن کے کہنے سے نہیں مانا۔ اِن (محمدؐ) کی اُمت اس لئے ہیں کہ اُنؐ کے سوا جس کسی کو مانا، اُنؐ کے کہنے سے مانا۔ اگر حضرت موسیٰ کے، عیسیٰ کے کہنے سے مانا ہوتا تو اُمتِ موسیٰ و عیسیٰ ہوتے۔ ہم نے اُن کو اِن کے (اپنے نبیؐ) کے کہنے سے مانا۔ تو اب ہر ایک کا ماننا اُن کا ماننا نہ رہا۔ اُن (ہمارے نبیؐ) کا ماننا ہو گیا۔

اسی انداز میں یہ چیز نظر میں رکھیے گا کہ اگر ہم نے اہلِ بیتؑ کو مانا تو سرکار ختمی مرتبت کے کہنے سے، نہ کہ اہلِ بیتؑ کے کہنے سے۔ تو صرف مؤخر الذکر صورت میں ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم اہلِ بیتؑ کے ماننے والے ہیں۔ مگر اُنہوں نے نہیں کہا کہ جس کے یہ مولا ہیں، اُس کا میں بھی مولا ہوں۔ خود حضرت علیؑ نے نہیں کہا کہ علم کا شہر پیغمبرؐ ہیں اور میں اُس کا دروازہ ہوں۔ خود اہلِ بیتؑ نے کہیں نہیں کہا، اللہ نے اُن کو پاک و پاکیزہ قرار دیا ہے۔ یہ جو کچھ بھی کہا، خدا نے کہا یا اُس کے رسولؐ نے کہا۔

تو پھر واضح ہے کہ اگر ہم نے اہلِ بیتؑ کو مانا تو خدا اور رسولؐ کے کہنے سے۔ جب اُن کو خدا اور رسولؐ کے کہنے سے مانا تو بتائیے کہ اُن کا ماننا ہوا یا خدا اور رسول کا ماننا ہوا؟ اب اگر خدا اور رسولؐ کے کہنے کے باوجود بھی ہم نہ مانیں تو دُنیا کہہ دے گی کہ انہوں نے اہلِ بیتؑ کو نہیں مانا۔

مگر فی الواقعہ یہ اُن کا نہ ماننا نہ ہوا بلکہ خدا اور رسول کا نہ ماننا ہو جائے گا

کیونکہ اہلِ بیتؑ نے اپنے ماننے کے متعلق کہا ہوتا، نہ ماننے والے نے اُن کے کہنے سے مانا اور نہ ماننے والے نہ اُن کے کہنے پر نہ مانا۔ مانا تو خدا اور رسولؐ کے کہنے سے مانا اور اگر اُن کے کہنے کے باوجود بھی کوئی انہیں نہیں مانتا تو خدا اور رسول کا نہ ماننا ہوا۔ یعنی یہ اُن کا نہ ماننا ہوا جنہوں نے منوانا چاہا تھا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ اسلام کی ہر محفل، خواہ وہ میلادِ نبیؐ کے نام سے ہو، میلادِ علیؑ کے نام سے ہو، میلادِ حسینؑ کے نام سے ہو، کسی بھی امامؑ کی ولادت کے سلسلہ میں ہو، کسی بھی امامؑ کی شہادت کے سلسلہ میں ہو، جب ہر ایک کو ہم نے پیغمبرؐ کی بدولت مانا تو ہر محفل کی مرجعیت پیغمبرؐ ہی سے قائم ہے بلکہ ہر ذکر پیغمبرؐ ہی کا ذکر ہے۔

ذرا اس تصور کو نظر میں رکھئے گا کہ ایک ذکر ہوتا ہے بغیر واسطے کے، کسی عالم کی آپ تعریف کر رہے ہیں، ماشاء اللہ ایسا عالم ہے، قابلیت ایسی ہے، بیان ایسا ہے، تحریر ایسی ہے، تقریر ایسی ہے۔ خود اُس کی آپ تعریف کرتے جا رہے ہیں۔ مگر یاد رکھئے گا کہ یہ تعریف کمزور ہے، اس لئے کہ وہ واسطہ کے بغیر ہے۔ اگر تعریف کو زوردار بنانا ہے یا یوں کہوں کہ اگر وہ عالم زوردار تعریف کا مستحق ہے تو اُس کے علم اور قابلیت کا چرچا نہ کیجئے بلکہ یہ کہئے کہ اُس کا تو کیا ذکر، اُس کے پڑھائے ہوئے ایسے، اُس کے سکھائے ہوئے ایسے! اُس سے آداب حاصل کرنے والے ایسے!

اگر کسی مقام پر عطر لگا ہوا ہے، خود اُسی چیز کو سونگھ سونگھ کر محسوس کر سکتے ہیں؟ اگر کمال محسوس کرنا ہے تو عطر کی خوشبو کے بارے میں اُس ہوا سے پوچھئے جو عطر سے مس ہو کر آپ تک پہنچ رہی ہے۔ آفتاب کی روشنی آفتاب سے معلوم نہ کیجئے بلکہ ماحول کو دیکھئے کہ وہ آفتاب سے کتنا روشن ہو رہا ہے۔ جب ماحول کو دیکھئے گا، تب عظمتِ شے کا

اندازہ کیجئے گا۔ چراغ کس جگہ روشن ہے، اُس کی بتی سے یا اُس کی لَو سے نظر کو ہٹائیے، اُن اطراف کی طرف دیکھئے جو اُس لَو سے روشن ہورہے ہیں اور اب اندازہ لگائیے کہ وہ روشنی کتنی ہوگی اور کیسی ہوگی!

سورج ڈوبنے والا ہے مگر کیا کہنا ہے اُس کی لَو کا اور اُس کی روشنی کا کہ ڈوبتے ڈوبتے اُس کے دم سے فضا اتنی نورانی ہے کہ دن کہا جارہا ہے اور پھر یہی لَو نہیں رہتی تو پھر رات کہنا پڑتا ہے اور یہ لَو ابھی نکلتی نہیں، کتنے میلوں کے فاصلہ پر ہوتی ہے تو اگرچہ وہ لَو سامنے نہیں آئی مگر صبح نورانی ہوگئی۔

یہ تو اندازے کی بات ہے اور دیکھنا یہ چاہئے کہ کسی چیز کے دم سے ماحول کتنا منور ہوجاتا ہے، کتنا معطر ہوجاتا ہے۔ اگر ان چیزوں پر نظر رہے تو اصل شے کی عظمت کا احساس رہتا ہے۔ خود نبی کا ذکر آپ کے ذہن میں بلندی کا بھی ہے یا آپ اُس نبی کی رفعت کا تصور قائم کرسکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ آپ کبھی زلفِ سیاہ کو پیش کریں گے، کبھی آپ چہرۂ تاباں کو پیش کریں گے، کبھی آپ عبائے منور کو پیش کریں گے۔ بس یہی ایک اندازِ نزاکتِ خیال ہوگا۔

لہٰذا نبی کا ذکر آپ اس طرح کررہے ہوں گے مگر رفعتِ شانِ پیغمبر تو ان الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتی۔

یہاں تھوڑی دیر کیلئے ایک مسئلہ بیان کردوں تو آپ شاید حیرت ناک بھی ہوجائیں۔ قرآن مجید میں بعض انبیائے سابقین کے القاب وخطابات موجود ہیں، مثلاً جناب آدم کا لقب صفی اللہ ہے۔ آپ کو بھی معلوم ہے۔ آیت بھی اُس کی دلیل میں موجود ہے۔ جناب ابراہیم کا لقب خلیل اللہ ہے۔ آیت میں اس کا ذکر موجود ہے یا

نہیں؟ قرآن میں اُس کا تذکرہ موجود ہے یا نہیں؟ جنابِ موسیٰ کا لقب کلیم اللہ ہے۔ یہ لقب بھی قرآن میں موجود ہے۔ جنابِ عیسیٰ کا لقب روح اللہ ہے۔

مسلمانو! کوئی لقب تمہارے نبی کا بھی ہے یا جو نبیؐ سید الانبیاء ہے، وہ لقب کے بغیر ہے؟ لقب اتنا مشہور کہ بچے بچے کی زبان پر حبیب اللہ آتا ہے۔ مگر شاید آپ تھوڑی دیر کیلئے حیران ہو جائیں کہ قرآن اُن پر اُترا، آخری کتاب جس کا اُن پر نزول ہوا، اس قرآن میں پچھلے انبیاء کے القاب تو ہیں مگر جن پر خود قرآن اُترا ہے، اُس کا اپنا لقب بھی قرآن میں ہے یا نہیں؟

یہ عجیب حیرت کی بات ہے کہ جن پر قرآن نہیں آیا، اُن کا لقب تو قرآن نے بیان کر دیا مگر جس پر قرآن آیا اور جسے قدرت نے تمام انبیاء پر فوقیت دی، اُس کے لقب کا کہیں ذکر نہیں۔ آپ نے اگر کوئی آیت پڑھی ہو جس میں خدا نے فرمایا ہو کہ اُس نے رسول کو حبیب قرار دیا ہے تو شاید آپ کے علم میں ہو، بہر حال میری نظر میں نہیں ہے۔

یہ لقب اتنا مشہور اور جنابِ امیر علیہ السلام کا قول:

"وَاتَّخَذَ مُحَمَّداً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ حَبِيْباً".

جہاں دُعاؤں میں حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کا ذکر کیا، وہاں ختمی مرتبت کے لقب کا بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اپنا حبیب قرار دیا۔ تو اولیاء میں آپ کا لقب مشہور، عوام میں آپ کا لقب مشہور، زبانوں پر آپ کا لقب جاری، مگر آیاتِ قرآنی میں کہیں نہیں ملتا۔

حضرات والا! نہ ملنے کی بناء پر حیرانی تو ہو سکتی ہے مگر نہ ملنے کی بناء، یہ سمجھنا

آسان نہیں ہے۔ خداوند عالم نے چاہا ہی نہیں کیونکہ اگر وہ چاہتا تو روکنے والا کون تھا؟ اُن کو تو اتنا چاہا مگر اُن کے لقب کا ذکر کرنا نہ چاہا۔ محبت کی انتہا اور ذکرِ محبت ندارد۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے ان انبیاء کے القاب کے سلسلہ میں یہ بات پسند کی کہ براہِ راست بیان کر دیئے جائیں۔ وہ میرا صفی ہے، وہ میرا خلیل ہے، یہ میرا کلیم ہے، وہ میری روح ہے۔ اب رہا یہ مقام کہ یہ میرا حبیب ہے، براہِ راست اُنہیں حبیب کہہ دینا محبت کا حق ادا نہ کر سکے گا، اس لئے کہ لفظِ محبت میں خود وہ طاقت نہیں جو اس محبت کو اُٹھا سکے جو مجھے اُس سے ہے۔ قدرت نے براہِ راست انہیں اپنا محبوب کہنا پسند نہ کیا بلکہ ایک عنوان اختیار کیا اور وہ عنوان ہے مدح بالواسطہ کا۔ یہی میرا موضوع تھا اور چند کلمے اُسی کے متعلق کہنا ہیں۔

ایک بادشاہ نے اپنے وقت کے ایک عالم کو طلب کیا اور اپنے دونوں لڑکوں کی طرف اشارہ کر کے، جو اُس کے پاس مسندوں پر بیٹھے تھے، سوال کیا کہ تمہیں یہ دو شہزادے زیادہ عزیز ہیں یا حسنؑ و حسینؑ؟

اب آپ ہی بتلائیں کہ کیا جواب دے؟ جواب تو بہر حال یہ نہیں دے سکتے تھے کہ تیرے بیٹے مجھے زیادہ محبوب ہیں مگر میں آپ کو جس راستے پر لانا چاہ رہا ہوں، انشاء اللہ اب آپ آسانی سے آئیں گے۔ سچ پوچھئے تو یہ جواب بھی نہیں دے سکتے تھے کہ تیرے بیٹوں سے حسنینؑ مجھے زیادہ محبوب ہیں۔ یہ جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ کیوں؟

اس لئے کہ بے ادبی ہے۔ لہٰذا یہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔ کیا کہنا درستی ہوش و حواس کا! اور کیا کہنا علم و معرفت نورانیت کا کہ موت کا بادل سر پر منڈلا رہا ہے

اور یہ جانتے ہیں کہ میرا جو کچھ بھی جواب ہو، پیغامِ اجل ہوگا۔ مگر ایسا کہہ جاؤں کہ وہ قولِ آخر ہو۔ نہ یہ کہتے بن پڑتی کہ تیرے بیٹے حسنینؑ سے زیادہ عزیز ہیں اور نہ یہ کہنا حسنِ ادب ہے کہ تیرے بیٹوں سے وہ زیادہ پیارے ہیں۔ جواب کو جاندار بناتے ہیں، بالواسطہ جواب دیتے ہوئے کہا:

"اِنَّ قَنبَرَ الْخَادِمَ اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ ابْنَیْکَ وَ مِنْکَ".

نہ امام حسنؑ کا نام لیا، نہ امام حسینؑ کا نام لیا۔ جواب صرف اتنا دیتے ہیں کہ "قنبر، امیر المؤمنینؑ کا خادم، وہ مجھے زیادہ محبوب ہے تیرے بیٹوں سے"۔ اتنا کہنے کے بعد مزید ترقی کرتے ہیں:

"صرف تیرے بیٹوں سے ہی نہیں بلکہ تجھ سے بھی"

یہاں مقام بلند کر دیا اور ادھر کا مقام پست قرار دیا جا رہا ہے۔ حضرت علیؑ کا ذکر نہیں، اولادِ علیؑ کا ذکر نہیں، اُس گھر کا تو کر صرف تیرے بیٹوں سے نہیں بلکہ تجھ سے بھی زیادہ محبوب ہے۔ یہ ہے مدح بالواسطہ۔

آپ اندازہ کیجئے کہ بادشاہ کے سوال پر یہ کہہ دیتے کہ حسنؑ و حسینؑ مجھے تیرے بیٹوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔ جواب تو ہو جاتا مگر جاندار نہ ہوتا۔ اتنا سمجھ لینے کے بعد آپ کیلئے یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ ابراہیم کو تو اللہ نے کہہ دیا کہ میرا خلیل ہے، موسیٰ کو کہہ دیا کہ میرا کلیم ہے۔ مگر جب اُن کو کہنا ہوا کہ میرا حبیب ہے تو اُن کو نہیں کہا بلکہ عنوان اختیار کیا اور وہ عنوان یہ تھا؟

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ".

''اے رسولؐ! ان کو کہہ دو کہ اگر تم یہ دعویٰ رکھتے ہو کہ خدا سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو، خدا تمہیں محبوب بنالے گا، خدا اُس کا محب ہو جائے گا''۔

خدا کو بتانا یہ ہے کہ رسولؐ! میں تجھے اپنا محبوب کہہ کر تیری شان کو گھٹانا نہیں چاہتا۔ تیرا یہ مقام نہیں ہے کہ تجھے اپنا محبوب کہہ کر رفعت کا اظہار کر سکوں۔ میرا محبوب تو تیرا پیروکار ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔

مجمعِ عالم اب سن لے کہ جس کے نقش پر چلنے والا میرا محبوب ہو تو خود یہ پیغمبرؐ مجھے کیسا محبوب ہو گا!

لہٰذا براہِ راست اُنہیں اپنا محبوب نہیں کہا۔ ایک اور مقام قرآن میں ہے:

''لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ. وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ''.

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر مکہ کی۔

مگر کب؟ جب تم اس شہر میں ہو۔ یعنی قدرت کو گوارا نہیں ہوتا کہ تیری قسم کھائے۔ اس میں اظہارِ شان نہ ہو گا بلکہ اس شہر کی قسم، جب اس میں تم ہو۔

لہٰذا قسم کس کی ہوئی؟ شہر کی تو نہ ہوئی۔ مگر عجیب بالواسطہ انداز ہے۔

حضرات! بہت سی نقابیں اور پردے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں، اگر آپ نے توجہ فرمائی۔ یہ ذکر اُس شہر کا ہے جس شہر میں خدا کا گھر بھی ہے، بیت اللہ جس شہر میں ہے اور بیت ایسی چیز نہیں جو آج ہو، کل نہ ہو۔ وہ تو دن میں بھی ہے اور رات میں بھی ہے۔ اب بھی اور آئندہ بھی ہے۔ اُسے تو ہجرت کرنا نہیں ہے۔ اس کو تو اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں جانا نہیں ہے۔ خدا کا گھر جس شہر میں ہے، خداوند عالم اُس شہر کی قسم کا مدار اور معیار اپنے گھر کو نہیں رکھتا، اپنے گھر کو معیارِ قسم نہیں بناتا بلکہ رسولؐ کے

اُس میں ہونے تک اُس کی قسم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی قسم جہاں تم ہو۔

پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ جب تم اس شہر میں نہ ہوئے تو لاکھ ہمارا گھر ہو، پھر قسم کا ذکر نہیں، اس لئے کہ ہمارا تعلق حقیقی تو اہلِ بیت سے ہے، بیت سے نہیں ہے۔ جس گھر میں تم ہو، وہ گھر مجھے پیارا ہے، جس سرزمین پر تم ہو، وہ سرزمین مجھے پسند ہے، ایسی پیاری کہ قسم کے لائق ہے۔

تعریف ہمیشہ جاندار وہ ہوگی جو بالواسطہ ہو۔ میں ایک مثال سناتا ہوں۔ کسی شخص نے سوال کیا کہ یہ بتایئے کہ آپؐ مرتبہ میں بلند اور افضل ہیں یا حضرت موسیٰ؟ ملاحظہ فرمایئے کہ سوال خود ختمی مرتبتؐ سے ہو رہا ہے۔ جواب نہ دیں تو ہدایت کیسے ہو؟ جواب دیں تو کیا دیں؟ نہ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ موسیٰ مجھ سے افضل ہیں۔ یہ جواب غلط ہوتا۔ اگر یہ کہیں کہ موسیٰ سے میں افضل ہوں تو جواب تو ہوگیا مگر زوردار جواب تو نہ ہوا۔

اللہ اکبر! اس مشکل کو آسان کرنا نبیؐ ہی کا کام تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنا ذکر نہیں کرتا۔ تم اپنے سوال کو یوں بدلو کہ موسیٰ افضل ہیں یا آپ کا علیؑ افضل ہے؟ میں اس کا جواب دیتا ہوں کہ جب خداوند عالم نے موسیٰ کو حکم دیا:

"اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى"۔

"فرعون کی ہدایت کیلئے جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے"۔

جو میں کہوں، اُس کو ذرا ذہن میں رکھئے گا۔ فرعون کی طرف جاؤ۔ ہارون کو لے کر جانا۔ ایک نہیں، دو ہو کر جانا۔ جا کر سخت بات نہیں کہنا۔

"فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى"۔

نرم گفتگو کرنا۔ دو جاؤ، نرمی سے بات کرنا۔ اب موسیٰ نے جو جواب دیا، وہ قرآن میں موجود ہے:

"قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ".

پالنے والے! میں اُن میں سے ایک کو قتل کر چکا ہوں اور میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔

جناب! پیغمبرؐ حاضرین سے فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ قرآن میں ہے اور یہاں کا واقعہ تمہاری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے کہ جب سورہ برائت کی دس آیات نازل ہوئیں تو جن آیتوں میں قدرت نے کفار پر تبرا کیا ہے، جو آیتیں ایسی پُر غیض و غضب ہیں کہ آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تک نہیں ہے کیونکہ یہاں ذکر رحمت کا ہے ہی نہیں، ذکرِ عقوبت ہے، ذکرِ عذاب ہے۔ یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

میں نے علیؑ کو بلایا، یا علیؑ! یہ دس آیات لے کر جاؤ اور کفارِ مکہ کو سناؤ۔ وہاں دو بھیجے جا رہے تھے، یہاں ایک ہے۔ وہاں نرم گفتگو کا حکم تھا، یہاں شدید ترین گفتگو ہو گی۔ موسیٰ نے تو اُن میں سے ایک کو قتل کیا تھا، یہاں جس کو بھیجا جا رہا ہے، اُس نے تو لاتعداد افرادِ کفارِ مکہ کو قتل کیا تھا۔ گھر کے گھر اُس کی تلوار کی بدولت نالہ کناں تھے۔ ہزار ہا کو جس نے قتل کیا تھا، اُس کو پیغمبرؐ اکیلا بھیج رہے ہیں، تبرا والی آیات (سورہ برائت کی پہلی دس آیات) پہنچانے کیلئے بھیج رہے ہیں۔

یعنی یہ جا کر کہنے کیلئے کہ ہمارے خدا نے ہمیں حکم دیا ہے:

"فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ".

جہاں تم اُن کو دیکھو فوراً قتل کر دو۔

"وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ".

اور اُن کفار کو قتل کرنے کیلئے ہر جگہ گھات میں بیٹھ جاؤ۔

ہمارے خدا نے یہ حکم دیا ہے۔ یہ حکم پہنچانے کیلئے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا تھا کہ ایک کو قتل کیا تھا، اس لئے ڈرتا ہوں۔ پیغمبرِ خدا فرماتے ہیں کہ جب میں نے علی کو حکم دیا ہے تو کیا علی نے کہا ہے کہ سرکار! میں نے تو ہزاروں کو اُن میں سے قتل کیا؟ بغیر خوف و ہراس، بغیر کسی تامل کے سورہ برائت لے کر گئے اور پہنچایا اور فرمایا کہ جس کا علی ایسا ہو، اب تم فیصلہ کر لو کہ اُس علی کا نبی کیسا ہوگا؟ اُس علی نے جس کو نبی مانا ہو اور جس کی نبوت کا اُس علی نے کلمہ پڑھا ہو، اُس نبی کی نبوت کی شان کیسی ہوگی!!

حقیقت امر یہ ہے کہ اس عظیم ذات کا تذکرہ اور اُن کی ثناء و صفت واسطے کے بغیر طاقت تو نہیں ہے کہ ہم کر سکیں، ہماری ہمت تو نہیں ہے کہ ہم بلاواسطہ صاحبِ معراج پیغمبرؐ کے ذکر کا سوال بھی دل میں لاسکیں۔

حضرات! ہم اپنی مشکلوں کو یوں ہی آسان کر لیا کرتے ہیں کہ جب آپ کی ثناء کا جذبہ دل میں موجزن ہوتا ہے تو آپؐ کے گھرانے کے بچوں کو یاد کر لیا کرتے ہیں اور اس ماحول کی تنویر کو یاد کر لیا کرتے ہیں جو اُس نورانیت سے، اس ضیاء سے، اس روشنی سے منور ہوئی ہے اور یہ سوچ لیا کرتے ہیں کہ جن چہروں پر اس نور کی جھلک پڑ گئی ہے، وہ چہرے کیسے روشن ہو گئے اور وہ جسم کیسے معطر ہو گئے۔

اُس کی نسبت سے یہ کچھ منور اور معطر ہو جائے، وہ اصل ذات خود کیسی منور و معطر ہوگی!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قَدْ جَآءَکُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ".

حضراتِ والا! اس آیت میں خدا نے قیامت تک باقی رہنے والے اعلان کو پیش کیا ہے کہ: "آیا ہے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور کتابِ روشن"۔

اللہ کا یہ اعلان کتنا پیغمبرِ خدا کے فرمان کے مطابق ہے:

'اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ'.

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دُوسری عترتِ اہل بیتؑ ہیں"۔

آیت نے بھی وہی دو بتائے اور رسالت مآبؐ نے بھی وہی دو گنوائے۔ جو خدا نے کہا، وہی رسولؐ نے کہا۔ مبارکباد کے لائق ہیں اللہ کے وہ بندے اور رسولؐ خدا کی اُمت کے وہ افراد جو اِن دونوں فرمودات سے تمسک اختیار کرتے ہیں۔

ایک کو پروردگارِ عالم نور کہہ رہا ہے اور دُوسری شے کو خدا روشن کتاب کہہ رہا ہے۔ یہاں مجھے کہنا اصل میں یہ ہے کہ ایک طرف تو کتابِ ناطق کا بیان ہے اور دُوسری طرف کتابِ صامت کا۔ کئی سورتیں نور کی ہیں اور کئی سورتیں کتابِ صامت کی ہیں۔ مگر جس طرح ہر سورۂ قرآن کی فصاحت و بلاغت یکساں ہے، اعلانِ قدرت ہوا:

"فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ". (البقرہ: 23)

"پس اس کی کوئی مثل، کوئی سورۃ بنا لاؤ"۔

خداوند عالم کو ہر چھوٹی اور ہر بڑی سورت پر یکساں اعتماد ہے۔ اسی طرح سے خداوندِ کردگار کو نور کی چھوٹی بڑی سورت پر یکساں اعتماد ہے۔ یعنی کوئی سورۃ لے لو اور کسی کا بھی جلال پیش کردو۔ خدا نے اپنے اعتماد کا اظہار نبی کی زبان سے ان الفاظ میں کروایا:

"صغیرنا و کبیرنا سواءٌ"۔

"ہمارے چھوٹے اور بڑے سب برابر ہیں"۔

اس سلسلہ میں قرآن میں یہ بھی ارشاد ہو رہا ہے: (الحجر:87)

"وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ"۔

"اے انسان! دے دیئے ہم نے تجھے سرمایۂ ہدایت قرار دے کر ایک "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ"۔ اور پھر وہ قرآن جو باعظمت ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن دونوں آیتوں میں آخری چیز ہے۔ زیرِ عنوان آیت یعنی:

"قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ"۔

میں کتاب کا ذکر نور کے بعد ہے اور سورۃ الحجر کی مندرجہ بالا آیت میں بھی قرآنِ عظیم کا ذکر "سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ" کے بعد ہے۔

لہٰذا جو قرآن کی ایک آیت ہو، کتاب روشن ہے، وہی مندرجہ بالا الحجر کی آیت ہو، قرآنِ عظیم بتلائی جارہی ہے۔ اس میں تو کوئی فرق نہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کتابِ مبین کوئی اور چیز ہے اور قرآنِ عظیم کوئی اور شے ہے۔ اب بحث صرف یہ ہے کہ وہاں کتابِ مبین سے پہلے نور کا ذکر ہے، یہاں قرآنِ عظیم سے پہلے "سَبْعًا مِّنَ

اَلْمَثَانِیْ ''مذکور ہے۔ آیا یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں یا دونوں آیات میں ایک ہی شے کو دو مختلف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے!

حضراتِ والا! مفسرین نے اگرچہ بڑی بڑی بحثیں قائم کی ہیں مگر قرآنِ عظیم کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے پہلے جس شے کا ذکر ہے، وہ قرآنِ عظیم سے وابستہ تو ضرور ہے مگر اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ ''سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِیْ'' میں ''سبع'' کے معنی سات کے ہیں اور ''مثانی'' کے معنی مکرر کے ہیں۔ سات کو جب مکرر کیجئے تو چودہ خود بخود آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ محسوس فرمالیں گے کہ یہاں چہاردہ معصومینؑ کا ذکر ہے اور وہ سات ہیں جو مکررات میں سے ہیں۔

اب یہ بحث واقعاً بڑی دلچسپ ہوگی کہ چودہ کے ذکر کیلئے چودہ ہی کیوں نہ کہا؟ چودہ ہی کا عدد کیوں نہ پیش کردیا؟

لہٰذا حضرات! اس میں ایک عجیب راز ہے۔ اگر چودہ کا عدد کھلم کھلا استعمال ہوجاتا تو کوئی اِس چودہ کو بتاتا، کوئی اُس چودہ کو بتاتا۔ خداوندِ عالم نے چودہ کا تعارف اس حیثیت سے کروایا کہ سوائے اصل موقف کے دوسری جگہ کوئی جا ہی نہ سکے۔ سات کہا اور پھر ''سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِیْ'' کہہ کر یہ بتادیا کہ مراد یہاں چودہ ہیں، جو خود چودہ ہیں مگر اُن کے نام چودہ نہیں۔

گنتے جایئے تو چودہ ضرور گنئے گا لیکن اگر ناموں کو گنئے گا تو وہ سات ہی نظر آئیں گے۔ انہی میں سے گھوم پھر کر چودہ کی گنتی پوری ہوجاتی ہے، مثلاً اگر پنجتنِ پاک علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، وہ جس طرح خود پانچ ہیں، اسی طرح اُن کے نام بھی پانچ ہیں اور نام پھر اُن کے درمیان کوئی مکرر نہیں آیا۔ لہٰذا وہ پانچ نام مستقل طور پر

ہیں۔ اب اُس کے بعد نو (9) اور باقی رہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان چودہ کے دو حصے قرار پائے ہیں، ایک حصہ میں پانچ ہیں اور دُوسرے حصے میں نو (9) ہیں۔ یہ پانچ وہ ہیں جو یک وقت تھے، نو وہ ہیں جو اُن کے بعد ہیں۔ ان پانچ میں اور اُن نو میں ایک عجیب اتفاق ہے کہ اُن پانچ کا آغاز ہوتا ہے محمدؐ سے اور اُن نو کا آغاز ہوتا ہے علیؑ سے۔ یہ بھی ایک عجیب راز ہے۔ وہاں محمدیت ہے جو شرح میں آ رہی ہے اور یہاں علویت ہے جو شرح میں آ رہی ہے۔

غرضیکہ وہ پانچ اور یہ نو۔ ان نو پر جب نظر کی جائے تو جو نام کہ بالکل نئی مرتبہ آئے ہوئے ہیں اور پہلے سے نہ آئے ہوں، وہ صرف دو ہیں: جعفرؑ اور موسیٰؑ۔ ان دو ناموں کے سوا اِن حضرات میں کوئی نیا نام نہیں آیا۔

آج کا مولود ہے۔ القاب بہت سے ہیں مگر نام تو علیؑ ہے۔ یہ نام پہلے آ چکا ہے۔ اُن کے خلف ہیں باقر، علم الانبیاء۔ اُن کے القاب صفات کی بناء پر، فضائل کی بناء پر، جتنے بھی اِن حضرات کے زیادہ ہوں تو کم سے کم ہیں۔ مگر نام تو اُن کا محمد ہے۔ جعفرؑ اور موسیٰؑ یقیناً دو ایسے نام ہیں جو پہلے نہیں آئے تھے اور موسیٰؑ کے بعد پھر وہی علیؑ ہیں۔ علیؑ کے بعد پھر وہی محمدؐ ہیں، محمدؐ کے بعد پھر وہی علیؑ اور علیؑ کے بعد پھر وہی حسنؑ ہیں اور حسنؑ کے بعد بالآخر وہی محمدؐ ہیں۔ جو اوّل ہے، وہی آخر ہے اور جو ابتداء ہے، وہی انتہا ہے۔ نام اُن کے ضرور سات ہیں۔

یہاں مراد یہ ہے کہ وہ چودہ حضرات دیکھو جن کے نام سات سے آگے نہ بڑھیں۔ اس لئے نقطہ رس حضرات نے بہترین لفظ کہا ہے: صِبْغَةٌ لِسَبْعَةِ اَسْمَائِهِمْ

ان کے سات ناموں کی وجہ سے۔

حضرات! یہ عجیب بات ہے کہ ان میں سے کوئی بیمار ہے تو اب وہ ہمیشہ کیلئے بیماروں کی شفاء کا وسیلہ قرار پا گیا، ان میں سے کوئی مسافر ہے تو اب وہ قیامت تک مسافروں کیلئے امن و سلامتی کا سبب ہوا۔ اس کا نام اس وسیلہ کی شرح میں امام ضامن ہو گیا۔ چونکہ مسافرت اس امامؑ کی ہر مسافر کی مسافرت سے بڑھ گئی اور غریب الوطنی نسبتاً سب سے زیادہ بڑھ گئی۔ اب انسان جب سفر کرتا ہے تو نام اُن کا لیا جاتا ہے اور اُن کے نام کو امن و امان کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ بیمار ہوں تو بیماروں کا وسیلہ بن جاتے ہیں، مسافر ہوں تو مسافروں کی سلامتی اور امن کا باعث قرار پا جاتے ہیں۔ یہ حضراتؑ وہ ہیں کہ خود مغموم ہو کر دُوسروں کے غم کے زوال کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور سزا میں مبتلا ہو کر، شدتوں اور اذیتوں میں مبتلا دُوسرے لوگوں کیلئے سبب رستگاری بن جاتے ہیں۔

غرضیکہ وسیلہ نجاتِ دُنیا بھی ہیں اور وسیلہ نجاتِ اُخروی بھی ہیں۔ اس گھرانے کا افتتاح نامِ محمدؐ سے ہوا تھا، آج کے سعید دن اس گھرانے میں دُوسرے شعبہ کا افتتاح نامِ علیؑ سے ہو رہا ہے۔ آج اس گھر میں دُوسرے علیؑ آئے اور محض نام ہی کے علی نہیں ہیں، کام بھی وہی ہے، شانِ امامت بھی وہی ہے، کلام بھی وہی ہے، مقصد بھی وہی ہے، زُہد و ورع بھی وہی ہے، ریاضت و عبادت بھی وہی ہے۔

اپنے بزرگواروں کے جانشین ہیں، زین العابدینؑ آپ کا لقب، آپؑ کی عبادت کا مظہر ہے اور سیدؑ الساجدین کا لقب آپؑ کے کمالِ زُہد کا مظہر ہے۔ اس مقام پر مجھے قرآنِ کریم کی یہ آیت یاد آتی ہے:

"وَجَعَلْنَامِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَالَمَّاصَبَرُوْا".

"اور ہم نے اُن کو (نسلِ خلیل میں سے اماموں کو) امام قرار دیا ہے جو ہمارے امر سے ہدایت کرنے والے ہیں"۔ (سجدہ:24)

اگر یہ مسئلہ کسی کے ذہن میں بصورتِ سوال آئے کہ ہم نے خلعتِ امامت اُنہیں کیوں پہنایا تو ہمارے پاس بس ایک ہی جواب ہے کہ اُنہیں منصبِ امامت اس لئے دیا کہ وہ صابر ہیں۔

حضراتِ والا! ظاہر ہے کہ شکر راحتوں میں ہوتا ہے اور صبر مصیبتوں میں ہوتا ہے۔ صبر کا لفظ کہہ کر خداوند عالم نے ان آئمہؑ کی مصیبتوں کو اور مظلومیتوں کو واضح کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ امامتِ صحیح کو اگر تلاش کرنا ہو تو وہ تخت والوں میں نہیں ملے گی، وہ تاجداروں میں نہیں ملے گی، وہ فتح کرنے والوں میں نہیں ملے گی، وہ ملکی وسعت دینے والوں میں نہیں ملے گی۔ اگر امامت ملے گی تو صابرین میں ملے گی۔

یہ قدرت کا عجیب انداز ہے کہ امامت ہم نے اُن کو دی جو صابر ہیں۔ جب صابرین کا ذکر کیا تو فرما دیا:

"بَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ، الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّالِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ. اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ. وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ". (البقرہ:155-157)

"اے رسولؐ! بشارت دے دو اُن صابروں کو جو عظیم مصیبتوں کے نزول پر بھی دل تنگ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے رب کی طرف سے صلوات ہے

اور اُس کی رحمت ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں"۔

اس سے واضح ہوا کہ ایک ہی مقام پر بہت سی شرف والی باتیں آپ کو اکٹھی ہوتی نظر آئیں گی۔ امامت کہاں ہے؟ جہاں صبر ہے۔ صبر کہاں ہے؟ جہاں خدا کی طرف سے صلوات ہے۔ جنت کہاں ہے؟ سورۂ دہر، آیت 12 اعلان کرتی ہوئی نظر آئے گی کہ جنت اور ریشمی پوشاکیں جزا کے طور پر صابرین کو دے دی گئیں۔

تو ایک ہی مقام ہے۔ جنت بھی وہاں ہے، صلواتِ ربانی بھی وہاں ہے، صبر کا کمال بھی وہاں ہے اور اگر "یَھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا" کے الفاظ پر بھی نظر رہے تو پھر اولی الامر بنا دیئے جانے والے حضرات ہی کے پاس امرِ الٰہی بھی سپرد ہے۔

میں اب آخری لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ امام زین العابدینؑ کے متعلق اسیری کے نقشے ہماری نگاہوں کے سامنے اتنے جم گئے ہیں کہ سوائے مظلومیتِ امامؑ کے کوئی تصور آتا ہی نہیں۔ ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ امامؑ کے چہرہ پر کیا جلالت تھی، کیا شانِ رفعت تھی، کیا صولت تھی اور کیا ہیبت تھی!!!

مجھے ایک واقعہ یاد آیا جو تاریخی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور وہ کوئی اختلافی یا مذہبی محلِ نظر کی حیثیت میں نہیں رہا بلکہ وہ ایک تاریخی جزو قرار پا گیا ہے کہ ہشام ابن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں عازمِ حج ہوا۔ حکومت ہے، کروفر ہے، ساز و سامان ہے، حشم ہے، خدم ہے۔ وہ اپنی اُسی شان میں پہنچا۔ اِدھر دین کا تاجدار، عبادت گزاروں کی زینت سید سجاد علیہ السلام کمال اسیری کے باوجود فقیری شان میں واردِ حرم ہوئے۔ گویا یہ کہتے ہوئے کہ:

"زَادِیْ تَقْوَایَ، وَقَصْدِیْ مَوْلَایَ".

میرا زادِ سفر کیا ہے؟ میرا تقویٰ ہے اور میرا راحلہ کیا ہے؟ میرے دونوں پیر ہیں اور میرا مقصد میرا مولیٰ ہے۔

اس شان سے آپؑ پہنچے۔ ہر حاجی کے بدن پر احرام کا لباس ہے، ہر شخص یکساں حالت میں ہے۔ امیر اور نادار کا کوئی امتیاز ہی باقی نہیں اور شاہ و گدا سب ایک ہی صورت میں ہیں۔ طواف ہو رہا ہے اور طواف کے بعد حجر اسود کا بوسہ ہوتا ہے۔ ہشام نے طواف کیا۔ اس کے بعد حجر اسود کی طرف رُخ کیا مگر جم غفیر ہے۔ کون کسی کی رعایت کرے، کون کسے دیکھے، کون یہ خیال کرے کہ یہ کچھ صاحبِ سطوت ہے، صاحبِ حکومت ہے۔

غرضیکہ ہشام اپنی جگہ چاہتا ہوگا کہ وہ اسی کروفر سے پہنچے مگر مجمع ہے کہ ایک دوسرے کا امتیاز نہیں ہے۔ آخر یہ تھک ہار کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ دائیں بائیں وہی خدام ہیں، ارکانِ حکومت ہیں جو ساتھ آئے تھے۔

یہ اپنی جگہ کھڑا تھا کہ جناب سید سجاد علیہ السلام تشریف لائے۔ آ کر طواف کیا اور باوجودیکہ مجمع سب وہی تھا مگر حجر اسود کی طرف اس طرح بڑھے کہ جیسے آپؑ کے اور حجر اسود کے درمیان کوئی شے حائل ہی نہ تھی۔ بغیر کسی روک ٹوک کے بڑھتے ہی چلے گئے۔ خدا جانے کیا تصرف تھا اور کیا شانِ امامت تھی! زمین میں وسعتیں پیدا ہو رہی تھیں یا قلوبِ عالم مسخر ہو رہے تھے۔ امامؑ کو راستہ ملتا چلا گیا اور آپؑ بے تکان حجر اسود تک پہنچے۔

ہشام دیکھ رہا ہے۔ ساتھیوں نے ہشام سے کہیں پوچھ لیا کہ یہ کون ہے؟ اُس نے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ جانتا تھا، اگرچہ مانتا نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بات پردہ

میں رہ جائے۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہ بات کسی محبِ اہل بیتؑ نے سن لی جس کا نام فرزدق ہے اور واقعاً فرزدق کا نام آج ہی کے دن سے روشن ہوا۔ انہوں نے طواف کرتے کرتے ہشام کا یہ کہنا کہ وہ اُن (امام زین العابدینؑ) کو نہیں جانتا، سن لیا۔ وہیں ٹھٹک کر یہ کھڑے ہو گئے اور بغیر سوچے فی البدیہہ (بغیر کسی نشست کے) وہ جواب دیا ہے کہ آج تک اُن کا وہ کلام تکلم کی صورت میں عربیت کا ایک کارنامہ قرار دیا جا رہا ہے اور ادب عربی کا جزو بنا دیا گیا ہے۔

فرزدق ٹھہر گئے اور کہا کہ یہ نہیں جانتا؟ اور پوچھنے والے سے کہا کہ اگر یہ نہیں جانتا تو میں بتاتا ہوں۔

اب جو بتایا ہے اور قصیدہ جو امامؑ کی شان میں کہا ہے، اُس کا پہلا شعر جسے مطلع کہتے ہیں، پڑھا جو:

"هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَا"

کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"یہ وہ ہے کہ حرم کے سنگریزے اس کے قدم کو پہچانتے ہیں، کعبہ اس کو پہچانتا ہے، حل وحرم اس کو پہچانتے ہیں"۔

قصیدہ کیا تھا، گویا کہ ایک دریا تھا جو جوش میں موجزن ہو رہا تھا۔ صحیح تعارف پیش کر رہے ہیں اور یہ کہتے کہتے، امامؑ کی سخاوت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ ذات ہیں جنہوں نے سوائے تشہد میں کبھی "لا" کہا ہی نہیں ہے۔ اگر تشہد نہ ہوتا (جس میں لا الٰہ الا اللہ کی شہادت دی جاتی ہے) تو میں کہہ دیتا کہ اُن کا "لا" ہمیشہ

"نعم" ہی رہا ہے۔

یہ بیان میں نے اس لئے دیا ہے کہ امامؑ کے مصائب سنتے سنتے ہم اس قدر غافل ہو چکے ہیں کہ امامؑ کے چہرے پر کیا جلالت تھی، فرزدق نے اپنے ایک شعر میں نقشہ کھینچتے ہوئے کہا ہے:

"یہ وہ ہیں جن کی نگاہیں جھکی رہتی ہیں، حیا کی وجہ سے، اور انؑ کے سامنے آکر ہر نظر جھکتی ہے، آپؑ کی ہیبت کی وجہ سے، اور انؑ سے کلام نہیں کیا جا سکتا مگر اس وقت جب انؑ کے چہرے پر مسکراہٹ ہو"۔

ضمیمہ

(جناب مرغوب احمد صاحب قبلہ مرحوم)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد سے پوچھا کہ تو نے مجھ سے کیا کچھ سیکھا؟ اُس نے کہا: میرے مولاؑ! آٹھ مسائل۔ آپؑ نے فرمایا: بیان کرو۔ اُس نے کہا:

1۔ میں نے دیکھا کہ ہر محب اپنے محبوب سے موت کے وقت جدا ہو جاتا ہے۔ بس میں نے اپنا رُخ اُس کی طرف پھیر لیا جو مجھ سے کبھی جدا نہ ہوا ہو بلکہ میری تنہائی قبر میں میرا مونس و مددگار رہو (وہ عملِ خیر ہے)۔ آپؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تو نے بہت اچھا کیا۔

2۔ میں نے کچھ لوگوں کو حسب و نسب کے ساتھ فخر کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کچھ لوگوں کو مال و اولاد کے ساتھ، حالانکہ اُن میں سے کوئی چیز باعثِ فخر نہیں بلکہ عظیم فخر تو خدا کے اس قول میں ہے:

"اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ".

پس میں نے کوشش کی ہے کہ اللہ کے نزدیک کریم و عزت دار بنوں۔ آپؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تم نے اچھا کیا۔

3۔ میں نے لوگوں کو لہو و لعب اور خوشی میں مشغول دیکھا ہے اور خدا کا یہ ارشاد سنا ہے:

"وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى. فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى".

"اور جو شخص اپنے پروردگار کے مقام سے ڈرے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکے تو بے شک جنت اُس کے رہنے کی جگہ ہے"۔

پس میں نے خواہش کو اپنے نفس سے پھیرنے کی پوری کوشش کی، یہاں تک کہ وہ اطاعتِ خدا پر پختہ ہوگیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تو نے بہت اچھا کیا۔

4۔ میں نے دیکھا ہے کہ جس شخص کو کوئی ایسی چیز مل جائے جو اُس کے نزدیک مکرم و ذی عزت ہو تو وہ اُس کی حفاظت میں کوشش کرتا ہے اور میں نے اللہ کا یہ ارشاد سنا:

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضاً حَسَناً فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ"۔

"کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تو وہ اس کو کئی گنا کر دے گا اور اس کیلئے اجر کریم ہے"۔

پس میں نے کئی گنا کو پسند کیا اور جو چیز خدا کے پاس ہے، اُس سے زیادہ میں نے کسی شے کو محفوظ نہیں پایا۔ پس جو چیز مجھے مکرم و ذی عزت ملتی ہے، میں اُسے خدا کے پاس بھیج دیتا ہوں تاکہ وہ میری ضرورت کے وقت کیلئے ذخیرہ رہے۔

5۔ میں نے دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں، حالانکہ میں نے خدا کا یہ ارشاد سنا ہے:

"نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَرَفَعْنَا

بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا. وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ". (زخرف:32)

'ہم نے زندگانی دُنیا میں اُن کی معیشت کو تقسیم کر دیا ہے اور بعض کو بعض پر کئی درجے بلندی دی ہے تا کہ بعض، بعض کو اپنے تمسخر کا نشانہ بنائیں، حالانکہ تیرے پروردگار کی رحمت بہتر ہے اُس سے جسے یہ جمع کرتے ہیں'۔

جب میں نے جان لیا کہ اللہ کی رحمت اُن کے جمع شدہ مال سے بہتر ہے تو میں نے کسی پر حسد نہیں کیا اور نہ اس پر افسوس کیا ہے جو مجھ سے فوت ہو گئی۔ امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تو نے بہت اچھا کیا۔

6۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ دُوسروں سے وار دُنیا میں دُشمنی رکھتے ہیں، اس دکھ درد کی وجہ سے جو اُن کے سینوں میں ہے اور میں نے خدا کا ارشاد سنا:

"اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا".

پس اسے اپنا دُشمن بنالو، اس لئے میں اُس کو اپنا دُشمن سمجھنے لگ گیا اور دُوسروں کی دُشمنی چھوڑ دی۔ امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تو نے بہت اچھا کیا۔

7۔ میں نے لوگوں کو تگ و دو اور روزی کی تلاش کی کوشش میں دیکھا، حالانکہ میں نے خدا کا ارشاد سنا:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ. اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ".

"میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر عبادت کیلئے۔ اُن سے روزی نہیں

چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی بہت بڑا رزق دینے والا اور پختہ قوت وطاقت والا ہے"۔

پس میں نے یقین کر لیا کہ خدا کا وعدہ حق ہے اور اُس کی بات سچی ہے۔ پس میں اُس کے وعدہ پر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کو پسند کیا۔ لہذا میں اُن چیزوں میں مشغول ہو گیا جو اُس کی طرف سے مجھ پر لازم ہیں اور اُن چیزوں کو چھوڑ دیا جو میری طرف سے اُس کے ذمہ ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تو نے بہت اچھا کیا۔

8۔ میں نے کچھ لوگوں کو اپنے بدنوں کی صحت کے متعلق گفتگو کرتے، کچھ اشخاص کو کثرتِ مال پر باتیں کرتے اور کچھ افراد کو اپنے جیسی مخلوق پر کلام کرتے دیکھا ہے اور خدا کا یہ ارشاد سنا ہے:

"وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ. وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ. اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ. قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا".

جو اللہ سے ڈرے تو وہ اس کیلئے نکلنے کی راہ پیدا کر دیتا ہے اور اُسے وہاں سے رزق دیتا ہے، جہاں سے اُسے وہم و گمان نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اُس کیلئے کافی ہے۔ خدا اپنے حکم کو آخر تک پہنچانے والا ہے اور اُس نے ہر چیز کی ایک تقدیر اور اندازہ مقرر کیا ہے۔ تو میں نے اللہ پر توکل کر لیا ہے اور اُس کے غیر سے میرا بھروسہ زائل ہو گیا ہے۔

امامؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! تورات و انجیل و زبور و قرآن اور باقی کتب کی بازگشت انہی مسائل کی طرف ہے۔

''مولانا مرحوم کی تقریریں ہوں یا تحریریں، دونوں میں قدرِ مشترک آپ کا منفرد طرزِ استدلال اور سلاستِ زبان اور بیان ہے۔ استدلال اِس درجہ محکم و مستحکم کہ ہر مخالف دلیل کے لیے برہان قاطع اور ہر معترض کو قائل کر دینے والا۔ سلاستِ زبان و بیاں اس درجہ دلکش، دل پسند کہ ہر سامع اور ہر قاری کے قلب و ذہن کو مسخر کرنے کے لیے تمام تر قوتوں کی حامل''۔

(ہادی نقوی صاحب مدظلہٗ)

ن تحریر اور فن تقریر دونوں ہی محمدؐ و آل محمدؐ کے علوم کی تبلیغ کے سلسلہ میں کام آتے رہے
ہ۔ ایسے علماء اور ادباء کم ہی نظر آئے جو بیک وقت دونوں فنون پر دسترس رکھتے ہوں۔
رِ جدید میں علامہ علی نقی مرحوم کے بعد مولانا سید محمد جعفر شہید نے اپنی تقریروں اور
ریروں سے مفاہیم قرآنی نہایت واضح اور تفصیلی رنگ سے آشکار کیے ہیں''

(سید وحید الحسن ہاشمی)

''مولانا سید محمد جعفر زیدی شہید کی مجالس کا یہ مجموعہ، جو اُن کی پوتی محترمہ انجم مسعود صاحبہ نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے، نہ صرف مومنین کے ذوقِ عزا کی تسکین بلکہ علماء و خطباء کے ذوقِ خطابت کی تربیت کا نہایت عمدہ سامان ہے''۔

(سید نیاز محمد ہمدانی)